جلد ششم

مشتمل بر

دیوانِ ششم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نورالحسن نقوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک-۱، آر-کے-پورم، نئی دہلی 110066

کلیاتِ مصحفی

جلد ششم

مشتمل بر

دیوانِ ششم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نورالحسن نقوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ا۔آر۔کے۔پورم، نئی دہلی 110006

Kulliyat-e-Mus'hafi-Vol. VI

by

Prof. Noorul Hasan Naqvi

پہلا ایڈیشن : 550

سنہ اشاعت : 2006

قیمت : 255 روپے

سلسلۂ مطبوعات : 1258

ISBN: 81-7587-192-X

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی-110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرّر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کماحقہ، واقفیت نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت عہدِ قدیم کے شاعروں اور نثرنگاروں سے لے کر عہدِ جدید کے شاعروں اور نثرنگاروں تک تمام اہم اہلِ فکروفن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے اور زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الوسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیاتِ غلام ہمدانی مصحفی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کررہی ہے۔

اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

رشمی چودھری
ڈائرکٹر انچارج

فہرست

(غزلیات)

ردیف ل

ردیف م

ردیف ن

ردیف و

ردیف ہ

ردیف ی، ے

☆☆☆☆

دیگر اصنافِ سخن

☆☆☆☆

حرفِ آغاز

الحمدللہ کہ مصحفی کا دیوانِ ششم قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہ دیوان 1224 ہجری میں تکمیل کو پہنچا۔ اُس وقت مصحفی کی عمر 63 برس کے قریب تھی اور ان کے سفرِ آخرت کو صرف 17 سال باقی تھے۔ سترہ سال کی مدت میں اُنھوں نے ایک دیوان (ہفتم) مکمل کیا اور دوسرا (ہشتم) نامکمل چھوڑا۔ 1224ھ تک ان کی بیشتر اردو فارسی تصانیفِ نثر و نظم وجود میں آچکی تھیں۔

مصحفی کا یہ دیوان کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس دیوان میں دیباچۂ مصنف شامل ہے جس سے اس دیوان کے سالِ تکمیل کے علاوہ مصحفی کی زندگی، ان کی تصانیف اور ان کے نظریۂ فن کے متعلق بیش قیمت معلومات تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔ دیباچے میں وہ صراحت کرتے ہیں کہ ان کی عمر اس وقت ساٹھ سال سے متجاوز ہے اور یہ کہ ان کی ولادت ''احمد شاہی میں''، راقم کی راے میں احمد شاہ کی تخت نشینی کے سال (1161ھ) میں ہوئی۔ دیوانِ ششم کے ایک شعر میں بھی اپنی عمر ساٹھ سال بتاتے ہیں۔

ہم نے بھی دیکھے زمانے کے چلن کیا کیا کچھ　　مصحفی ساٹھ برس تک یہی پاپڑ بیلے

دیباچۂ مصنف سے ان کی تصانیف کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوتی ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ 1224ھ تک ان کے چھ دیوان مکمل ہوچکے تھے۔
2۔ قصائد ایک علاحدہ دیوان کی صورت میں یکجا ہوتے رہے تھے۔
3۔ شعراے اردو و فارسی کے تینوں تذکرے مرتب ہوچکے تھے۔

4۔ فارسی کے تین دیوان مکمل ہو چکے تھے۔

5۔ مختصر نثری رسائل بہ زبانِ فارسی ضبطِ تحریر میں آ چکے تھے۔

6 ۔ اس فہرست میں کشکولِ حکمت جوابِ گلستاں، مثنوی کشمیری و فرہنگ، مثنوی بادہوش، ہفت تصویر کے نام بھی شامل ہیں۔ یہ تصانیف پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کے ایک خطی نسخے میں شامل ہیں۔

مصحفی نے ضمناً اپنے عہد کے بزرگ شعرا کے حوالے سے دیوانِ ولی اور خود ولی کے دہلی پہنچنے، ان کے کلامِ ریختہ کی طرف شعرائے دہلی کے متوجہ ہونے، ایہام گوئی کا اسیر ہونے اور پھر اس سے رہائی پانے کا ذکر کیا ہے۔ مصحفی اپنے فارسی کلام کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں لیکن اردو شاعری کی طرف متوجہ ہونے اور اس میں نئی راہیں نکالنے کا بھی فخریہ ذکر کرتے ہیں۔

یہ ریختے کا جو اردو ہے مصحفی اس میں نئی نکالی ہیں راہیں ہزار ہم نے تو

اور فرماتے ہیں کہ ان بزرگ شاعروں نے دیوان ششم کی غزلیں شاعر کی زبان سے سنیں اور پسند فرمائیں۔

دیوان مصحفی ششم کے خطی نسخے ملک کی مختلف لائبریریوں میں دستیاب ہیں۔ ان میں سب سے اہم تو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کا نسخہ مکتوبہ 1243ھ ہے۔ جسے زیرِ نظر متن کی اساس قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن، لکھنو یونیورسٹی ٹیگور لائبریری لکھنو اور بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی میں محفوظ نسخے اہم ہیں۔ دواوینِ مصحفی میں اختلاف نسخ کی تو کوئی اہمیت نہیں کیونکہ جہاں جہاں اختلاف پایا جاتا ہے اس کی ذمہ داری ان نسخوں کے کاتبوں پر ہے خواہ اسے کاتبوں کی اصلاح کہیے یا لغزش قلم۔ نسخۂ پٹنہ کے جو شعر پڑھے نہ جا سکے تھے وہ ان نسخوں کی مدد سے درست کر لیے گئے۔ اختلاف نسخ کے اندراج میں نسخۂ لکھنو کے لیے ''ل'' نسخۂ بنارس کے لیے ''ب'' نسخۂ حیدرآباد کے لیے ''ح'' کی علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ ''اصل'' سے مراد نسخۂ پٹنہ ہے

کہ یہی اس متن کی اساس ہے۔

راجا صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں بھی چھٹے دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے۔ ہم اس نسخے سے براہِ راست فائدہ نہیں اُٹھا سکے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے اپنی کتاب ''تحقیقی نوادر'' مطبوعہ سری نگر 1974ء میں اس نسخے کا تفصیلی تعارف کرایا ہے اور لکھا ہے کہ اس پر سنہ کتابت 1231ھ تحریر ہے۔ اس نسخے میں دیباچۂ مصنف بھی شامل ہے۔ اس کا نسخۂ پٹنہ کے دیباچے سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ حواشی میں درج کر دیا گیا ہے۔ اسی کے دیباچے میں تصانیف مصنف کے ذیل میں دیوان ہفتم اور دیوان ہشتم بھی درج ہے۔ ظاہر ہے یہ اضافہ بعد کا ہے۔ دیوانِ ہشتم وفاتِ مصحفی کے وقت یعنی 1240ھ ناتمام تھا۔ اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ تحریر 1231ھ کی نہیں بلکہ 1240ھ کے بھی بعد کی ہے۔ یہ روش عام رہی ہے کہ کاتب جس نسخے کی نقل کرتا ہے اس کا ترقیمہ بھی من وعن نقل کر دیتا ہے۔ راجا صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں جو نسخہ محفوظ ہے اس کے کاتب نے بھی یہی کیا ہے۔ اس نے دیباچۂ مصنف نیز ترقیمہ نقل کر دیا اور بعد کی جو تصانیف اس کے علم میں تھیں ان کے نام فہرستِ تصانیف میں درج کر دیے۔ غرض اس نسخے کی تحریر کا سال غلط لکھا ہے۔ حیدر آباد بنارس اور لکھنو کے نسخوں میں ترقیمہ موجود نہیں۔

دیباچۂ مصنف مشمولہ نسخۂ پٹنہ میں لکھا ہے: ''سنہ ہجری نبوی در بلدۂ لکھنو تحریر پذیرفت'' مگر سال درج نہیں۔ ڈاکٹر حیدری کی اطلاع کے مطابق راجا صاحب کے نسخے میں 1224ھ درج ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے اسی اطلاع کی بنیاد پر سال 1224ھ درج کر دیا ہے۔ دیوانِ ششم کا زمانۂ تصنیف 1224ھ کے قریب ہی ہے۔ اس دیوان میں جرات کی تاریخ وفات ''ہوگئی کیا بلبلِ نالاں خموش'' شامل ہے۔ اس مصرعے سے 1224ھ اس طرح برآمد ہوتے ہیں کہ ''ہوگئی'' میں ''ی'' کے عدد دو بار شامل کیے جائیں۔ میر کا قطعۂ وفات بھی اس دیوان میں موجود ہے۔ تاریخ اس طرح نکالی گئی ہے۔

از سرِ درد مصحفی نے کہا حق میں اس کے موا نظیری آج

قیاس ہے کہ میرؔ کی وفات کا سانحہ دیوانِ ششم کی تکمیل کے فوراً بعد پیش آیا۔ مصحفی نے تاریخ کہی اور دیوان میں شامل کر دی۔

مصحفی نے شعرائے اردو اور شعرائے فارسی کے تین تذکرے ترتیب دیے جو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مقدمات کے ساتھ انجمن ترقی اردو سے شائع ہو چکے ہیں اور مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہیں، مجمع الفوائد میں مصحفی نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ اس مختصر تصنیف کے اقتباسات ان شاء اللہ مقدمہ کلیاتِ مصحفی میں پیش کیے جائیں گے۔ البتہ مصحفی کے باقی تین دواوین یعنی دیوان ہفتم (غزلیات) دیوان ہشتم (غزلیات) جو شاعر کی وفات کے سبب ناتمام رہا اور دیوان قصائد کی اشاعت خصوصی توجہ چاہتی ہے تاکہ مصحفی کا مکمل شعری کارنامہ ان کے قدر دانوں تک پہنچ سکے۔ کونسل نے کلیاتِ مصحفی کی ترتیب و تصحیح کی ذمہ داری مرحوم پروفیسر نثار احمد فاروقی کو سونپی تھی مرحوم کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے اور پہلے چار دیوان مرتب کرنے کے بعد ہم سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد باقی دواوین و تصانیف کو مرتب کرنے کی ذمہ داری کونسل کے ذمہ داران نے راقم کو تفویض فرمائی۔ افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ میں خود اسی مرض کا شکار ہوں جو نثار احمد فاروقی صاحب کی موت کا سبب بنا۔ اپنے قدیم ادبی سرمایے سے دلچسپی رکھنے والے رفتہ رفتہ اُٹھتے جا رہے ہیں اندیشہ ہے کہ کلیاتِ مصحفی کی اشاعت کا کام اس بار بھی ناتمام رہا تو خدا جانے کب مکمل ہو۔ اس لیے میں کونسل سے درخواست کر رہا ہوں کہ باقی تین دواوین کو مرتب کر کے کونسل کی خدمت میں پیش کرنے کی راقم کو اجازت دی جائے اور کونسل انھیں اپنی سہولت کے مطابق شائع کرتی رہے۔

اس دیوان کے ساتھ ڈاکٹر سید عبد اللہ کا مضمون ''مصحفی کا کارنامۂ خاص اردو شاعری میں'' شائع کیا جا رہا ہے جو مصحفی کی شاعری کو سمجھنے میں خاصا معاون ہوگا۔

پروفیسر نورالحسن نقوی

25/نومبر 2005ء

علی گڑھ

از ڈاکٹر سید عبداللہ:

مصحفی کا کارنامۂ خاص

اردو شاعری میں

اردو شاعری میں مصحفی کا ایک خاص مقام ہے۔ خصوصاً اردو غزل کے ارتقا میں ان کا کلام ایک اہم منزل کا حکم رکھتا ہے۔ ہمہ رنگی کے باوجود ان کا اپنا بھی ایک رنگ ہے اور یہی وہ رنگ ہے جس نے مصحفی کو مصحفی بنایا اور اب تک ان کے نام اور کام کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ روشن اور درخشاں رکھا اور ہمیشہ ہمیشہ روشن اور درخشاں رکھے گا۔ یہ رنگ وہ رنگ ہے جو دوسروں کے ساتھ ان کی جزوی مماثلتوں میں اتنا نہیں چمکتا جتنا ان کے لیے انفرادی نقوش میں کھلتا اور یہ انفرادی نقوش وہ ہیں جو ان سے پہلے کسی شاعر کے کلام میں اتنی آب وتاب سے نمایاں نہیں ہوئے جتنے مصحفی کے کلام میں نمایاں ہوئے ہیں اور ان کے بعد بھی اگر کسی شاعر کے کلام میں ابھرے ہیں تو اس کی تنہا مثال شاید مولانا حسرت موہانی کی غزل میں ملتی ہے۔

مصحفی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اردو غزل کے لیے اظہار و بیان کے وہ لطیف پیرائے تیار کیے جن کے بغیر تغزل کی تکمیل ممکن نہیں۔ مصحفی نے شاعری کی سب اصناف میں طبع آزمائی کی، مثنویاں لکھیں، قصیدے مرتب کیے، رباعیات کہیں۔ بہت کچھ لکھا اور عموماً اچھا لکھا، مگر ان کا اردو شاعری میں وصف خاص اور کارنامہ امتیاز یہ ہے کہ اردو میں پہلی مرتبہ غزل اس اسلوب بیان اور زبان سے آشنا ہوئی جس کی عمدہ مثالیں عہدِ جہانگیری کے شعرا کے کلام میں دستیاب ہوتی ہیں۔ وہ اگر چہ نظیری کے

مداح و معترف ہیں، مگر ہمیں ان کے کلام میں کئی اعتبارات سے طالب آملی کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر مصحفی کے کلام میں سرمستی اور رنگینی کا عنصر بھی موجود ہوتا تو طالب آملی سے ان کی مماثلت مکمل ہو جاتی۔ مصحفی کی شاعری ایک لحاظ سے اس کلاسکیت اور اسلوب پرستی کی ابتدائی منزل ہے جس کے بگڑے ہوئے رنگ کو لکھنویت کہا جاتا ہے۔ مصحفی اردو شاعری کے اس عظیم رومانی دور کے بعد ہمارے سامنے آتے ہیں جس کے بڑے ارکان میر تقی میر اور خواجہ میر درد تھے۔ میر اور درد کی شاعری میں جذبے کی شدت اور خلوص کے ساتھ ساتھ اسلوب کی پرستش ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ خالصتاً انفرادی تجربات کا اظہار اور ذاتی احساسات کا بیان ان کا مقصود اصلی ہے۔ مصحفی پہلا شاعر ہے جس نے تجربات اور احساسات کے مقابلے میں زبان اور طرزِ ادا کو اہمیت دی اور صوت و صورت کی خوبی اور شیریں الفاظ و تراکیب کا سہارا لیا۔ مصحفی کی شاعری درحقیقت نفیس الفاظ و تراکیب کی شاعری ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ذاتی جذبات کے اظہار کے مقابلے میں بیان کی خوبی اور آرائش و زیبائش پر اُنھوں نے خاص نظر رکھی۔ انھیں ایسے حسین الفاظ کے انتخاب پر بڑی قدرت ہے جن کی جذباتی و صوتی کیفیتیں پہلے سے تسلیم شدہ ہیں۔ یہ وہ حسین الفاظ ہیں جن کو فارسی شاعری ان جذباتی حالتوں سے وابستہ کر چکی ہے جن کے خلوص اور سچائی میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ ان تراکیب و الفاظ کی صوتی خوش نمائی اپنا سکہ بٹھا چکی ہے۔ مصحفی کے کلام میں جب ترکیبیں ان کے عام مانوس اور بامزہ زبان اور سادہ محاوروں کے پہلو بہ پہلو بیٹھتی ہیں تو ان سے خوش رنگی اور لطافت کا ایسا نفیس نمونہ تیار ہوتا ہے جس سے محظوظ نہ ہونا شاید دشوار ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ مصحفی ایک خوش ذوق، جمال پسند اور لطافت پسند شاعر ہیں۔ وہ شدت جذبات پر لطافت جذبات کو ترجیح دیتے ہیں۔ یا کم از کم جذبہ لطافت کو ہم آہنگ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری کا تمام تر سرمایہ ہی نفاست و لطافت ہے۔ وہ ہمیں میر اور درد سے الگ شخص معلوم ہوتے ہیں اور ایسا ہونا بالکل بجا ہے کیوں کہ میر اور درد کی خصوصیات

ان میں کم پائی جاتی ہیں۔ان کے اشعار میں میر کی دردمندی اور درد کی جگرداری کی خفیف سی لہر ضرور پائی جاتی ہے،مگر انھیں شعر و تخیل کی دنیا میں اگر کچھ مطلوب ہے تو وہ لطافت اور نفاست ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور ان کے اسلوب میں سب سے زیادہ اسی کا اثر پڑتا ہے۔الفاظ و تراکیب کے سبک اور خوش گوار سانچوں کے علاوہ لے کاری اور غنائیت ان کی شاعری کا امتیاز خاص ہے۔ان کی بحریں عموماً موسیقیت کے اس رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں جن میں شدت اور جوش کے بجائے غنودگی اور سکون اور لطیف غنائیت پائی جاتی ہے۔وہ شوقِ تمنا اور طلب کی لطیف کیفیتوں کی آئینہ دار ہیں،وحشت اور جنون عشق کے ان جارحانہ تصورات کی آئینہ دار نہیں جو مثلاً غالب اور میر اور بیدل کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔

مصحفی کے کلام میں خوش صوت فارسی الفاظ و تراکیب کے جو بہار آفریں نمونے پائے جاتے ہیں۔ان کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔ان سب میں سج دھج،نرمی اور نزاکت پائی جاتی ہے۔مثلاً آوارگان شوق، آسودگان خاک، دل سودا زدہ، دیدۂ حیرت زدگان، کشتہ وفا، فتنہ برخاستہ، کشیدہ تیغ، روکش ابر بہار، سر بگریباں وغیرہ وغیرہ اشعار ذیل میں ملاحظہ ہوں:

اس دھوم سے آئی ہے بہار اب کی کہ ہر سو
قدغن ہے کہ برگ گل و ریحاں کو نہ چھیڑو
رہنے دو پڑا مصحفی خاک بسر کو
اس غمزدۂ بے سر و ساماں کو نہ چھیڑو

بہار گل کی خوبی ہم دل افگاروں سے مت پوچھو
مزا گلگشت کا گلشن کے بیماروں سے مت پوچھو

جب واقف رہ رو روش ناز ہوئے تم
عالم کے میاں خانہ بر انداز ہوئے تم
نسبت تمھیں کیا تازہ نہالان چمن سے
اب نام خدا سرو سر افراز ہوئے تم

پہنے سے میاں جامہ گل دوز کے بر میں
طاؤس صفت اور بھی طناز ہوئے تم
اے مصحفی مرغانِ چمن ہوگئے خاموش
جب باغ میں جا زمزمہ پرواز ہوئے تم

جب سر انگشت کو میں دیدۂ تر پر رکھا
نام آنسو نے مرے سلک گہر پر رکھا
شوق نظارۂ دیدار نے تیرے شب دوش
تا سحر دیدۂ مہ روزن در پر رکھا

میں اس قد و عارض کو کر یاد بہت رویا
مذکور گلستاں میں کچھ سرو چمن کا تھا
جوں اشک سر مژگاں ہم پھر نہ نظر آئے
از بسکہ یہاں وقفہ یک چشم زدن کا تھا
جس مرغ چمن کو میں دیکھا تو چمن میں بھی
حسرت کش نظارہ اس رشک چمن کا تھا

شب دیکھ مہ تاباں تھا مصحفی تو حیراں
کیا اس میں بھی کچھ نقشا اس سیم بدن کا تھا

شمع اس چہرۂ پُر نور سے کیا روکش ہو
رتبۂ حسن میں جو شمس و قمر سے گزرا
ہم بھی اے ابر بہاری تجھے دکھلا دیں گے
گر کوئی لخت جگر دیدۂ تر سے گزرا
پیچ و تاب کمر و زلف سے گھبرا کے وہ شوخ
اب تو کہتا ہے میں اس زلف و کمر سے گزرا

ان سب مثالوں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کے کلام میں زندگی کے تجربات کم سہی مگر ان میں حسین اور لطیف الفاظ اور پیرایہ ہائے بیان کی بہتات ہے جن سے ہمارے ذوق لطافت کی تشفی ہوتی ہے۔ ان کی اختیار کردہ ترکیبوں میں توسیع معنی کی کوشش کم ہے، مگر عام تصورات کو رنگیں اور حسین بنانے کے لیے ان سے بہت کام لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل (باوجود شوخ جذباتی کیفیتوں کی کمی کے) ہم پر گراں نہیں گزرتی اور عام بلکہ بعض اوقات عامیانہ خیالات کے باوجود ہمیں ان اشعار میں ایک خاص قسم کا لطف محسوس ہوتا ہے۔ اس کا سبب وہی نرم و نازک اور سبک و لطیف الفاظ کی موجودگی ہے۔ یہ الفاظ ہم جنس معانی اور تصورات و خیالات کے ساتھ مل کر ان کی غزل کو ایک خاص اور منفرد نوعیت کی غزل بنا دیتے ہیں۔ یہ غزل مصحفی کی اپنی غزل ہے جو میر، درد، اثر، جرات، سوز اور غالب وغیرہ کی غزل سے بالکل مختلف ہے۔ میر کے کلام میں فارسی ترکیبوں کی آمیزش کافی ہے۔ مگر میر نے اصولاً معنی پر نظر رکھی ہے۔ ترکیب کا حسن ان کے لیے مقصود بالذات نہیں۔ مصحفی نے معنی کی جزالت اور صمیمیت کی احتیاط صرف اس حد تک روا رکھی ہے کہ کلام

معنوی لحاظ سے ادبی اشراف کے لیے نامانوس نہ ہونے پائے اور اشعار رکاکت اور ابتذال کی اس حد تک نہ پہنچنے پائیں، جس سے آگے کوئی تربیت یافتہ ادبی مذاق بڑھنا گوارا نہیں کر سکتا۔ اس حد تک مصحفی معنی کی پاسداری ضرور کرتے ہیں، مگر ان کی تمام تر توجہ حسین زبان و بیان پر مرکوز رہتی ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مصحفی کی غزل کے الفاظ ان کی غزل کے معانی اور تصورات سے ہم آہنگ ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کی غزل کے معانی اور تصورات لازماً ان کے ذہن و نفس کی گوناگوں مگر منفرد خصوصیات و کوائف کے حامل ہوں گے۔ مصحفی کی شاعری کے غائر مطالعے سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوتی ہے کہ وہ دھیمے، مبہم اور مدھم نقوش و تصورات کے شاعر تھے۔ ان کا ذہن شوخ، شدید اور پُر جوش حالتوں اور کیفیتوں کا دل دادہ نہیں۔ ان کی شاعری کی معنوی فضا خواب آلود سی ہے۔ چاندنی راتوں کی غبار آلود فضا جس کی دھندلاہٹ ہی اس کے حسن و جمال کا اصل ذریعہ ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کے علامات و رموز اور استعارے اور تشبیہیں اور ان کی دنیائے عشق کے خاص کارندے اور کردار بھی سبک رفتار اور نرم و نازک اور لطیف ہیں۔

شاعری کی دنیا میں بادِ صبا سے اکثر کام لیا گیا ہے، مگر بادِ صبا کو مصحفی کے مزاج اور تصور سے جتنی فطری مناسبت اور قربت ہے اتنی شاید ہی کسی اور شاعر کے مزاج اور تصور کو ہوگی۔ ان کے اشعار کی فضا میں بادِ صبا کا دخل بہت موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کی لطافت اور نرم روی بالکل مصحفی کی پسند کی چیز ہے جو میر کے بگولے اور گردباد کے مقابلے میں بجا طور پر ان کے لطافت پسند ذہن اور طبعی مرغوبات کی نمائندگی کرتی ہے۔ ذیل کے دو اشعار بطور نمونہ کافی ہوں گے:

ضعف اتنا ہے کہ پہنچوں میں نہ گلزار تلک
ہاتھ میں ہاتھ نہ تا بادِ صبا کا لے لوں

جیسے کل تو نے دیے تھے مجھے لا کر ویسے
پھول اس باغ میں اے بادِ صبا اور بھی ہیں

بادِصبا اور نسیم سحری سے خطاب کی صورتیں کلامِ مصحفی میں بکثرت پائی جاتی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض رسمی نہیں بلکہ ان لطیف اور دھیمی کیفیتوں کی آئینہ دار ہیں جو ذہن مصحفی سے خصوصیت رکھتی ہیں۔ نسیم سحری سے گفتگو کا یہ انداز ہے:

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

کھول دیتا ہے تو جب جا کے چمن میں زلفیں
پا بہ زنجیر نسیم سحری نکلے ہے

(میر تقی کو جب زلف کی تشبیہ سوجھتی ہے تو عموماً موجِ حباب کا تصور ان کے سامنے آتا ہے، مگر مصحفی اپنی نازک پسندی کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتے۔ انھیں نسیم اور صبا کی لطافت یاد آجاتی ہے) خلاصہ یہ کہ ان کی شاعری مدھم تصورات کی شاعری ہے خواب آلودگی اور دھندلاہٹ ان کی شاعری کے سب تصورات پر چھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے معنوی لحاظ سے کوئی واضح، روشن اور نمایاں تصور آنکھوں کے سامنے نہیں آتا۔ میں نے جب کبھی، مصحفی کی غزلیات کا مطالعہ کیا، مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ طول طویل بیابانوں میں- دور-کوئی قافلہ جا رہا ہے جو دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ ہم دور سے اس قافلے کو دیکھ رہے ہیں اور جرس قافلہ کی صدا اور حدی خوانوں کی حدی کی مبہم موسیقی سن رہے ہیں۔ یہ قافلہ آہستہ آہستہ دھندلی فضاؤں میں گم ہوتا جاتا ہے۔ بس مصحفی کی شاعری میں اسی قسم کی دھندلی فضائیں پائی جاتی ہیں جو لطیف اور خوش نما اور خوش آئند ضرور ہیں، مگر ان کی دھندلاہٹ کسی تصویر یا تصور کو شوخ یا روشن نہیں ہونے دیتی۔

ذیل کی غزل میں استعاریت کا خاص انداز ان کے ذہن کی نمائندگی کرتا ہے:

کیا نظر پڑ گئیں وہ چشمِ خمار آلودہ
شفق صبح تو ہے زور بہار آلودہ
ایک دن رو کے نکالی تھی میں واں کلفت دل
اب تلک دامنِ صحرا ہے غبار آلودہ
دور ہے سوختہ جانوں سے خیال تزئین
نہ کرے رنگ حنا دست چنار آلودہ
پھول کیا چاہیے تربت پہ شہیدوں کو ترے
جوشش خوں سے ہے خود خاک مزار آلودہ
مشتعل بسکہ ہے سینے میں مرے آتش عشق
آہ جو نکلے ہے اس دل سے شرار آلودہ
مصحفی گلشن ہستی میں تو ہم کو ہرگز
نظر آیا نہ کہیں جز گل خار آلودہ

(بہار آلودہ، شرار آلودہ اور خار آلودہ کی استعاریت پر خاص توجہ رہے)

مصحفی کے ان تصورات کے مطالعہ اور تجزیہ کا ایک اور میدان محبوب کے حسن اور اس کے متعلقات کا بیان ہے۔ مصحفی کو محبوب کے ناز و انداز کے علاوہ اس کی نرمیِ آواز سے بھی عشق ہے جس کا تذکرہ مختلف صورتوں میں کلام مصحفی میں پایا جاتا ہے۔

انداز کے صدقے ہیں نہ ہم ناز کے صدقے
گر ہیں تو اسی نرمیِ آواز کے صدقے

نرمی اور نازکی سے محبت کے طفیل ہمارا شاعر محبوب کی نازک کمر کو رگِ گل سے جا ملاتا ہے اور نازکی پسندی کی یہ شاید آخری حد ہے۔

محبوب کی نازکی کی انتہا یہ ہے کہ اس کے نازک رخسار عاشق کی بے باک نگاہوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

ترے چہرے کے ہنگام تماشا دل دھڑکتا ہے
نگاہیں سخت ہیں بے باک اور رخسار نازک ہے

یہی حال محبوب کی زلفوں کا ہے۔

نہ چھو پیارے کہ تیری زلف کا ہر تار نازک ہے
وہ کافر بل نہ دے اس کو کہ یہ زنار نازک ہے

مصحفی کے محبوب کی رفتار بھی دھیمی اور سبک ہے۔

تیری رفتار سے اک بے خبری نکلے ہے
مست و مدہوش کوئی جیسے پری نکلے ہے

مصحفی کے کلام میں لہو اور خون کے تصورات بھی موجود ہیں، مگر یہ سب رسمی اور خیالی ہیں۔ رنگوں کے سلسلے میں ان کی تصویروں کا رنگ تب ظاہر ہوتا ہے جب وہ حنا کا مضمون باندھتے ہیں اور حنا وہ دھیما اور مٹا مٹا رنگ ہے جسے مصحفی کی حسن پسند آنکھ سب سے زیادہ پسند کرتی ہے۔

پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا
بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا

حنا سے متعلق اشعار کا رنگ اگر دیکھنا ہو تو مصحفی کے پورے دیوان کا مطالعہ کیجیے۔

ان سب رجحانات کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مصحفی اپنی تشبیہوں اور استعاروں میں عموماً تجسیم کی بجائے تجرید کا رخ اختیار کرتے ہیں اور محسوس اشیاء سے غیر محسوس کا تصور دلاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تضاد و مقابلہ کم اور تجنیس اور مراعات نظیر زیادہ ہے اور یہ بھی ان کے ذہن کی اس خصوصیت کا اظہار ہے کہ انھیں رگڑ، کرختگی، شدت،

جوش اور حرکت سے کوئی دل بستگی نہیں۔ ہم رنگی اور نرمی ان کے لیے مرغوب طبیعت ہے۔

اس بحث سے مقصود یہ ہے کہ مصحفی کے کلام میں معانی اور الفاظ۔ دونوں کا بنیادی تصور، لطافت اور نفاست، دھیما پن اور مدھم پن ہے۔ انھیں شوخ اور شدید صفات اور حالتوں سے خاص دلچسپی نہیں۔ ان کے عشقیہ تصورات میں بھی تڑپ اور بے قراری کی وہ حالت نہیں جو مثلاً میر کے عشقیہ تصورات میں پائی جاتی ہے۔

یہی دھیمی اور مدھم آنچ دراصل ان کی غزل میں انفرادیت کی خصوصیت پیدا کرتی ہے۔ اظہار جذبات کی یہی معتدل روح ان کی عاشقانہ سرگزشتوں کا رنگ خاص ہے۔ معانی کے اس رنگ خاص کے لیے اظہار و بیان کا مناسب ترین انداز اور موزوں ترین انداز اور موزوں ترین زبان وہی ہے جو مصحفی کی غزلیات میں ملتی ہے۔

اس تمام تفصیل کے بعد مصحفی کے اس نمائندہ کلام کے متعلق بھی کچھ کہنا ضروری ہے جس میں ہمارے شاعر کے انفرادی نقوش (جو انہی کی خاص ملکیت ہیں) نمایاں طور پر ابھر آئے ہیں۔ مصحفی کا نمائندہ کلام (سطور بالا کی روشنی میں) وہی ہے جس میں ان کے ذہن اور مزاج کی مندرجہ بالا خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مصحفی نے شاعروں کی ضرورت اور روایت کی پابندی کے ماتحت بہت کچھ لکھا، مگر ان کا اصل کلام وہی ہے جس میں وہ خود بنفس نفیس سامنے آئے ہیں، یعنی اس میں انشا اور اُس زمانے کے دوسرے شعرا سے مسابقت کا جذبہ کم سے کم کارفرما ہے۔ اس سلسلے میں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنو کی بات بھی شاید بے محل سی ہے۔ ادب میں مقامی اور وطنی اثرات کے مؤثر ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر شاعر کا مزاج اور اس کا ذہن و نفس بہرحال بنیادی چیز ہے۔ انشا، جرات اور رنگین بھی میر اور مصحفی اور میر حسن وغیرہ کی طرح عبوری دور کے شاعر تھے مگر انشا، جرات اور رنگین ایک مخصوص ذہن و نفس کے مالک تھے جس کو ماحول نے ضرور متاثر کیا ہوگا، مگر اس کو یکسر بدل دینا ناممکن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دبستانوں کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت معدودے چند اور گنتی کے چند تصورات یا چند اسالیب اور زبان و بیان کے چند خصائص

سے کہیں زیادہ مختلف شعرا کے ذہن اور باطن کے انفرادی خصائص کا مطالعہ شاید زیادہ نتیجہ خیز اور نفع بخش ثابت ہوگا۔ اس لیے کہ چند معانی اور چند پیرایہ ہائے بیان کی بنیاد پر دہلوی اور لکھنوی رنگ خاص کی حد بندی شاید درست نہ ہوگی۔ کیونکہ دہلی اور لکھنو کے ہر شاعر کے کلام میں کچھ باتیں ایسی ضرور نکل آئیں گی جو لکھنو کے شاعر کو دہلوی اور دہلی کے شاعر کو لکھنوی قرار دیں گی۔ ان وجوہ کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ چند خاص تہذیبی اثرات کے ماسوا عموماً شعرا کو ان کے انفرادی ذہنی، روحانی اور نفسیاتی خصائص و امتیازات کی روشنی میں دیکھنا اور پرکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ شاعروں کے کلام کا غائر مطالعہ اس معاملے میں کسی واضح حد بندی کے خلاف ہے۔

بچارے مصحفی کا بھی عجب حال ہے کہ مولانا آزاد نے انھیں اس وجہ سے بچشم کم دیکھا کہ انھیں کے کلام اور شاعری۔ خصوصاً زبان ومحاورہ میں امروہہ پن کے آثار دکھائی دیے اور دلی اور امروہہ کے درمیان -مولانا آزاد کی نظر میں- اتنا فاصلہ ہے کہ مصحفی اس کو عمر بھر عبور نہیں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے انشا اور مصحفی کے جھگڑے میں انشا کا پلہ ہر جگہ بھاری رکھا اور انتخاب کلام میں بھی ان کے نمائندہ کلام کو پیش نہیں کیا۔ انھوں نے کلام مصحفی میں انشا کا رنگ نکالا ہے اور وہی غزلیں لکھ دی ہیں جن میں مصحفی انشا کا انداز اختیار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ گردن، ایاغ ٹھنڈا، آفتاب الٹا، بدن سرخ ترا، دہن بگڑا، فلاطوں مرے آگے، کی ردیف والی غزلوں میں مصحفی اپنے اصلی میدان سے بہت دور ہیں۔ فی الحقیقت یہ سب غزلیں مصحفی کے مزاج اور ذہن ونفس کے اصلی رجحانات سے بہت دور ہیں۔ ان میں جوشِ مقابلہ کی وجہ سے مصحفی نے زبردستی کا جوش اور دبدبہ پیدا کیا ہے وہ جوش وخروش اور سختی وسخت کوشی کے مضامین پر پوری قدرت نہیں رکھتے۔ ان کی اصل جاگیر نرمی، نزاکت، نفاست اور لطافت ہے۔ لطیف تصورات، جذبات کے لطیف رنگ، زندگی کی سادہ اور معتدل حقیقتیں، عشق اور شوق میں بدمستی کی جگہ سرخوشی، شکوہ وشکایت اور غم والم میں دھیمی شکایت گزاری۔ دھیمی دھیمی آنچ -لطیف افسردگی- غرض ہر طرح ایک

معتدل رنگِ سخن ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ جہاں کہیں ان کے کلام میں عشق کے واشگاف اور عریاں خیالات آگئے ہیں وہاں مصحفی اپنے پایۂ خاص سے گر گئے ہیں۔ جہاں کہیں پُر جوش یا جوش انگیز مضامین ادا ہوئے ہیں وہاں بھی مصحفی اپنے مسلکِ خاص سے ہٹ گئے ہیں۔ جس جس موقع پر شوخ رنگوں اور نصف النہار کی چمکدار فضاؤں جیسے روشن معانی کلام میں لائے گئے ہیں، وہاں ان کے کلام کی اصل چمک ماند پڑ گئی ہے۔ ان کے کلام کی اصل چمک اسی حصے میں ہے جس میں ایک خاص قسم کی دھندلاہٹ، نازکی اور لطافت ہے (کیا تصورات میں اور کیا معانی میں، کیا زبان و بیان میں اور کیا لے کاری میں)۔

حقیقت یہ ہے کہ مصحفی کا رنگ خاص عبارت ہے جذبات کے دھیمے رنگ سے الفاظ و تراکیب کے لطیف سانچوں سے، صوت و صورت کی خوش نمائی سے، دل خوش کن لے کاری سے۔ جن میں صوت اور سیرت کا عشق اور ذوق نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی زبان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ مصحفی کی زبان غزل کی زبان ہے۔ عمدہ غزل کی زبان ہے۔ اس میں انھوں نے سب سے زیادہ اس اصول کو مدِ نظر رکھا ہے کہ ان کی زبان غزل میں صوت اور صورت کی سب خوبیاں پیدا کر دے۔

(غزلیات)

الف

1☆

تھا جوش طبیعت میں یہ[1] دیوانِ ششم کا ۔۔۔ خود وصل جدا[2] ہو گیا خشتِ سرِ خُم کا
ہے مردمک[3] دیدۂ خورشید زمیں پر ۔۔۔ جو نقش ہے توسن کے ترے کاسۂ سُم کا
میں داغ سمجھ کر اسے چھاتی سے لگایا ۔۔۔ اک پر بھی لگا ہاتھ جو طاؤس کی دُم کا
اجسادِ[4] تہِ خاک کو کیوں کر نہ خوشی ہو ۔۔۔ جنبش میں ترے لب کی اک انداز ہے قُم[5] کا
گل قطرۂ شبنم سے ہے غرقِ عرقِ شرم ۔۔۔ شاید کہیں دیکھا ہے ترے کان کا جُھمکا
اس امر میں ہے مدرکہ[6] فلسفہ قاصر ۔۔۔ کیا بھید ملے عاشقِ از خود شدہ گُم کا

کیا بحثوں میں اے مصحفی ان سے عربی میں
معنی میں جنھیں فرق نہ ہووے کَم و کُم[7] کا

2

کیا ہماری بساط اور ہم کیا ۔۔۔ مہر کے آگے بود شبنم کیا

☆ ل (نسخۂ لکھنو) میں یہ غزل موجود نہیں ہے 1۔ اصل اور دیگر نسخوں میں ''نہ''۔ مطلب اس سے بھی نکل آتا ہے مگر ''یہ'' بمعنی اس قدر موزوں تر 2۔ وصل جدا ہو گیا بمعنی جوڑ الگ ہو گیا۔ 3۔ مردمک = آنکھ کی پتلی
4۔ اجساد (جسد = جسم) کی جمع 5۔ قُم = اٹھ جا (حضرت عیسیٰ کے معجزے کی طرف اشارہ)
6۔ مدرکہ = عقل 7۔ کَم و کُم = عربی زبان میں کَم استفہامیہ بمعنی کتنا اور کُم بمعنی آستین

اپنے کعبے کا ذکر کر اے شیخ — حرمِ دل سے ہے تو محرم کیا

کوئی انساں نظر نہیں آتا — ہو گیا قطع نسل آدم کیا

مرگ جب غیبتِ زمانی ہو — ہووے ثابت حدوثِ[1] عالم کیا

زخمِ تیغِ جفاے گردوں کا — غیرِ صبر و رضا[2] ہے مرہم کیا

کوہ کش ہے کمندِ زلف تری — چل سکے اس سے زورِ رستم کیا

دل ہے بیتاب میرے پہلو میں — ڈس گئی اس کی جعدِ[3] پُر خم کیا

رو لیے غم میں دل کے دو آنسو — ہم سے ماتم زدوں کا ماتم کیا

سچ ہے ہاں اہلِ درد کیا سمجھے — نوحہ کیسا مہِ محرم کیا

مصحفی مجزو وکل ہیں تیرے مطیع
یاد ہے تجھ کو اسمِ اعظم کیا؟

3

داغِ فراقِ لالہ رُخاں دل میں رہ گیا — اتنا نشان قافلہ منزل میں رہ گیا

جس زخم کی طلب تھی دمِ تیغ سے اسے — وہ زخم بے قرارِیِ بسمل میں رہ گیا

اللہ رے رعب حسن کہ اس بت کے وقتِ غسل — ہو مدعا گرہ لب ساحل میں رہ گیا

وہ بے نصیب ہوں میں کہ جس کشتے کا گلا — ارمانِ آب خنجرِ قاتل میں رہ گیا

تل سے گیا نہ حسن بنا گوش[4] کا تری — کافور تھا یہ صحبتِ فلفل[5] میں رہ گیا

کوہی[6] کریں گے اس کے تئیں اپنی سجدہ گاہ — اس کا نشانِ پا جو کسی سل میں رہ گیا

سائل کو جو کسی نے دیا، ہوگیا وہ خرچ — داغِ درم مگر کفِ سائل میں رہ گیا

حیرت ہے مجھ کو طائرِ عرش آشیانِ[7] روح — پابند ہو کے کیوں قفسِ گِل میں رہ گیا

1۔ حدوث = قدیم کی ضد 2۔ ل و ب (لکھنؤ و بنارس) رضای مرہم (صریحاً غلط)

3۔ جعد = چوٹی 4۔ ل: بنا گوش یار کا 5۔ کالی مرچ 6۔ کوہی: پہاڑی علاقے کے رہنے والے

7۔ ل: عرش آشیانہ روح

اک ریختہ تو تو نے[1] لکھا پھر بھی مصحفی
مت کہیو شوقِ نظم مرے دل میں رہ گیا

4

کیا شک کچھ اس کو حلّتِ[2] بسمل میں رہ گیا؟ خنجر جو چل کے پھر کفِ قاتل میں رہ گیا
حسنِ عذار سے نہ ہوا مطلع میں آہ پُتلی کا تل جو رخ کے ترے تل میں رہ گیا
فانوس کا سا رنگ ہے لیلیٰ کا دودِ[3] آہ رک رک کے بس کہ پردۂ محمل میں رہ گیا
ممنونِ دستِ تیغ ہوا میں نہ وقتِ مرگ کیا کیا نہ یار کے دلِ جاہل میں رہ گیا
پردہ نہ تھا ادھر تو کوئی شانِ حسن پر تو خود گماں کے پردۂ باطل میں رہ گیا
دیں کشتیاں بہا یمِ گریہ[4] نے مثلِ خس میں ناتواں حمایتِ ساحل میں رہ گیا
لیلیٰ چلی تھی حج کے لیے جذبِ عشق سے ناقہ مچل کے نجد کی منزل میں رہ گیا
تھا اوس کا نہ قطرہ تو پھر آہ کس لیے سنبل کے تاروں کے میں سلاسل میں رہ گیا

اک مشتِ استخواں نظر آتا ہے مصحفی
تو ہی بتا کہ کیا ترے مائل میں رہ گیا

5

اس کے رُخ پر جو خط نکل آیا جرمِ[5] خورشید میں خلل آیا
نامہ قاصد کو دے کے میں نے کہا میں بھی پیچھے سے تیرے 'چل' آیا
بانک پن ہے دلیل خامی کی تیغ فولاد میں نہ بل آیا
مشک کاندھے پہ رکھ، وہ سقّے کا راہ میں مرد و زن کو چھل آیا
اس نے کل جاتے دیکھ مجھ کو کہا ان دنوں پھر یہ کچھ سنبھل آیا

1۔ ل: تو پھر بھی لکھا تو نے مصحفی 2۔ حلت = حلال ہونا 3۔ ل: دودہ آہ
4۔ یم گریہ = آنسوؤں کا سیلاب 5۔ جرم خورشید = سورج کا بدن

نخلِ حرماں کی کچھ خبر مت پوچھ پھول آیا نہ اس میں پھل آیا
جب دُرِ گوش اس کا یاد کیا اشک عارض پہ ووں[1] ہی ڈھل آیا
باغِ جنت میں جا کے نالہ مرا مرغ خوش خواں کے ہونٹ[2] مل آیا
گرچہ فرقت میں اس کی ساری رات ق چین تجھ کو نہ ایک پل آیا
اے دل اتنی بھی کر نہ بے صبری قاصد اس کُو سے آج کل آیا
مصحفی پیر ہو گئے پہ مجھے یاد مطلع یہ بر محل آیا
کاسۂ سر مرا نکل آیا
بُنِ دنداں میں بھی خلل آیا

6

نکل جاوے کسی صحرا میں یا رب کاش دم میرا نہ ہووے میرے ہمسایوں کو تا زنہار غم میرا
ترے موئے کمر کی رہبری کا کیوں نہ ممنوں ہوں ارادہ دیر سے تھا جانبِ ملکِ عدم میرا
میں مجنوں ہوں مجھے کیا کام ہے صورت پرستی سے خیال روئے لیلیٰ دل میں میرے ہے صنم میرا
گیا گورِ غریباں سے تو میں پر مجھ کو یہ غم ہے خدا جانے پڑا کس کس کی چھاتی پر قدم میرا
نہ مرتا عہد میں اس کے کوئی بیمارِ[3] پامالی بنانِ[4] عیسیٰ مریم میں گر ہوتا سر قلم میرا
نہیں میں چاہتا کوئی شریک آہ و زاری ہو رہے مجھ کو مبارک رات دن درد و الم میرا
ملا ہے عاشقی میں رتبۂ پیغمبری مجھ کو میں اس سے کیوں دبوں مجنوں نہیں کچھ ابنِ عم میرا
چراغِ دَیر ہوں پر تجھ سے شیخی کیا کروں اپنی نہیں دیکھا ہے جلنا تو نے اے شمعِ حرم میرا
لبِ شیریں کا اس کے مصحفی میں وصف لکھتا ہوں
مزیّب[5] ہے رکھیں اب نام گر شیریں رقم میرا

1۔ اصل اور دیگر نسخوں کے کاتب "ووہیں" لکھتے ہیں۔ فعلن کے وزن پر ہے تو "ووں ہی" کر دیا گیا۔ بصورتِ دیگر "وونہی" 2۔ اصل: ہونٹھ۔ ہر جگہ "ہونٹ" کر دیا گیا 3۔ ل: نایابی
4۔ بُنان بُنانہ = انگلی کی پور) کی جمع 5۔ مزیب ہونا = زیب دینا

7

اے تار ہائے سنبل، بستار[1] کیا تمھارا — ان گیسوؤں کے آگے مقدار کیا تمھارا

حصے میں تم ہمارے آتے نہیں جو پیارے — دشمن رقیب ہی[2] تھا حق دار کیا تمھارا

تم دونوں دیدہ و دل باہم بلائے جاں ہو — سچ ہے کہ کوئی پاوے اسرار کیا تمھارا

دیدار آخری تو تم دیکھ جاؤ اس کا — کچھ تم سے مانگتا ہے بیمار کیا تمھارا

بدلی سے مہ نکل کر چھپ چھپ گیا جو دیشب[3] — بالوں میں جلوہ گر تھا رخسار کیا تمھارا

اے منعمو، فلک نے قبریں بھی جب مٹا دیں — پھر رہ گیا زمیں پر آثار کیا تمھارا

روٹھے ہو کس گنہ پر کیوں بولتے نہیں تم — دل ہم سے ہو گیا ہے بیزار کیا تمھارا

موسیٰ نہ تاب لایا اک جلوے کی تو ہم سے — دیکھیں گے ہو کے سمکھ[4] دیدار کیا تمھارا

میاں مصحفی ہو تم تو آزاد مذہب و دیں
اقرار کیا تمھارا، انکار کیا تمھارا

8

کس کی زباں نے اس کے تئیں گوش[5] کر دیا — جو مصحفی نے نالہ فراموش کر دیا

وہ مست ہوں کہ نعرہ سبوح[6] نے مرے — شب پیرِ خانقاہ کو بے ہوش کر دیا

تھوڑا ہے یہ کہ تجھ کو میں اے آہِ ناتواں — موجِ نسیمِ صبح سے ہم دوش کر دیا

شکوہ ہے یہ کہ تو نے بھی اے گردشِ فلک — اک شب نہ مجھ کو اس سے ہم آغوش کر دیا

کس کی سوادِ زلف تھی حیلولۂ[7] زمیں — جو ماہ و آفتاب کو روپوش کر دیا

رکھتا نہیں میں ہاتھ سے ساغر جو مصحفی
کس مستِ چشم نے مجھے مے نوش کر دیا

1۔ بستار، وستار = پھیلاؤ 2۔ ل : سے 3۔ دیشب = گزشتہ رات 4۔ سمکھ = سامنے
5۔ گوش کرنا = ستانا 6۔ سبوح = پاک، پاکیزہ 7۔ حیلولہ = حائل (سورج گرہن، چاند گرہن کی طرف اشارہ

9

گل کھا کے تو نے پہنچے پہ دی آستیں جلا — اچھا ہوا ترا بھی دل اے نازنیں جلا
جوں سوزِ غم سے سینے میں شب دل ٹپک گیا — مجمر[1] پہ یوں سپند کا دانہ نہیں جلا
پروانہ مل کے مرگ کا روغن بہ پیشِ شمع — آتا ہے تا کہ شعلہ اسے دے وونہی جلا
مانی نے منصفی[2] سے ترے حسنِ رخ کو دیکھ — لاکھوں دیے[3] مرقعِ تصویرِ چیں جلا
ثعباں[4] ہوں میں نہ اس کی کہیں خاک بھی ملے — دیوے جسے مرا نفسِ آتشیں جلا
تا پہنچے[5] سوزش اس کے بھی دل کو تو آگ میں — تعویذ حُب کے اے دلِ محنت قریں جلا
دیکھی جو آبداریِ لختِ جگر مری — آتش میں رنگ سرخ کی اپنے نگیں جلا
تابش میں مہر کی جو وہ آئی پیادہ پا — لیلیٰ کی خاک پر دلِ صحرا نشیں جلا
میں ہوں گلیمِ بختِ سیہ کی پناہ میں — اس کو بھی برقِ حسن نہ دیوے کہیں جلا
وہ نخلِ خشک ہوں میں گلستانِ دہر میں — بن آگ جس کا ریشہ بہ زیرِ زمیں جلا
بندہ ہوں سخت جانیِ دل کا میں اب تلک — یہ آگ میں بھی جیسے سمندر نہیں جلا
نیلم کو داغِ دل کے جو لے جاؤں اس کی نذر — کہتا ہے ناز سے وہ کہ ہے یہ نگیں جلا

کرتا ہے آہ و نالہ بہت مصحفی تو کاش
دیوے تری زباں نگہِ سرگیں جلا

10

ہر دم کی آہ سے دلِ اندوہ گیں جلا — اس سے زیادہ مست نفسِ آتشیں جلا
مانندِ شمع تو نہ مرے سر سے دور[6] ہو — اے داغِ عشق ابھی تو میں سارا نہیں جلا
آیا ہے قیس نجد سے تو اپنے گھر میں آج — گھی کے چراغ لیلیِ محمل نشیں جلا

1۔ مجمر = انگیٹھی، عوددان 2۔ منصفی = زروئے انصاف (ل میں مصحفی سے)
3۔ ل : دیے ہیں کاغذِ تصویرِ چیں 4۔ ثعبان = اژدہا، زہریلا سانپ (ل میں لویاں)
5۔ ل : پہنچے ہے 6۔ ل: دود

ساعد کو تیرے دیکھ کے آتش میں رشک کی — دیتی ہے شمع ساعدِ بے آستیں جلا
کس زلفِ مشک بار کی بو لے گئی نسیم — نافے[1] میں داغِ غم سے جو یوں مشک چیں جلا
کیا شکوۂ تغافلِ خوباں کروں میں آہ — دیتی ہے جی ہی کو نگہ سرگیں جلا
اے آفتابِ حسن فلک پھنک رہا تو ہے — اس چال سے تو مت دلِ اہلِ زمیں جلا
آتش نفس وہ ہوں میں کہ گر بیٹھے میرے پاس — بے اختیار بولے یہی، ہم نشیں جلا
گورے بدن پر اپنے تو نازک بدن مرے — جاے سپند برگِ گلِ یاسمیں جلا
شب کاوشِ اجل سے تو بتی[2] بھڑک اٹھی — کیسا چراغِ عمر دمِ واپسیں جلا
کیا کیا کہ دھونیاں نہ ملیں اس کو آہ کی — جب تابِ مہر سے وہ رخِ نازنیں جلا

اس شب یہ مصحفی مجھے غم ہے کہ دل مرا
مثلِ چراغِ خانۂ مفلس نہیں جلا

11

راہِ سخن میں میرؔ بھی گو خوش رقم پڑا — مرزا سے پیشتر نہ پر اس کا قدم پڑا
اس انجمن میں جسم بھلا پوچھتا ہے کون — جس جاصفِ[3] نعال میں ہے جامِ جم پڑا
بس ووں ہی آگئی دلِ نازک پہ یاں شکست — موجِ ہوا سے گر تری زلفوں میں خم پڑا
دہشت سے پانو رکھ نہیں سکتی اجل بھی واں — جس جا ہے تیرا کشتۂ تیغِ ستم پڑا
اس کے دہن کا مسئلہ آیا جو درمیاں — قضیہ بڑا میانِ وجود و عدم پڑا
کرتی نہیں جو ذبح اسے تیری تیغِ ناز — لوٹے ہے خونِ یاس میں صیدِ حرم پڑا
اب بت کدہ خراب ہے کیا دن تھے وہ بھی جو — رہتا تھا پردہ بر درِ بیت الصنم پڑا
شب کس کے رنگ سرخ سے یا رب دوچار تھا — خورشید آج زرد نظر صبح دم پڑا
بنیاد دم میں عالمِ ہستی کی ہو گئی — بس جس گھڑی کہ قالبِ آدم میں دم پڑا

1۔ ل :قافے میں (سہو کتابت) 2۔ ل، ب = تھی 3۔ صف نعال میں = جوتیوں میں (یعنی بری جگہ)

سر تو نے بے گناہوں کے ناحق قلم کیے　　آخر یہ ماجرا بہ زبانِ قلم پڑا

دعوے کی جس نے بازی رکھی مجھ سے آخرش　　بستر پہ تپ کے جا کے وہ بیمارِ غم پڑا

میں معتقد ہوں بس ترے طالع کا مصحفی

پانسہ کسی کی جیت کا ایسا بھی کم پڑا

12

مستی میں جو کفرِ صنم دہ دلہ[1] توڑا　　مدت کا یہ عاشق نے خمار کلہ توڑا

رنگین ہے بیابانِ جنوں، خار نے شاید　　مجنوں کے کفِ پا کا کوئی آبلہ توڑا

پھر فصلِ بہار آئی جو ہے شور چمن میں　　شاید ترے دیوانے نے پھر سلسلہ[2] توڑا

جب اس میں سمائی نہ ہوئی عشق کی مے کی　　پتھر سے میں جامِ دلِ بے حوصلہ توڑا

ناقے کا جو آگے کو قدم اب نہیں پڑتا[3]　　دم قیس نے شاید کہ پسِ قافلہ توڑا

سالک ہیں وہی راہِ فنا کے کہ جنھوں[4] نے　　سر کبر و رعونت کا بہ ہر مرحلہ توڑا

سن لیجیو اک روز کہ یہ کاخِ[5] زبرجد　　بے تابیِ دل نے مری بے زلزلہ توڑا

اس ضبط کے صدقے ہیں[6] کہ پہلو ہی میں ہم نے　　پتھر سے سبوے دلِ پُر ولولہ توڑا

اے مصحفی لکھی غزل اک اور بھی یعنی

دُر ریزیِ[7] معنی کا نہ میں سلسلہ توڑا

13

میں تو نہ محبت کا تری سلسلہ توڑا　　پر[8] تو نے ہی عہد اے صنمِ قاتلہ توڑا

بے وجہ یہ باتیں نہیں خوبانِ پری رو　　پہنیں[9] ہیں کوئی ہاتھوں میں بے مشغلہ توڑا

گو نجد تو نزدیک ہے پر ساتھ کے باعث　　جاتا نہیں لیلیٰ سے دل قافلہ توڑا

1۔ دہ دلہ = بے وفا، متلون مزاج　2۔ سلسلہ = زنجیر　3۔ ب : بڑھتا

4۔ ب: جنھوں میں　5۔ کاخِ زبرجد (کاخ = محل، زبرجد = زمرد جو نیلا ہوتا ہے) مراد آسمان

6۔ ل : میں　7۔ در پر ترے　8۔ اصل : لے　9۔ ب : پہنے ہے

شب دزدِ تصور نے ترے کیا کہوں ساقی　اک جام پلا قفلِ درِ حوصلہ توڑا
حسرت کی جگہ یہ ہے کہ قاصد نے مرے دم　منزل سے رہا تھوڑا سا جب فاصلہ توڑا
جب آمنۂ چرخ سے چھیلا[1] نہ گیا رنگ　جھنجھلا کے مہِ نو نے وونہی مصقلہ[2] توڑا
انگشت وہ ہوں خار گلستان جنوں کی　جس نے نہ کبھی غنچے کا اک آبلہ توڑا
آتی ہے مجھے بوے جنوں نکہتِ گل سے　پھر بادِ بہاری نے مگر سلسلہ توڑا

اے مصحفی ایسی یہ غزل میں نے لکھی ہے
تھوڑا ہے، اگر دیوے تو اس کا صلہ توڑا

14

کھینچا چمن میں آتشِ گل نے زبانہ[3] کیا　مرغ چمن کا پھونک دیا آشیانہ کیا
صرصر کی طرح جاوے ہے وہ خود اُڑا ہوا　درکار زخشِ عمر کو ہے تازیانہ کیا
جب درد دل سے عرصہ ہستی ہو مجھ پہ تنگ　یاروں سے دردسر کا کروں میں بہانہ کیا
مجنوں کے ماجرے سے مری نیند اُڑ گئی　بے درد قصہ خواں نے یہ چھیڑا فسانہ کیا
جلتے ہوں جس جگہ کہ فرشتے[4] کے بال و پر　واں قاصدِ خیال کو کیجیے روانہ کیا
آشفتہ سب ہوئے ہیں جو بالیں پر اس کی جمع　مارے ہے تیری زلف کا بیمار شانہ کیا
حیرت سوا کچھ اور نہ اس میں نظر پڑا　دریاے معرفت کا بتاؤں کرانہ[5] کیا
جس جا کہ ساز نالہ کو چھیڑوں میں مطربا[6]　واہ پیش جاوے شورشِ چنگ[7] و چغانہ کیا

کیوں بولتا نہیں روش اپنی پہ مصحفی
تو بھول ہی گیا غزلِ عاشقانہ کیا

1۔ ح: بدلا نہ گیا رنگ　2۔ مصقلہ = ریتی، صیقل کرنے کا اوزار　3۔ زبانہ = آگ کی لپٹ
4۔ ل: فرشتوں　5۔ کرانہ = کنارہ　6۔ ل: مطربوں　7۔ چنگ اور چغانہ = دو ساز

15

یہ بات سن کہیں گے سب اہلِ زمانہ کیا
قاصد کے پیچھے کیجیے قاصد روانہ کیا

لگتا نہیں جو خار و خسِ آشیاں میں دل
چنگل یہ باز کا ہے مرا آشیانہ کیا

تعذیرِ جرمِ عشق کو کافی ہے تارِ زلف
تو جعد کو بناوے ہے پھر تازیانہ کیا

حکمت ہیں تیری چشم میں لاکھوں، سمجھ سکے
گردش کو اس کی گردشِ دورِ زمانہ کیا

مژگاں کے ترکشوں سے جو اس کی ہوا دوچار
بنتا تھا میرے دل کو ہی زنبور خانہ کیا

آیا جو بازِ عشق کے پنجے میں مرغِ دل
قسمت میں اس کی تھا نہ لکھا آب و دانہ کیا

بسمل ترا کرے[1] ہے جو سجدے زمین پر
اس کی نظر پڑا ہے کوئی آستانہ کیا

جاتے ہیں موے[2] جعد ترے جانبِ کمر
یہ قافلہ ہوا ہے عدم کو روانہ کیا

پانو پہ تیرے رہ گیا سر رکھ کے مصحفی
مرنے کا اس کے ہاتھ لگا ہے بہانہ کیا

16

ہم بھی کرلیں گے ہر اک مو سے رگِ جاں پیدا
آبداری تو کریں نشترِ مژگاں پیدا

ڈھونڈے ہم کو جو کوئی جامۂ عریانی میں
ہووے گردن نہ کبھی زیرِ گریباں پیدا

پیہ[3] عاشق تو نہیں صرف ہوئی اس میں کہ ہے
شمع سے بوے کبابِ دلِ سوزاں پیدا

سرخیِ پان کا عالم دہنِ تنگ میں دیکھ
غنچۂ گل میں کیا جس نے گلستاں پیدا

مژدہ اے یاس کہ رکھتے ہی قدم رستے میں
آئے قزاق، ہوئی گردِ سواراں پیدا

دست و خنجر میں ترے کچھ یہ حلاوت ہے کہ ہاے
زخم کے ساتھ ہی ہوتا ہے نمکداں پیدا

استخواں سرمہ بنادے گی مرے آخر کار
اور کیا صبح کرے گی شبِ ہجراں پیدا

یار بالیں پہ مری نزع کے دم بیٹھا ہے
تو نہ ہو چشم سے اے حسرتِ پنہاں[4] پیدا

1۔ ل : کوئی ہے 2۔ اصل اور ل : سوے جعد 3۔ پیہ = چربی 4۔ ل: حسرت و حرماں

قتل کو خاک نشینوں کی عجب کیا جو کرے دمِ شمشیر سنجاف[1] تہِ داماں پیدا
بہرِ احیاے غمِ مردہ دلاں کرتی ہے فتنے کیا کیا نہ تری جنبشِ مژگاں پیدا
جل نہ جاوے کہیں ہمسائے کا گھر ڈرتا ہوں شعلہ کرتی ہے یہ آہِ شرر افشاں پیدا
مصحفی اور بھی لکھ جا غزل اک ایسی گرم
جس کے ہر شعر سے ہو برقِ درخشاں پیدا

17

کرکے صانع نے کفِ خاک سے انساں پیدا ،گلِ آدم سے کیا فتنۂ عصیاں پیدا
وصل کے دن بھی میں محرومِ ازل ہوں محروم ہے نگاہوں سے مری حسرت و حرماں پیدا
کافری عام ہوئی ہے یہ ترے عہد میں شوخ ڈھونڈے کعبے میں تو ہووے نہ مسلماں پیدا
ذبحِ عاشق کی یہ ہے فرد کہ ہاتھوں میں ترے پیرہن خوں کا کرے خنجرِ عریاں پیدا
گرد ہستی نظر آتی تھی کسے، وقتِ خرام اس کی ٹھوکر سے ہوا عالمِ امکاں پیدا
وصل کی صبح کا میں رخ بھی نہ دیکھا کہ ہوئی سامنے سے یہ سوادِ شبِ ہجراں پیدا
کیوں نہ وہ زیر و زبر ہووے کہ صانع نے کیا گرد عاشق کے لیے محشرِ داماں پیدا
ژالہ خوردہ جو زمیں ہے مرے اشکوں کی، کبھی سبزہ ہوتا نہیں واں موسمِ باراں پیدا
اشک کی طرح میں سرگشتہ پھرا محشر میں دست خس سے نہ ہوا سایۂ مژگاں پیدا
جنبشِ نبض سرِ دستِ مسیحا میں مری اب تلک کرتی ہے صد محشرِ پنہاں پیدا
ہاتھ دامن کو لگایا تھا جنھوں نے اس کے روزِ محشر وہ ہوئے سر بہ گریباں پیدا
ہر بُنِ مُو پہ مرے اس کی دمِ تیغ زدن پیشتر زخم سے ہوتا ہے نمک داں پیدا
مصحفی میں تو خریدار ہوں جی تک اس کا
صبر کم بھی جو کہیں ہو کسی عنواں پیدا

1۔ سنجاف = کناری

18

فرشتوں کو بھی نہ اس کا بدن نظر آیا — حیا شہید نہ زیرِ کفن نظر آیا
کبھی جو رونقِ مژگاں ہوئے سرشک مرے — تو نوکِ خار میں رنگِ چمن نظر آیا
پتنگ شعلے پہ جا ہی گرا جو صدقے ہو — کمال اس کا دمِ سوختن نظر آیا
کبھی جو آنکھ پڑی اپنی موجِ دریا پر — کسی کی زلف کا پیچ و شکن نظر آیا
کہوں لطافتِ تن اس کی کیا کہ مثلِ حباب — نہ مجز ہوا بہ تہِ پیرہن نظر آیا
جب اس نے تیشۂ آخر سے سر دو پارہ کیا — ہمیں تو تب ہنر[1] کوہ کن نظر آیا
تمام عمر اسی کش مکش میں میں تو رہا — کہ چھپ گئی وہ کمر گر دہن نظر آیا
میں جس کی شاخ کو سمجھا تھا کاکلِ پُر پیچ — کبھو نہ دشت میں پھر وہ ہرن نظر آیا
مقابلہ خمِ ابرو کا تجھ سے ہو نہ سکا — ہلالِ عید، ترا بانک پن نظر آیا

میں شرق و غرب کو اے مصحفی کیا غربال
نہ تجھ سا شاعرِ شیریں سخن نظر آیا

19

یارب اک شب تو رخِ آرزوے دل دکھلا — خواب میں تو کبھی وہ شکل و شمائل دکھلا
اے اجل تو ہی پہنچ داد کو میری دمِ نزع — نہ مجھے رنجِ کفِ بازوے قاتل دکھلا
کب تلک لطمہ خورِ موجِ حوادث وہ رہے — میری کشتی کو بھی یا رب رخِ ساحل دکھلا
زخم کا تجھ پہ[2] گماں ہو جسے اے فندقِ یار — خوں بھرا اس کو سرِ طائرِ بسمل دکھلا
سامنے اس کی تو صورت کے برا لگتا ہے — اپنی صورت نہ مجھے اے مہِ کامل، دکھلا
ساقِ پا پر بھی نظر کر مرے دیوانے کی — موجِ دریا، نہ اسے اپنی سلاسل دکھلا
تا تسلی ہو کسی طرح تو مجنوں کے تئیں — تو ہی اے ابرِ سیہ ناقہ و محمل دکھلا

1۔ ل : بسر 2۔ ل : گماں ہووے جسے

اہلِ دنیا کو سوے گورِ غریباں لا کر — بارے اے موت، تو یہ دفترِ باطل دکھلا
آتشِ رشک میں جل جاوے گا مہ مثلِ سپند — اپنے عارض کا نہ ظالم تو اسے تِل دکھلا

مصحفی اب مجھے نقشہ غزلِ ثانی کا
کر کے چہرے سے جدا پردۂ حائل، دکھلا

20

صورت یاس نہ اے آئینۂ دل دکھلا — جس سے ہو زندہ ہوس پھر وہ شمائل دکھلا
گر نہیں حسرتِ جاوید نصیبِ مجنوں — گرد چھپ جاوے ہے کیوں دور سے محمل دکھلا
میں تو نومید ہوں ساحل سے ذرا خوش کر دے — تو ہی اے پشت نہنگ اب مجھے ساحل دکھلا
ہو کے زخمی نہ کر[1] اس شوخ کا پیچھا اے دل — دشمنوں کو نہ رہِ کوچۂ قاتل دکھلا
اتنا ناداں نہ ہو ہر ایک منجم کے تئیں — کفِ دست اپنا نہ اے حور شمائل دکھلا
شک ہے یاروں کو اگر سنگ دلی میں تیری — ساتھ لا کر انھیں تربت کی مری سِل دکھلا
ایک دارو ہے اجل عمر کے کاغذ میں نہیں — جس کو چاہے اسے یہ نسخۂ باطل دکھلا
سالکِ راہِ فنا جو ہیں انھیں تو اے عشق — ہر قدم کعبۂ مقصود کی منزل دکھلا

جس میں حیرت زدگاں بیٹھے ہوں لب بر بستہ
مصحفی مجھ کو بھی اک روز وہ محفل دکھلا

21

شب کہ خونِ جگر آنکھوں سے رواں ہونے لگا — ووں ہی تاراج متاعِ دل و جاں ہونے لگا
جس کو میں تیرے دُرِ گوش کا سمجھا تھا شبیہ — وہی تارا مری آنکھوں سے نہاں ہونے لگا
تیرہ بختی یہ کھنچی دور کہ واں رنگِ مسی — لب و دنداں سے گزر زیبِ زباں ہونے لگا
اک کلی جاں دیے پر بھی تو گل چیں نے نہ دی — نرخِ گل اول موسم ہی گراں ہونے لگا

1۔ ل : پکڑ

چودھویں رات سرِ بام پر آیا جو وہ ماہ
آرزومندی سے مہتاب کتاں ہونے لگا

پھر شبِ ہجر نے کی مُہر دہن واوائے وائے
پھر دلِ غمزدہ سرگرمِ فغاں ہونے لگا

مجھ کو جوں نقطۂ موہوم کیا حک[1] تو نے
جب تری خاطرِ نازک پہ گراں ہونے لگا

نالہ میرا جو مرے کان تلک بھی پہنچا
مجھ پہ ہر ایک کو طاقت کا گماں ہونے لگا

منھ سے پردہ جو اٹھایا سرِ بازار اس نے
واں ہی سودائیوں کے جی کا زیاں ہونے لگا

چندے بھولا تھا ترے چشم کا دھیان اس کے تئیں
پھر ادھر دیدۂ نرگس نگراں ہونے لگا

اک طرف گل کے لگے زرد ہو پتّے جھڑنے
کیا ستم باغ پہ ہنگام خزاں ہونے لگا

جھد سے کام محبت میں جو گزرا تو وونہی
خود بخود نام ترا وردِ زباں ہونے لگا

آخر[2] اس کو بھی تری چشم کی گردش نے تکا
آسماں تیرِ تغافل کا نشاں ہونے لگا

مصحفی بزم میں وہ مہ جدھر آکر بیٹھا
مائل اودھر ہی دلِ پیر و جواں ہونے لگا

22

ہجومِ شوق نے مجھ سے قلق کا کام لیا
یہاں تلک کہ میں شب دل کو تھام تھام لیا

کمال ضبط کا خونِ جگر سے کام لیا
میں گرتے گرتے جو مژگاں پہ اشک تھام لیا

فغاں کا میں نے خموشی سے اپنی کام لیا
نہ کچھ کہا نہ کبھی عاشقی کا نام لیا

تری نزاکتِ ساعد کے صدقے جس سے کبھو
نہ کف پہ جوں گلِ نرگس درست جام لیا

سبک میں چشمِ رقیباں میں کیوں نہ ہوں کہ کبھی
نگاہوں میں بھی نہ اس نے مرا سلام لیا

ہماری چشم نے وقتِ نظارۂ خمِ زلف
ہر ایک بال سے لطفِ سوادِ شام لیا

نشست و خاست دی[3] ایسی کہ جی ہی ٹوٹ گیا
مقام خوان نے دوگانے کا مقام لیا

نقاب میں جو وہ زلفوں کو اب چھپاتا ہے
اسیر تازہ کوئی کیا بہ زیرِ دام لیا؟

1۔ حک کرنا = مٹا دینا، کھرچ دینا 2۔ل : آخرش کو 3۔ ل : کی ایسی چھبی تو ٹوٹ گیا

رُطب[1] سے کرتے ہیں افطار روزہ کیا ڈر ہے
میں تیرے لب کا جو بوسہ مہِ صیام لیا

ہوئے جریح[2] وہ لب مصحفی کے دنداں سے
کہ اس کمینے نے گالی کا انتقام لیا

23

نزع میں بالیں پہ میری شب کہ وہ مہ پارہ تھا
ہر نگاہِ یاس میں سامانِ صد نظارہ تھا

شوقِ بے باکِ جنوں کی پیش دستی دیکھیو
آستیں سے ہاتھ تا نکلے گریباں پارہ تھا

چاہتا تھا قطرۂ اشک اپنا اس کے دل میں راہ
ریزۂ الماس کو قصدِ شکستِ خارہ تھا

خاک سے کس زندہ عاشق کی اُگی ہے اس کی لے
جو قلم ہم نے تراشا خون کا فوارہ تھا

تھی ہمیں سرگشتگی میں راحتِ طفلی نصیب
جو بگولا تھا ہماری خاک کا گہوارہ تھا

چوب[3] بھی اس پر لگاتا تھا میں کیا کیا زور سے
پشت آہو پر جو وحشت کا مری نقارہ تھا

بھر رکھا ہے اب تو میں اس کی جراحت میں نمک
داغِ دل اپنا کبھی چشمک زنِ سیارہ تھا

مصحفی اقبال صورت اس سے ہوتا تھا[4] عیاں
جب ہیولٰی بطنِ فطرت میں مرا انگارہ تھا

24

دلِ مجروح کو اپنے ہی جو معدن سمجھا
لعل و یاقوت کو وہ سنگ فلاخن سمجھا

دین و ایماں تری خاطر میں گنوایا اپنا
اور نہ اتنا بھی تو اے عقل کے دشمن سمجھا

مسی آلودہ لب اس شوخ کے آئے جو نظر
غنچۂ گل میں وہ برگِ گلِ سوسن سمجھا

بزمِ ماتم ہوئی اُس بن مجھے بزمِ عشرت
نغمۂ عیش کو میں نالۂ شیون سمجھا

جامہ مجنوں کے نہ جب تن پہ ہوا زیب آور
گردِ صحرا کو اودرسے[5] کی وہ چیکن سمجھا

داؤ استاد سے بس کھا ہی گیا[6] آخر کار
فنِ کُشتی کو نہ تو اے بتِ پُر فن سمجھا

1۔ رطب = تازہ کھجور 2۔ جریح = مجروح 3۔ ل : چوب کو 4۔ ل : ہوتا ہے
5۔ اودرسا = ایک قسم کا کپڑا 6۔ ح : لیا، اصل، بدا

مجھ پہ چھن چھن کے بلا گرتی رہی گردوں سے — اور نہ تاروں کو میں غربال کے روزن سمجھا
جب مرے دل پہ میاں ان کی چلیں سنگینیں — صفِ مژگاں کو ترے ناز کی پلٹن سمجھا
میرے مقتل سے خراماں جو گیا یار مگر — موجِ خوں کو وہ سنجافِ تہِ دامن سمجھا
نہ ہوا رنج کچھ اس بت کو مرے نالے سے — وہ اسے نالۂ ناقوسِ برہمن سمجھا
ہے سکندر جو بہت آبِ بقا کا طالب — سنگ پا کا ترے شاید اسے دھوون سمجھا
لے گیا چاہِ زنخداں میں تصور جو مجھے — شبِ تاریک میں اس کو، چہ بیژن[1] سمجھا

مصحفی اور بھی ٹک زور طبیعت دکھلا
میں فنِ نظم میں ہوں تجھ کو تہمتن[2] سمجھا

25

دیدِ عالم کو میں نظارۂ گلشن سمجھا — روز اور شب کو یہاں کے گلِ سوسن سمجھا
میری ہمت نے تقاضا نہ کیا واں[3] زنہار — پیشتر عرش سے جب اپنا نشیمن سمجھا
سر جھکا کر ترے قدموں سے اٹھایا نہ کبھی — طوقِ تسلیم کو میں حلقۂ آہن سمجھا
لے گیا باغ میں صیاد اسے تو مرغ اسیر — تیلیوں کو قفسِ تنگ کی چلمن سمجھا
کشت امید مرا سبزہ ہوا یاس کے بیچ — تیرِ بارانِ بلا کو بھی میں ساون سمجھا
ہٹ گیا باغ کے جانے سے مرا جی تو وہ بھی — وہم میں جب رگِ گل کو رگِ گردن سمجھا
شاخِ گلبن پہ تجلی جو مجھے[4] آئی نظر — میں اسے بھی شجرِ وادیِ ایمن سمجھا
بدگمانی پہ نظر کر کہ مرا وہم غلط — دیدۂ مور کو دیوار کا روزن سمجھا
جب کہ زردابۂ اشک اپنی چوا آنکھوں سے — ہر مہوّس اسے ہرتال[5] کا روغن سمجھا
پیچ کھایا یہ فلک نے مرے نالے[6] سے کہ رات — ہر ستارے کو میں آہِ شرر افگن سمجھا

1۔ بیژن = نام کا پہلوان، گیو کا بیٹا، رستم کا بھانجا۔ افراسیاب کی بیٹی منیرہ پر عاشق ہو کر کنویں میں قید کیا گیا (لغات کشوری) 2۔ تہمتن = بہادر، نیز رستم کا لقب 3۔ ب : واں رہنا 4۔ ل : مجھے آئی جو نظر
5۔ ہرتال = گندھک 6۔ل : نالوں

خار پاؤں میں چبھے میرے تو پھر ان کے لیے دوسری بار انہی[1] کانٹوں کو سوزن سمجھا
جوں غبار اس سے گیا اُٹھ کے لپٹ صحرا میں کیا بگولے کو بھی میں یار کا دامن سمجھا
مصحفی باگ[2] تو لی اس نے بہت مقتل میں
کیا کرے وہ کہ نہ اس شوخ کا توسن سمجھا

26

شبِ جمعہ کیا میں نے آئینہ دیکھا جو تیرِ بلا کا ہدف سینہ دیکھا
سحر اُٹھ کے جب اس نے آئینہ دیکھا کبھی تن کو جھانکا کبھی سینہ دیکھا
پھنسا ایسے مکتب میں مجنوں کہ جس نے نہ ہرگز رخِ روزِ آدینہ[3] دیکھا
ہوائے فلک کی ہوس میں موئے ہم کسی دن نہ یہ قصر بے زینہ دیکھا
بجز خونِ دل خوانِ گردوں میں کیا تھا نہ واں شصت رنگانہ خاگینہ[4] دیکھا
صبا تیری دولت سے ہم نے چمن میں تماشائے گلہائے رنگینہ دیکھا
جو کچھ جام میں جم کے تھا وہ ہی عالم گدا نے بہ جامِ سفالینہ دیکھا
حسیں لوگ ظلم آفریں ہوتے آئے نہ معشوق کا دل میں بے کینہ دیکھا
نہ ہو ناظرِ چرخ و انجم، کسو نے نہ پھر سوئے تقویم پارینہ دیکھا
چلا مصحفی دب کے فنِ سخن میں
تجھے جس نے مشاق دیرینہ دیکھا

27

جا کے بیٹھوں کس کے در پر میں ترے در کے سوا دوسرا گھر ہی نہیں مجھ کو تو اس گھر کے سوا
جس جگہ مدفوں ہیں کشتے تیر مژگاں کے ترے سبزہ واں اُگتا نہ دیکھا نوک نشتر کے سوا

1۔ اصل: ان ہیں (ہر جگہ تبدیل کیا گیا) 2۔ باگ لینا = گھوڑے کو روکنا
3۔ آدینہ = جمعہ مراد چھٹی کا دن 4۔ خاگینہ = انڈوں سے بنا ایک کھانا

تشنۂ خوں جن دنوں اپنی ہوئی فصلِ بہار — ہم نے برگِ[1] یک شجر پایا نہ خنجر کے سوا

مجھ کو تھی شرمِ محبت مانعِ افشائے راز — نامہ[2] بر کرتا میں کس کو پھر کبوتر کے سوا

نامہ جب بھیجا میں اس کو آرزوئے قتل میں — کچھ نہ نامہ پر لکھا اللہ اکبر کے سوا

تیری بیتابی کے ہاتھوں سن تو اے دستِ جنوں — کون سا دامن بچا دامانِ محشر کے سوا

جن میں جوہر ہے شجاعت کا وہی ہیں بادشاہ — میں سرِ یک مرغ کو دیکھا نہ افسر کے سوا

آتشِ سوزانِ غم سے جب ہوا شعلہ علَم — درد کو کوئی نہ پہنچا دیدۂ تر کے سوا

کشتۂ شفافیِ دندانِ دلبر ہو جو شخص — قبر پر اس کی نہ چھڑکو آبِ گوہر کے سوا

خاک میں کس نے ملایا تجھ کو ایسا مصحفی
دل نہیں پہلو میں جو افسردہ اخگر کے سوا

28

شب جوشِ غم کہ سلسلہ جنبانِ نالہ تھا — لختِ جگر کے ہاتھ میں دامانِ نالہ تھا

نالاں پھرے تھا قیس جو صحرائے نجد میں — سب سطح اس زمین کا میدانِ نالہ تھا

آتے ہی فوج ہجر کے روباہ بن گیا — مجنوں کا دل کہ شیر نیستانِ نالہ تھا

مُہرِ سکوت وا نہ ہوئی لب سے ورنہ آہ — کیا کیا شبِ فراق میں سامانِ نالہ تھا

تضمین کیا میں مصرعۂ[3] برق سے اسے — دُودِ جگر[4] کہ مصرعِ دیوانِ نالہ تھا

آئی نہ بام پر وہ پری ورنہ تا سحر — دوشِ ہوا پہ تختِ سلیمانِ نالہ تھا

دیکھا ہے کس کے موئے پریشاں کو خواب میں — دل جو تمام رات پریشانِ نالہ تھا

مانندِ تارِ چنگ رہا شورش آفریں — تارِ نفس کہ دست و گریبانِ نالہ تھا

اس کم برشتہ دل کو نہ راحت ہوئی نصیب — مثلِ کبابِ خام جو مہمانِ نالہ تھا

1۔ ب : ہم نے اک برگِ شجر ل : ہم نے برگِ ہر شجر   2۔ ل،ب: نامہ بر پھر کس کو کرتا میں

3۔ ہر نسخے میں اسی طرح ۔مصرعۂ کو مستفعلن کے وزن پر پڑھنے سے مصرع درست ہو جاتا ہے

4۔ اصل : ودیگر، دور جگر

ظلم آفریں تھی کس کی نگہ یہ خبر نہیں　　صحرائے بازپرس میں طوفانِ نالہ تھا

تارے یہ آسمان پہ چمکے تھے مصحفی
تیرِ شہاب یا شررِ افشانِ نالہ تھا

29

پیشِ دستِ منعماں سائل بکف پیدا ہوا　　دودماں اپنے میں اک میں ناخلف پیدا ہوا

جستجو سے اس نے پایا مجھ کو بعد از شصت سال　　ناوکِ بیدادِ گردوں کا ہدف پیدا ہوا

دل میں جب گزرا تصور اس قدِ آزاد کا　　لوحِ پیشانی پہ اپنی اک الف پیدا ہوا

دُر بغوّاصی نہ ہاتھ آیا مرے اور بہرِ غیر　　گھونگھیوں[1] میں برلبِ ساحل صدف پیدا ہوا

مل کے دیکھا عاشق و معشوق نے جب آئینہ　　مہر و مہ کے واسطے بیت الشرف پیدا ہوا

میں اسے پایا سلیماں گرچہ آصف[2] تھا وزیر　ق　کم کوئی ایسا بہ شاہانِ سلف پیدا ہوا

ابرِ جود[3] اس کا اگر برسا بدشتِ آتشیں　　واں کا اک میداں نہ بے آب و علف[4] پیدا ہوا

لالۂ بالیدہ مت اس کو سمجھ اے مصحفی
خوں نے میرے جوش یہ مارا کہ کف پیدا ہوا

30

آنسو نہیں کہ ہر دم ہو چشمِ تر سے پیدا　　ہوتا ہے اشک خونیں خونِ جگر سے پیدا

فندق کے تیرے کشتے جس جا گڑے ہیں اس جا　　ہوتا ہے نخلِ خرما تخمِ شرر سے پیدا

آنسو سے لختِ دل کے ہے آب و تاب ساری[5]　　اس لعل کو کیا ہے حق نے گُہر سے پیدا

مربوط ہے یہ اس سے اس کا عجب نہیں گر　　سررشتۂ عدم ہو موئے کمر سے پیدا

زلفوں سے کس کی لگ کر آئی ہے آج کافر　　ہوتی ہے نکہتِ مو بادِ سحر سے پیدا

کیوں گھر کا چین چھوڑوں یعنی کہ آگہوں پر　　راحت مقام کی ہے رنجِ سفر سے پیدا

1۔ گھونگیوں = گھونگوں　2۔ مراد آصف الدولہ　3۔ ل: ابرِ جو　4۔ علف = چارہ
5۔ ل: پیارے

خورشید تیرے رخ پر جب چشم وا کرے ہے ہوتا ہے رعشہ اس کے نورِ نظر سے پیدا

کیا اعتماد گردوں اے مصحفی ہوے ہم
پنہاں دفینے کیا کیا اس فتنہ گر سے پیدا

31

ہے سیبِ ذقن بنا بنایا غنچہ ہے دہن بنا بنایا
زخموں سے ترے شہید کے ہے تابوتِ چمن بنا بنایا
ہے جامۂ چاک چاک عاشق بے چین و شکن بنا بنایا
ہو اس پہ جو شمعِ آہ روشن ہے ماہ لگن بنا بنایا
مر جائے جو اس میں حسرت دل سینہ ہے کفن بنا بنایا
ہر ایک کو سوجھتا ہے کوئی ق مضمونِ کہن بنا بنایا

یہ رتبۂ مصحفی ہے جس کو
آتا ہے سخن بنا بنایا

32

جب خوں بہائے عاشق جز برگ پاں نہ ٹھہرا وہ کشتۂ وفا کیا پھر رائگاں نہ ٹھہرا
نالے سے تیرے بلبل ہوتا ہے گل شگفتہ بولے ہی جا تو ظالم یک دم زباں نہ ٹھہرا
وامانده ره گیا میں نقشِ قدم کی صورت جب کارواں عدم کا اے ہمرہاں نہ ٹھہرا
تاجِ سر اپنا میں تو سمجھا تھا آسماں کو گردش سے میرے سر پر سو آسماں نہ ٹھہرا
لاشے کو میرے بانٹا آپس میں کرگسوں[1] نے جب لائقِ قبولِ طبعِ سگاں نہ ٹھہرا
ہر چند سنگ سے میں طینت میں سخت تر تھا صد شکر پر کسی کے دل پر گراں نہ ٹھہرا
آئینہ کس طرح سے پیش رخ اس کا لیتا جب اپنے حسن کا وہ خود پاسباں نہ ٹھہرا
بادِ مخالف آئی ایسی چمن میں جس سے اک نخلِ گل کے اوپر اک آشیاں نہ ٹھہرا

1۔ کرگس = گدھ

لاشے سے میرے کاوش جو کی سگ و ہُما نے — پہلو میں میرے آخر اک استخواں نہ ٹھہرا

جب دوسری غزل پر دل لایا مصحفی کو

پیکِ خیال اس کا تا لامکاں نہ ٹھہرا

33

صحرائے پُر خطر کو دار الاماں نہ ٹھہرا — آ نجد میں تو ناقہ اے سارباں نہ ٹھہرا

بیڑی کے حلقے سارے پھر چشمِ منتظر ہیں — پائے رمیدہ اس میں آہن گراں نہ ٹھہرا

یاقوت سفتہ[1] تم کو دکھلاتے ہم پر اپنا — یک قطرہ خوں بروئے نوک سناں نہ ٹھہرا

نالے کے زیرِ لب تھا برسوں زبسکہ جوں[2] نے — میرا دہن بھی آخر میرا دہاں نہ ٹھہرا

کیا جاؤں میں چمن میں کیونکہ تبسمِ گل — نازک مزاجیوں پر میری گراں نہ ٹھہرا

سنگ جفا سے تیرے تھے چور چور از بس — نذر ہُما کے قابل اک استخواں نہ ٹھہرا

پنجہ کیا تو تو نے مجھ ناتواں سے لیکن — آخر کو ہاتھ تیرا اے آسماں نہ ٹھہرا

بس غم بڑا تو یہ ہے میں ننگ دَیر و کعبہ — خُم شوئی کے بھی قابل، پیرِ مغاں نہ ٹھہرا

دریائے اشک اپنا افزوں ہوا تو اس میں — پیش از حباب رقصاں یہ آسماں نہ ٹھہرا

جنسِ سخن میں آخر اے مصحفی جلا دی

اس جنس کا جہاں میں جب قدرداں نہ ٹھہرا

34

کب[3] کم ہوا غرور ترے خاکسار کا — اوجِ ہوا پہ دیکھ تماشا غبار کا

جانے کا تن سے جان نے وعدہ کیا ہے لیک — ہے اس کو انتظار شبِ انتظار کا

جلد آ کہیں تو ماہ محرم کہ دیر سے — نقشا بگڑ رہا ہے ہمارے مزار کا

1۔ سفتہ = بیندھا ہوا، پرویا ہوا 2۔ ل: جوں نے زبس کہ برسوں

3۔ اشعار و غزلیات کی ترتیب اصل میں غلط تھی، ل اور ب سے درست کی گئی

یادِ زمانہ کہ میں طفلاں کی فوج میں دنبالہ گرد تھا کسی دامن سوار کا
اے مایۂ سرور نہ جا تو کہ بعدِ نشہ بے رنج دردِ سر نہیں رہتا خمار کا
پارہ سے کانپتے ہیں مری ہر مژہ پر اشک دریا بہے ہے سینے میں جو اضطرار کا
گردش میں تیری چشم کی اے جانِ روزگار نقشا ہے ٹھیک گردشِ لیل و نہار کا
سو جبر اٹھا رہے ہیں زمانے کے ہاتھ سے از بس کہ اختیار نہیں اختیار کا
اے وائے مارے ضبط کے دل ہی میں خوں ہوا مضموں[1] بندھا جو خواہش بوس و کنار کا
سب خوبیاں ہیں حسن سے کیاری میں فصلِ گل لازم ہے باغباں کو جمانا بہار کا
الماس[2] سودہ ہم نے بھرا اس میں مصحفی
اچھا کیا علاج دلِ داغ دار کا

35

باغ[3] تھا، اس میں آشیاں بھی تھا چند روز آب و دانہ یاں بھی تھا
صوتِ بلبل جگر میں سالتی[4] تھی خندۂ گل نمک فشاں بھی تھا
خوانِ قسمت کے حاشیے پہ جلیں کبھی یہ مشتِ استخواں بھی تھا
مرغِ بستاں کو سامنے میرے ق مصحفی زہرۂ فغاں بھی تھا؟
انجمن میں میاں بشارت کی
یعنی اک شخص شعر خواں بھی تھا

36

بے وفائی کا تری جی میں خیال آئے ہی گا گو میں دل صاف کروں گا، پہ ملال آئے ہی گا
قتل کر مجھ کو وہ رہنے کی نہیں بے آسیب تیغِ بیداد میں قاتل کی بھی بال آئے ہی گا

1۔ ل: مضمون بندھ کے 2۔ الماس سودہ = پسا ہوا ہیرا (زخم کے لیے زہر قاتل)
3۔ یہ اور اگلی غزل ل اور ب میں نہیں ہے 4۔ سالنا = سوراخ کرنا

آمدِ خط میں یہ کہتا ہے ترا رخ آخر
رنگ بے صبری عاشق کو زوال آئے ہی گا

اے دل اک لحظہ ٹھہر اور کہ وہ ماہِ تمام
بام پر بہرِ تماشائے ہلال آئے ہی گا

ہجر کی شب سے جو ہم لوگ بچیں گے جیتے
اس کا کچھ ڈر نہیں پھر روزِ وصال آئے ہی گا

سامنے تیرے ذرا اس کو کوئی آنے دے
لبِ تصویر پہ بھی حرفِ سوال آئے ہی گا

اشکِ خوں باغ میں ٹک میرے تئیں رونے دے
گلِ بے رنگ کا بھی رنگ بحال آئے ہی گا

سرِ مجنوں پہ نہیں ناقۂ لیلیٰ تو نہ ہو
نزع کے دم کوئی صحرا کا غزال آئے ہی گا

کیا ہوا کشتہ ترا گر نہیں رکھتا وارث
اس کو بھی گور و گڑھے میں کوئی ڈال آئے ہی گا

خونِ ناصاف کو، کیا ڈر ہے، نکل جانے دو
چشمۂ چشم سے پھر آبِ زلال آئے ہی گا

آنکھ جاوے گی جھپک اب کے تو ہے دل کو یقیں
خواب میں آج کوئی حور جمال آئے ہی گا

باغباں صحنِ گلستاں کو ذرا کر رکھ صاف
آخرش عشرتِ نوروز کا سال آئے ہی گا

گو نہیں طاقتِ پرواز پہ گلگشت کو یاں
پانو پانو تو کوئی بے پر و بال آئے ہی گا

مصحفی گو کہ میں ہوں روحِ مقدس لیکن
مجھ کو چھیڑے گا جو کوئی تو جلال آئے ہی گا

37

کفش کو دیکھ اس کی بولا میں جو دشمن زیرِ پا
آ گیا کافر کا بس اتنے میں دامن زیرِ پا

جب روپہلی کفش پہنی چاندنی میں شوخ نے
ہو دو ٹکڑے، اس کے آیا، ماہ روشن زیرِ پا

خاک چھانی نجد کی یاں تک کہ کانٹوں سے پڑے
نقشِ پائے ناقہ میں چھلنی کے[1] روزن زیرِ پا

دشتِ وحشت میں قدم فہمیدہ رکھ، کیا فائدہ
خار سے ہوں صد چراغ آہ روشن زیرِ پا

نازکی سے پشتِ پا پر ہے کبودی کا نشاں
آ گیا ہووے نہ اس کے برگِ سوسن زیرِ پا

کوئے قاتل میں قدم آہستہ رکھ اے بادِ صبح
کیا خبر تجھ کو ہے یاں کس کس کا مدفن زیرِ پا

1۔ "چلنے سے" بھی قرینِ قیاس ہے

دل گیا ٹوٹ اپنا سن اس بات کو اے محتسب کیا مرے شیشے ہی کی آئی تھی گردن زیرِ پا
اے بتِ زنگولہ[1] بنداں کی بھی ٹک فریاد سن وے جو دل کرتے ہیں ظالم تیرے شیون زیرِ پا
کشتگاں کے تیرے دیدے چشمِ قرباں کی طرح ہیں کھلے، پانو ان پہ رکھنا رکھ کے چلمن زیرِ پا
رزمیہ لکھا کیے ہم بادشاہوں کا مدام دائروں سے نت رہے خامے کے جوشن زیرِ پا
خارِ صحرائے جنوں اس سے بھی جاتے ہیں گزر مردِ سالک کے ہو گر قبقاب[2] آہن زیرِ پا
نعل و سُم سے کیوں زمیں روشن نہ ہو مانندِ چرخ بدر و ماہِ نو رکھے ہے اس کا توسن زیرِ پا
سرکشوں پر خاکساروں کی کرامت تب کھلے مشتِ خاک آئے جب ان کی بعد مردن زیرِ پا
مصحفی ٹھہرے ہے کوئی خامۂ رنگیں خرام
اور بھی روندے نہ تا گلہائے گلشن زیرِ پا

38

کس طرح روندے وہ گل پھولوں کے خرمن زیرِ پا جب رگِ گل ہووے اس کے حکم سوزن زیرِ پا
توڑ مت دل کو نہیں تو رنج ہووے گا صنم آگیا یہ شیشہ گر بعد از شکستن زیرِ پا
رحم اس نازک کمر پر یہ کیا خیاط نے جوں ہی آیا تیرا وہ دامانِ چیکن زیرِ پا
قطعِ راہِ عاشقی آساں نہیں اس دشت میں خنجر و شمشیر کا ہے سب کے آہن زیرِ پا
کیا ستم تو نے کیا، اے شاہدِ دورِ سپہر وصل کی شب بھی نہ آیا تیرے دامن زیرِ پا
کیا خبر غافل مجھے، ہوتا ہے اہلِ دید پر خفتگانِ خاک کا احوال روشن زیرِ پا
خاکساروں کا ترے ریگِ رواں کے دشت میں پھر بگڑ جاتا ہے ووں ہی بن کے مسکن زیرِ پا
پانو رکھ لے اپنے سر پر تو جو یہ آگاہ ہو آہ کیا کیا ماتمی کرتے ہیں شیون زیرِ پا
نقش چھلوں کے حنائے پا میں آگے تو نہ تھے کیا کسی رزمی کی آئی تیرے جوشن زیرِ پا
بس کہ ہے قیدِ حیا میں وہ نگارِ پردہ پوش پانو رکھتا ہے زمیں پر رکھ کے چلمن زیرِ پا

1۔ زنگولہ = گھنگھرو، زنگولہ بند = جس کے پیر میں گھنگھرو بندھے ہوں

2۔ قبقاب = کھڑاؤں

بدگمانی داغ کرتی ہے دلِ شیدا کو آہ　مور کے دیدے کا ہو گر اس کے روزن زیرِ پا

مصحفی لعلِ سخن پھر تازہ تو واں[1] سے نکال
تیشہ رکھتا ہے ترا معنی کی معدن زیرِ پا

39

ریگِ صحرا پر ہے رہتا اپنا نشیمن زیرِ پا　نقشِ پا کی طرح ہم ہیں بستر افگن زیرِ پا

جب زلیخا سے چھڑا کر ہاتھ بھاگا ماہِ مصر　آ گیا اس وقت کیوں اس کا نہ دامن زیرِ پا

دونوں ہاتھ اپنے ہیں دشتِ خارِ دارِ عشق میں　وقتِ خفتن زیرِ سر، ہنگامِ رفتن زیرِ پا

حلقِ بسمل جان کر عاشق کو[2] فرطِ ننگ سے　روندتا ہرگز نہیں گل اس کا توسن زیرِ پا

کیا کہوں اس شب جو کچھ حالت ہے بزمِ رقص میں　دل بملے ڈالے ہے اس کافر کی چتون زیرِ پا

ایک کانٹے نے نہ راہ راست بتلائی اسے　گرچہ موسیٰ کے رہی وادیِ ایمن زیرِ پا

ہم ذبیحِ نازِ خوباں ہیں، ہمیں جیتا نہ جان　کب سے یاں تیغِ تغافل کے ہے گردن زیرِ پا

عشق یاں حکم چراغاں سر سے کرتا ہے جسے　پہلے رکھ دیتے ہیں اس مجرم کے روغن زیرِ پا

نعل در آتش ہے مجنوں تو ہی راہ عشق میں　بھوں مڑی اپنی نہ ہو کر تفتہ آہن زیرِ پا

شوکتِ محمود پر بھی کر نظر اے سوزِ عشق　رکھ نہ یوں خاکسترِ تفسیدہ[3] گلخن زیرِ پا

کر دیا ہے ناتوانی نے اسے از بس حقیر　اب رگیں تلووں کی ہیں مجنوں کے سوزن زیرِ پا

دیدہ بادام کے روکش ہوئے ہیں آبلے　بس کہ کانٹوں سے پڑے ہیں ان میں روزن زیرِ پا

خفتگانِ خاک پر آتا نہیں صدمہ[4] ذرا　گرچہ روندے ہے ہوا کو اس کا توسن زیرِ پا

مصحفی چوتھی غزل پر کر تو اتمامِ سخن
پیش پائے خامہ ہوتا کہ نوشتن زیرِ پا

1۔ ل :اس سے نکال　2۔ ل : عاشق کا　3۔ تفسیدہ = تپتی ہوئی　4۔ل : صدمہ نہیں آتا ذرا

40

بر سرِ گورِ غریباں ہے وہ دامن زیرِ پا　　تا کسی تربت کا آجاوے نہ روزن زیرِ پا
سخت جانی دیکھیو اس پر نہیں مرتا کشف[1]　　ہے سپر سی چیل کے گو اس کی گردن زیرِ پا
آبِ حیواں پر قدم مارا اگر میں جوں نسیم　　ہو گیا وہ تیرہ بختی سے بکاین[2] زیرِ پا
رعد و برق اس کی صدائے پا ہے اور نعل و شرار　　بس کہ روندے ہے ہوا کو اس کا توسن زیرِ پا
کس طرح سیرِ حنائے پا سے ان کی دل ہو شاد　　بیٹھنے میں بھی رکھے جو اپنے دامن زیرِ پا
پشتِ پا پر گر گرا آنسو مرا تیزاب سا　　سنگ کو اس نے کیا صحرا کے روزن زیرِ پا

مصحفی تو انقلاب دہر سے غافل نہ ہو
دن کو سر پر شب کو ہے خورشید روشن زیرِ پا

41

ہاتھ سے سر رشتۂ کاکل رہا ہو جائے گا　　کون کہتا تھا کہ سودا کیا سے کیا ہو جائے گا
خاکساری میری آخر کھینچ لائے گی اسے　　نقشِ محب آخر یہ نقشِ بوریا ہو جائے گا
قتل کرنا سہل سمجھے ہیں مرا صاحب چہ خوش　　یہ نہیں سمجھے دو عالم خوں بہا ہو جائے گا
وہ سعادت مند ہیں ہم سر پہ اپنے وہم میں　　سایہ افگن بوم گر ہوگا ہُما ہو جائے گا
مان کہنا گل کے عارض کو نہ اتنا سرخ کر　　خونِ بلبل مفت میں بادِ صبا ہو جائے گا
تن سے سر لیوے ہی گی آخر کو شمشیرِ اجل　　دین[3] ہے یہ بھی کسی دن تو ادا ہو جائے گا
چشم کے گوشے سے کاجل گر ذرا باہر گیا　　نالۂ ناکامیِ عاشق رسا ہو جائے گا
ہے مناسب مجھ کو دینا سرمۂ دنبالہ دار　　نرگسِ بیمار کو تیری عصا ہو جائے گا
اس کو کنج عافیت سمجھا تھا مرغِ بستہ پر　　یہ نہ سمجھا تھا قفس دامِ بلا ہو جائے گا
آنکھ اس کی عکس پر اپنے اگر پڑنے لگے　　آئینہ خود مانعِ شرم و حیا ہو جائے گا

1۔ کشف = کچھوا　　2۔ بکاین = نیم کا ہم شکل ایک کڑوا پودا　　3۔ دین = واجب الادا

بس کہ شیریں ہے، یقیں ہے ہم کو یہ ہنگام فصد
خوں ہمارا نوکِ نشتر کی غذا ہو جائے گا

گر غبار ناتواں اپنا ہوا سے لگ چلا
خودتنورا[1] گرد کا اس کو عصا ہو جائے گا

چین پیشانی نہ دکھلاؤ، میں ہوں نازک مزاج
لب تک آتے شکر کا مضموں گلا[2] ہو جائے گا

مل کے تم مسی تبسم کو نہ رخصت لب کی دو
غنچۂ سوسن کا پیراہن قبا ہو جائے گا

مصحفی زنداں بھی ہم کو تنگ کرنے کا نہیں
معنیِ رنگیں سے باغِ دل کشا ہو جائے گا

42

وصل میں عاشق کا دم آخر نکل ہی جائے گا
جب گرے گا آگ میں پروانہ جل ہی جائے گا

شمع کے شعلے نہ اتنی سرکشی کر ورنہ پھر
اژدہا گل گیر کا تجھ کو نگل ہی جائے گا

سامنے قاتل کے رستم آ سکے مقدور کیا
جائے گا کوئی تو مشتاق اجل ہی جائے گا

کیوں تڑپتا ہے قفس میں ناحق اے مرغِ اسیر
ایک دن خنجر گلے پر تیرے چل ہی جائے گا

گو کہ بے پروا ہے قاتل لیک تربت پر مری
آئے گا جس دم کفِ افسوس مل ہی جائے گا

حق رکھے تیشے سلامت، غم نہ کھا اے کوہ کن
بے ستوں بھی سامنے سے تیرے ٹل ہی جائے گا

گر یہ ہے نظارہ بازی بلبلانِ باغ کی
رنگِ رخسارِ چمن آخر بدل ہی جائے گا

پاسداری[3] تو کرے گا کب تک اپنے جسم کی
خاک کا پُتلا ہے یہ ماٹی میں رَل ہی جائے گا

ہو سکے تجھ سے تو تُو فکر اور بھی کر مصحفی
اس زمیں میں تجھ سے شعر ایک آدھ ڈھل ہی جائے گا

43

لے کے خط اس کو میں قاصد آج کل ہی جائے گا
اس کے ہاتھوں کام یہ اپنا نکل ہی جائے گا

شمع کے شعلے کی ہے گر آتش افروزی یہی
دیکھیو تم پردۂ فانوس جل ہی جائے گا

1۔ تنورا = آتشیں بگولا 2۔ گلا = گلہ 3۔ پاسداری = نگہبانی

جامۂ عریاں تنی اب بچ رہا تو کب تلک　　ایک دن دستِ جنوں اس پر بھی چل ہی جائے گا
ضبط میں کیونکر کروں گا اپنا اس کے سامنے　　کچھ نہ کچھ منھ سے مرے آخر نکل ہی جائے گا
تیل کیوں ڈالو ہو بالوں میں چنبیلی کا میاں　　اس صفائی پر کسی کا دل پھسل ہی جائے گا
موم کے مانند ہے، آتش سے غیرت کی تری　　یہ ہیولیٰ شکلِ نوعی کا پگھل ہی جائے گا
مُوے سر میرے اگر ابیض ہوئے کیا اس کا غم　　رنگِ روے لالہ رُویاں بھی بدل ہی جائے گا
مان کہنا، اے خضر باتوں میں اس کی تو نہ آ　　تجھ کو وہ سفّاپسر اک روز چھل[1] ہی جائے گا
آتشِ دوزخ میں بھی جلنے کا ہم کو غم نہیں　　دل کسی شعلے شرارے سے بہل ہی جائے گا
کیا تامل کر رہے ہو اتنا کارِ سہل میں　　گر کرو گے قتل تم مجھ کو خلل ہی جائے گا
اس کے کوچے میں نہ لے جا اس کو تو اے چشمِ تر　　طفلِ اشک اپنا ہٹیلا[2] ہے، مچل ہی جائے گا
دیکھ کر خنجر زنی اس ابروے سفّاک کی　　سامنے رستم بھی آوے گا تو ٹل ہی جائے گا

اب تو ہے بیمار چشمِ سرمہ سا کا مصحفی
حق سنبھالے گا اگر اس کو سنبھل ہی جائے گا

44

مجھ کو عمل ہے یاد کلامِ رفیع کا　　میں وہ نہیں کہ نقش بھروں یا بدیع کا
سوچو تو ایک فرد کی بھی اس میں جا نہیں　　عرصہ ہے کتنا تنگ جہانِ وسیع کا
کب ہووے چشم و گوشِ بشر مدرکِ الٰہ　　کیا مدرکہ ہے حسنِ بصیر و سمیع کا
جوں نقشِ پا زمیں پہ جگہ ہے مری مدام　　خواہاں نہیں فلک سے مقامِ منیع[3] کا
برد الخریف نے تو کیا تھا مجھے ہلاک　　کرتا ہوں شکر آمدِ برد الربیع کا
نیکی کر اے فلاں کہ نتیجہ ہے اس کا نیک　　کیا آیہ تجھ کو یاد نہیں لا یضیع[4] کا

1۔ چھلنا = فریب دینا　2۔ ہٹیلا = ضدّی　3۔ منیع = محکم
4۔ لا یضیع = انّ اللہ لا یضیع اجر المحسنین (الآیہ) کی طرف اشارہ ہے

دوری مقامِ اصل سے ہے باعثِ ملال — اس بات پر گواہ ہے رونا رضیع[1] کا

جز مثنوی کے اس میں غزل کیا کہے کوئی — مقدور کیا ہے بحرِ خفیف و سریع کا

یوسف ہزار بر سرِ بازار بک گئے — لیکن رہا تو صرف ہے باع و بیع[2] کا

تقریب عفو داورِ محشر سے کر سکے — پڑتا نہیں ہواو یہ میرے شفیع کا

ہے جائے رشک اپنی کہ ان نحویوں کے بیچ — مفعول تعدیہ ہے وہ کافر جمیع کا

یہ ریختہ کچھ اور زباں میں ہے مصحفی
سچ ہے کہ یہ چلن نہیں مرزا رفیع کا

45

آرزو تھی میں اجل سے اتنی مہلت مانگتا — تو مری بالیں پہ ہوتا، تجھ سے رخصت مانگتا

جام بر کف تھی وہ پر ہمت مجھے رکھتی تھی باز — نزع میں کیونکر کفِ حورا سے شربت مانگتا

مجھ کو گر دیتا نہ مانی نقشِ تصویر کفک — اس کے میں پانو پہ سر رکھتا بہ منت مانگتا

سیر ہوتا جان سے جب تک فراقِ یار میں — میں وہ عاشق تھا کہ بس حسرت پہ حسرت مانگتا

عید کی شب کم رچی مہندی ہی ورنہ اس کا ہاتھ — پنجۂ خورشیدِ محشر سے بھی بیعت مانگتا

زندگی میری وفا کرتی اگر تا عمر خضر — میں دعائے وصل ہی شبہائے فرقت مانگتا

طالبِ ملکِ سلیماں کب مری ہمت تھی لیک — مور صحرائی سے تو ملکِ قناعت مانگتا

لب سے اپنے سیکڑوں فرسنگ ہے حرفِ سوال — پھر گدا تھا تجھ سے گر تیری محبت مانگتا

تھا تو دستِ شل میں پر سنتا اگر میری خدا — کھینچتا دامن ترا پھر اتنی طاقت مانگتا

چشمۂ خورشید سے تھی مجھ کو سرسبزی نصیب — تاک تھا میں کس لیے بارانِ رحمت مانگتا

تیرہ بختی گر مدد کرتی تو عاشق تیں دن — بھیک کوچے میں ترے شبہائے فرقت مانگتا

نقش ثانی پر مرے کرتا نظر گر مصحفی
خامۂ مانی بھی مجھ سے حسنِ صورت مانگتا

1۔ رضیع = طفلِ شیر خوار 2۔ بیع = بیچا گیا

46

تیرہ بختی میں اگر میں شان و شوکت مانگتا　　خالِ کنجِ لب سے اس کے کنجِ عزلت مانگتا

وصل میں جیتا اگر تا نشۂ خربِ عروج　　میں وہی ساقی سے ہر دم جامِ صحت مانگتا

دانۂ خردل[1] تھا میں کرتی تھی شبنم مجھ کو سبز　　خواہشِ طوفاں تھی گر بارانِ رحمت مانگتا

تشنہ کامی خشک کر دیتی اگر میرا گلا　　میں نہ جز آبِ دمِ شمشیر شربت مانگتا

صدقے ہوتا ہے بہ گردِ شعلۂ فانوس جاں　　مجھ سے پروانہ بھی گر ہوتا تو ہمت مانگتا

گر درِ حاتم تلک ہوتی رسائی میرے تئیں　　منھ پہ ملنے کو فقط خاکِ مذلت مانگتا

گوہرِ دل کے نہ عہدے سے نکلتے وہ کبھی　　بحر و کاں سے گر میں اس کی پوری قیمت مانگتا

وصل کی شب لب پہ میرے لگ گئی مہرِ سکوت　　تجھ سے ہر دم بوسہ کیا اے ماہ طلعت مانگتا

مہربانی سے تری آدم بنا ہے ورنہ آپ　　خاک کا پُتلا پری کی کیونکہ صورت مانگتا

کام یاں آخر ہوا ایک ہی نگہ میں، کس لیے　　نازِ پنہاں چشم کے گوشے سے رخصت مانگتا

صنع میں فائق تھا میں پر یہ تھی جائے ادب　　دستِ صانع سے میں کیونکر کلکِ صنعت مانگتا

رنج و صحت کی ترے بیمار کو پروا نہیں　　عیسیِ مریم سے کیا دار وے صحت مانگتا

وہ اگر دیتا تو روزِ عیدِ قرباں کے لیے　　مرغِ بسمل سے گلا کٹنے کی لذت مانگتا

لاشہ اپنا میں نے چیلوں کے حوالے کر دیا　　کون معمارِ فلک سے خشتِ تربت مانگتا

آتشِ دل آب کی طالب تھی میری بعدِ مرگ　　سنگِ کُن سے کیوں نہ حوضِ سنگِ تربت مانگتا

دور رکھا آپ سے کیوں مجھ کو، کیا سمجھے یہ لوگ　　وہ نہ تھا میں جو بتاں سے اجرِ خدمت مانگتا

مصحفی گر دیکھتا قوت وہ میری فکر میں
مجھ سے وام استاذ بھی زورِ طبیعت مانگتا

1۔ خردل = رائی

47

کیوں ہر اک عامل سے میں نقشِ محبت مانگتا
پائے شوق اس کا جو گھر سے در کی رخصت مانگتا

بے قراری تیرے صدقے یہ ستم مجھ پر نہ کر
پھر بھلا کس سے پھروں گا تاب و طاقت مانگتا

خیر گزری جو پھنسا پائے جنوں زنجیر میں
ورنہ کیا جانے یہ کیسا دشتِ وحشت مانگتا

گر لبِ زخم اپنا مل جاتا لبِ شمشیر سے
وقتِ خوں رفتن بھی بوسے کی حلاوت مانگتا

باغ سے پھرتا جو تُو تو چہرۂ نازک ترا
آفتابی[1] گل سے ہنگام تمازت مانگتا

تو نہ آیا باغ میں ورنہ صنم نرگس کا پھول
تیری آنکھوں کی حیا سے کچھ بہ منت مانگتا

باغباں سے، باغ ہی میں گر اجل آتی مری
تاک کے سائے کے نیچے جائے تربت مانگتا

کان کے موتی نے تیرے کی نہ اس پر التفات
دانۂ شبنم رہا اس سے لطافت مانگتا

برق و باراں جلوہ گر ہووے پہنچ کر نجد میں
یہ دعا اے کاش ناقہ وقتِ رجعت مانگتا

مصحفی دستِ جنوں میں کب گوارا تھا مجھے
خار سے پا پوش میرا پائے ہمت مانگتا

48

آستیں سے باہر آنے کی جو رخصت مانگتا
پنجہ اس کا پنجۂ مریم سے بیعت مانگتا

مجھ کو بے صبری نہ لے جاتی جو کوئے یار تک
صبر کرنے کی بھلا میں کس سے طاقت مانگتا

گر دکھاتا معجزہ میرا چراغِ پشتِ بام
بادِ صرصر از پئے دستِ حمایت مانگتا

عالمِ تجرید کے عالم پہ گر کرتا نظر
کیوں ہیولیٰ بیمِ تنہائی سے صورت مانگتا

چینِ پیشانی کی صورت گر نہ ہوتی اس کی تیغ
زخم پر زخم اور اذیت پر اذیت مانگتا

رزقِ عاشق ہو گیا پروانہ سال جسمِ نزار
وہ نہ تھا میں جو کفن از بہرِ میت مانگتا

گر شہیدِ کربلا کے ساتھ میں ہوتا وہاں
تیغ و خنجر سے جدا اپنی ضیافت مانگتا

1۔ آفتابی = چھتری

پرورش منظور تھی میری اسے ورنہ بھلا — کیا گیاہِ خشک سے بارانِ رحمت مانگتا
پھر بھی گر دنیا میں آتا میں تو تھا مقصد یہی — ہر بُنِ مو پر جدا اک چشمِ عبرت مانگتا

مصحفی سفّا کیِ پاے جنوں سے، تھا بجا
خوں بہا صد خار کا گردشتِ غربت مانگتا

49

کیوں نہ اس میں دل پھنسے ہر طفل آہو گیر کا — حلقۂ چشمِ پری بادام ہے زنجیر کا
شخص ظالم کو تواضع ہے اصالت کی دلیل — مرتبہ ہوتا ہے کُھنے سے فزوں شمشیر کا
کم بہا اصلاح سے پاتا ہے مجلس میں فروغ — ہردم احساں ہے زبانِ شمع پر گل گیر کا
اس کی پابوسی بہت مشکل ہے بعد از قتل بھی — جو نہ سر فتراک سے باندھے کبھی نخچیر کا
اس مصور سے بھلا تم منہ چھپا سکتے ہو جاں — کام لے کلکِ تصور سے بھی جو تحریر کا
جب کوئی لیتا ہے اس کے سامنے نامِ فراق — رنگ اُڑ جاتا ہے چہرے سے مری تصویر کا
اس کے باعث اینٹ کے گھر ہو گئے ماٹی ہزار — پر ہوا نقصاں نہ اس قصرِ کُہن تعمیر کا
جان کر بالِ کبوتر دیوے آتش میں جلا — ہاتھ اگر اس طفل کے آوے کبھو پر تیر کا
زعفرانی رنگ پر خوباں کے غش کرتا ہوں میں — رہنے والا گرچہ تبت کا ہوں، نے کشمیر کا

مصحفی طالع رسا ہوں جس کے وہ کھاوے اسے
میوۂ باغ شہادت ہے یہ پھل شمشیر کا

50

سرخیِ عارض میں اس کے ہے وہ عالم نور کا — دست رو کھاتا ہے شعلہ جس سے شمع طور کا
ان سیہ خزدوں[1] سے اکثر سرد مہری ہی ہوئی — یاں مزاجِ مشک میں دیکھا اثر کافور کا
پوری اجرت چاہیے تو صبح تک بیدار رہ — روز[2] ملتا ہے بوقتِ شام ہی مزدور کا

1۔ خزدوں: جردوں؟ 2۔ روز، روزینہ = مزدوری

وائے نادانی کہ تھی اس کی یہ عصمت میں طمع
دامنِ مریم کو میں سمجھا تھا دامن حور کا

کیری[1] پتلی دیکھ کر اس بت کی مانی نے کہا
کام تھا آنکھوں میں رکھنا دانۂ انگور کا

آئینہ خانہ ہے عالم اپنی صورت دیکھ لے
ایک ہی نقشا ہے یاں تو ناظر و منظور کا

دار نے اپنی سرانگشت اس میں جو رنگین کی
کیا حنائے عید قربانی تھا خوں منصور کا

کس کی چشمِ مست کا کشتہ نہاں ہے زیرِ خاک
تک رہا ہے کس کو دیدہ نرگسِ مخمور کا

اب تو میں دلّی سے لاکھوں کوس ہوں اے مصحفی
رہنے والا تھا کبھی اس کشورِ معمور کا

51

جذبِ معشوق اگر حب کے عمل میں ہوتا
شب کو کیوں دستِ تہی اپنی بغل میں ہوتا

میکدے کے جو گزر رنگ محل میں ہوتا
کوئی تونبا[2] تو فقیروں کی بغل میں ہوتا

شمع رو عام ہوئی جب سے تری سنگدلی
موم پیدا نہیں اس دن سے عسل میں ہوتا

زندہ ہوں اس کے تصور سے غضب تھا جو کبھی
یہ قلم بھی کفِ نقاشِ ازل میں ہوتا

اینڈنا اس کا خوش آیا نہ مجھے باغ میں کاش
تاک کا پیچ تری زلف کے بل میں ہوتا

ہجر کی شب اسی صورت سے بھلا کٹ جاتی
کاش معشوقِ خیالی ہی بغل میں ہوتا

تم نہ کرتے جو اسے قتل تو پھر حشر کے دن
دستِ مقتول گریبانِ اجل میں ہوتا

مصحفی مژدۂ نوروز نہ لاتی جو بہار
پرتو افگن نہ رخِ مہر حمل[3] میں ہوتا

52

مرض الموت سے کچھ کم نہیں آزار اپنا
دل میں دشمن کے بھی یارب نہ چبھے خار اپنا

رگ گل بچتی ہی رہیو تو مبادا تجھ پر
کام نشتر کا کرے سایۂ منقار اپنا

1۔ کیری = کرنجی 2۔ تونبا = خالی کدو، کشکول 3۔ حمل = برج آسمانی

شاکیِ بادِ صبا کیوں ہوں کہ گل کی مانند اپنے ناخن سے خراشیدہ ہے رخسار اپنا
کیوں نہ ہوں شاہ کہ ہے ہم سے فقیروں کے تئیں سایۂ بالِ ہُما سایۂ دیوار اپنا
رحم آتا ہے کلائی پہ مجھے آپ کی جان ہاتھ میں لیجے نہ دامن دمِ رفتار اپنا
یاں بھی ہر اک مژۂ نم میں ہیں سیلاب بھرے رکھ ادھر پانو نہ اے ابرِ گہر بار اپنا
آئینہ ہاتھ سے چھٹتا ہی نہیں اک ساعت مصرِ خوبی میں وہ یوسف ہے خریدار اپنا
صفحۂ دہر پہ پھر خار بدل کیوں نہ رہیں صورتِ نقطہ ہیں ہم، چرخ ہے پرکار اپنا
طائرِ دل کو اڑا کر نہ خبر لی تم نے چھوڑ دیتا ہے کوئی یوں بھی گرفتار اپنا

مصحفی سحر وہ کرتا ہوں غزل گوئی میں
ہاتھ کاٹے ہے مرے رشک سے ہم کار اپنا

53

نہ یاں کی شادی و غم کا بھروسا نہ عشرت کا، نہ ماتم کا بھروسا
محرم پر بھی ہو گر وعدۂ وصل کسے ماہِ محرّم کا بھروسا
چمن ہے بے وفا تو[1] باغباں کر نہ گل کا اور نہ شبنم کا بھروسا
ثباتِ زندگی ہے گرچہ دم پر ولے ہم کو نہیں دم کا بھروسا
رہا تا آخرِ قوتِ رہائی ہمیں اس زلفِ پُرخم کا بھروسا
بھریں کیونکر جراحت بے کسوں کی نہ پٹی اور نہ مرہم کا بھروسا
جراحت دل کا کیوں ہوتا نمک زار جو پڑتا مجھ کو مرہم کا بھروسا

یہ عالم مصحفی جب ٹھہرے حادث
کریں پھر خاک عالم کا بھروسا

1۔ ل: بے وفا تر

54

ترے بگڑتے ہی الفت کا گھر خراب ہوا
امید کو طرفِ یاس سے جواب ہوا

وہ خار کس کے دلِ خانماں خراب ہوا
کہ جس کو دیکھ کے زہرہ اجل کا آب ہوا

رہی زمیں کی مجھے حسرتِ ہم آغوشی
نہ بعدِ مرگ بھی میں اس سے کامیاب ہوا

حصول کیا ہو تہی قسمتوں کو منعم سے
حباب کا بھی سنا ہے قدح پُر آب ہوا

چھپا جو منھ تو گیا آفتاب جانبِ غرب
کھلی جبیں تو رخِ فتنہ بے نقاب ہوا

میں تیرے عہد میں دیکھا یہ شعبدہ ورنہ
طلوع خانۂ زیں سے کب آفتاب ہوا

یہ تختہ بندیِ تابوت کم نہ تھی مجھ کو
میں زندگی میں عبث موردِ عذاب ہوا

ہمیشہ آنکھ لڑاتا تھا تجھ سے آئینہ
بھلا ہوا تجھے اس سے بھی اجتناب ہوا

نہاتے وقت جو وہ زلفِ پیچدار کھلی
ہر ایک موج کو دریا میں اضطراب ہوا

بہا جو لاشہ مرا بحر میں غنا[1] کے سبب
وہاں بھی بالشِ سر کاسۂ حباب ہوا

وہ مصحفی مرے سوزِ جگر کی سمجھے قدر
برشتہ حسن سے جس کا کہ دل کباب ہوا

55

اہلِ غفلت سے ہو کیونکر عزم بیت اللہ کا
پائے خفتہ کو بہت مشکل ہے چلنا راہ کا

اس پہ کیا محمل نشیں ہے لیلیِ صاحب جمال
نقش پائے ناقہ جو روکش ہے قرصِ ماہ کا

تازہ رہتے ہیں مرے مژگاں طفیلِ چشمِ تر[2]
سوکھتا ہرگز نہیں جس طرح سبزہ چاہ کا

وصل کی شب میں سیاہی دے نصیبوں کی ملا
طول دینا کام ہے ایسی شبِ کوتاہ کا

عمر دو روزہ کی فرصت ہے وبالِ زندگی
دام ہے کتنا گراں اس رشتۂ کوتاہ کا

میں اگر خامش رہوں تو چرخ نیلی گر پڑے
نالہ میرا ہے ستوں اس سرئ خرگاہ[3] کا

1۔ غنا = بے نیازی   2۔ ل : اشک چشم   3۔ خرگاہ = بڑا خیمہ

شال و چادر کا سمجھ لے فرق ورنہ بعد مرگ ایک ہی تابوت ہوتا ہے گدا و شاہ کا

مصحفی گرمی طبیعت کی جہاں جاذب ہوئی
کہربا کو پھر ہے کیا مشکل اٹھانا کاہ کا

56

چکھے جو ترے نشترِ مژگاں کا لوہا کھاوے نہ کبھی خنجر و پیکان کا لوہا
اے دستِ جنوں اپنی تو دکھلائیو قوت ہر چند ہے محکم درِ زندان کا لوہا
وہ صیدِ زبوں ہوں میں کبھی جس کے گلے پر ہرگز نہ چلے خنجرِ برّان کا لوہا
شریاں میں مری ٹوٹ رہا نشترِ فصّاد دشمن نہ کسی کی ہو رگِ جان کا لوہا
تاثیر تھی بچھوے[1] میں ترے زہرِ اجل کی تھا اس کا چٹایا ہوا کس سان[2] کا لوہا
پارس سے نہیں کم ہدفِ سینۂ عاشق کیونکر نہ طلا ہو ترے پیکان کا لوہا
ہوتا ہے گرفتارِ محبت کو بہر گام زنجیر فقط سایۂ دامان کا لوہا
تب جانوں جو عاشق کا کبھی پوششِ تن ہو اس کی زرۂ زلفِ پریشان کا لوہا
کاش آئے کہیں مصرف زنجیر جنوں میں اس شوخ کے نعلِ سُمِ یکران[3] کا لوہا
وہ میل سے کیوں گزری تری تیغ میں قاتل؟ تھا گر نہ ملا برقِ درخشان کا لوہا

اے مصحفی تو ہاتھ میں گپتی تو رکھا کر
ہوتا ہے نگہبان ہر انسان کا لوہا

57

دے کے دشنام مجھے پہلے تو خنداں ہونا پیچھے پھر سر کو جھکا جی میں پشیماں ہونا
نہ روا رکھیو مسافر کا پریشاں ہونا تو ہی صبحِ وطن اے شامِ غریباں ہونا
پاسبانی نہ خس و خار سے شعلے کی ہوئی حسن بے پردہ کا مشکل ہے نگہباں ہونا

1۔ بچھوا = پیر کے انگوٹھے، انگلیوں کا ایک زیور 2۔ سان = دھار رکھنے کا پتھر 3۔ یکران = اصیل گھوڑا

خوں کے قطرے مری پلکوں کے نہ ہوں کیونکر زیب — خوشنما ہے لبِ کشتی پہ چراغاں ہونا
دست فرسود نگہ تا وہ نہ ہو ہر یک کا — تو حیا پردۂ رخسارۂ جاناں ہونا
طائر سدرہ پھنسیں کیوں نہ پھر اس دام کے بیچ — اک بلا ہے ترے بالوں کا پریشاں ہونا
اپنی جوں ریگ رواں عمر بھٹکتے ہی گئی — تھا مقدر جو رہِ عشق میں حیران ہونا
تیری خفت ہمیں منظور نہیں، مان کہا — تیرہ بختی نہ دو چار شب ہجراں ہونا
سر میں مت رکھ تو بگولے کی طرح بادِ غرور — آخرِ کار تو ہے خاک سے یکساں ہونا
نظر آتا نہیں مطلق شب ہجراں میں شہاب — تُو تو اے آہ بھلا شمعِ شبستاں ہونا
شورِ شیریں دہناں کا یہ بنا ظرف آخر — تھا لکھا زخم کے طالع میں نمک داں ہونا
نا مسلماں جو ترے حسن کو دیکھے ہے کبھی — جی میں کہتا ہے مجھے اس پہ مسلماں ہونا
ہم کو وہ آتشِ خاموش جلاتی ہی نہیں — ہے خس و خار کی قسمت میں گلستاں ہونا
کبک نے دعویِ رفتار کیا تھا ہم سے — تُو بھی کل باغ میں اے سروِ خراماں ہونا
موجبِ تفرقہ ہے عالمِ علوی کے لیے — شبِ مہتاب میں رخ کا ترے افشاں ہونا
ہیں[1] گرفتارِ قفس منتظرِ مژدۂ گل — کبھی بادِ سحر ایدھر بھی خراماں ہونا
جرسِ ناقہ جو کوتہ نفسی کرتا ہے — تُو تو اے نالہ ہم آواز حدی خواں ہونا
خواہشِ چاک جو ہے گل کی طرح دامن گیر — جامہ چاہے ہے مرا صرفِ گریباں ہونا

مصحفی علم معانی تو ملا میرے تئیں
گو میسر نہ ہوا حافظِ قرآں ہونا

58

ہے دلیلِ دور باز آمد یہ صبح و شام کا — کس طرح میں معتقد ہوں گردشِ ایام کا
مجھ کو میخانہ پری خانے سے ہرگز کم نہیں — حلقۂ چشمِ پری حلقہ ہے ہر اک جام کا
آفریں دست جنوں کعبے میں ہیں یہ شورشیں — تار بھی باقی نہ رکھا جامۂ احرام کا

1۔ ل : میں

گر کرے صیاد میری سخت گیری کا خیال
دانۂ زنجیر کو دانہ بنا دے دام کا

کاملِ فن عشق میں ہونا ہے مشکل غیرِ رنج
کام ہے اک پختہ کرنا آرزوے خام کا

کچھ نہ کہنے پائے ہم قاصد سے دل کی وقت نزع
لب تلک آنا مقدر ہی نہ تھا پیغام کا

بے جگر کاوی کبھی حاصل نہ ہو نام آوری
رتبہ جاں کندن سے ملتا ہے نگیں کو نام کا

ایسے کس مجرم کا یارب قتل اسے منظور ہے
چرخ پر رہتا ہے تیغا روز و شب بہرام[1] کا

غم سے وہ[2] چھوٹے گرفتاری کے جو پراں ہوئے
طائرِ تصویر کو اندیشہ کب ہے دام کا

زیست تک قصر و محل کی فکر میں حیراں رہے
ہم نے زیرِ خاک اک پایا محل آرام کا

جانبِ افلاک ہے رنگِ پریدہ کا خیال
یہ کبوتر قصد رکھتا ہے فضاے بام کا

مصحفی کیا صنعتِ صانع میں کیجے گفتگو
یاں نہیں کچھ تذکرہ آغاز اور انجام کا

59

موجِ فنا سے کھیل ہی اپنا بگڑ گیا
میں جوں حباب آنکھ کے کھلتے نبڑ[3] گیا

مجنوں کے اشتیاق نے کھینچی مگر مہار
جو قافلے سے ناقۂ لیلیٰ بچھڑ گیا

ہرگز کیا نہ بادِ خزاں کا بھی انتظار
وہ تازہ گل تھا میں کہ کھلا اور جھڑ گیا

رنگیں جراحتی کا دکھاویں گے گل کو لطف
گر اس چمن کا خار کوئی دل میں گڑ گیا

زیں پیش تھا نہ رنگِ حنا اتنا چہچہا[4]
تربت پہ کس شہید کی پانو اس کا پڑ گیا

آ کر خیال بُعد کا لیلیٰ کے خواب میں
مجنوں کی بیڑیوں میں سراپا جکڑ گیا

تب باغباں نے لی خبرِ باغ یا نصیب
جب بیخ و بُن سے نخلِ تمنا اکھڑ گیا

چونکے نہ روزِ حشر بھی ہم خفتۂ ازل
سر کے تلے دھرے ہی دھرے ہاتھ اکڑ گیا

یاد آیا مصحفی مجھے بوسہ نگار کا
جب شیشے کا دہن لبِ ساغر سے لڑ گیا

1۔ بہرام = مریخ 2۔ ل : چھوٹے وہ 3۔ نبڑنا = ختم ہونا 4۔ چہچہا = گہرا سرخ

60

صبحِ شبِ ہجراں کو خدا جانے ہوا کیا
خورشید درخشاں کو خدا جانے ہوا کیا

تالو سے زباں لگتی نہیں اس کی جو اک دم
ہے ہے دلِ نالاں کو خدا جانے ہوا کیا

ٹلتا نہیں آگے سے ترے صورتِ دیوار
آئینۂ حیراں کو خدا جانے ہوا کیا

پہنچی[1] نہ خبر ان کی مجھے ملکِ عدم سے
واں جاتے ہی یاراں کو خدا جانے ہوا کیا

آواز مری سنتے ہی کچھ رہ گئے خاموش
مرغانِ گلستاں کو خدا جانے ہوا کیا

اک آہوے وحشی نظر آتا نہیں اس میں
اس سال بیاباں کو خدا جانے ہوا کیا

کیا خواب میں پائی ہے ہم آغوشی کی لذت
کھلتے نہیں، مژگاں کو خدا جانے ہوا کیا

رکتی نہیں جب اس سے ہنسی تب وہ کہے ہے
میرے لبِ خنداں کو خدا جانے ہوا کیا

دل معرکۂ عشق سے بھاگے ہے جو کوسوں
اس رستمِ دستاں کو خدا جانے ہوا کیا

جوں جوں میں چلوں بھاگے[2] ہے وہ دور ہی مجھ سے
کعبے کے مغیلاں کو خدا جانے ہوا کیا

ناقہ جو بھٹکتا تھا تو کہتی تھی یہ لیلیٰ
آوازِ حدی خواں کو خدا جانے ہوا کیا

گہہ کان سے الجھے ہے، گہے گال[3] سے اس کے
اس زلفِ پریشاں کو خدا جانے ہوا کیا

سکتے میں مجھے دیکھ کے کہتا ہے مسیحا
اس صورتِ بیجاں کو خدا جانے ہوا کیا

یاں ہم ہیں گرفتارِ قفس با دلِ صد چاک
واں گل کے گریباں کو خدا جانے ہوا کیا

اٹھتی ہی نہیں نعش مری اس کی گلی سے
مجھ کشتۂ حرماں کو خدا جانے ہوا کیا

اب مصحفیِ خستہ نہیں سانس بھی لیتا
اس صورتِ بے جاں کو خدا جانے ہوا کیا

61

گریۂ مجنوں سے جو طغیاں ہوا ہے آب کا
گرد بادِ دشت میں عالم ہے اک[4] گرداب کا

1۔ ل : پہنچی خبر نہ اپنی مجھے 2۔ ل : بھاگتی ہے دور 3۔ ل : بال 4۔ ل : اب

تھام رکھے کیا دلِ بے تاب کو رنگِ حنا　　سخت مشکل ہے ٹھہرنا آگ پر سیماب کا
سرِ فلک پر جو نہ کھینچے ہو نہ وہ مسجودِ خلق　　گو ہوا قوسِ قزح کے بیچ خم محراب کا
کیجیے ایسے بدن کی کیا صباحت کا بیاں　　جس کے سائے کو زمیں پر حکم ہو مہتاب کا
ارتفاعِ[1] آفتابِ عمر پر بھی کر نظر　　ہو رہا ہے محو کیا منقوش اصطرلاب[2] کا
دنیا کا بعد از مرگ یہ انجام ہے　　عیش جوں نامعتبر ہووے وصالِ خواب کا
خوں میں جو تڑپیں ہیں لاکھوں آرزوے کشتہ یاں　　کیا دلِ عاشق بھی صحنِ خانہ ہے قصاب کا
سرخیِ پاں نے دیا ہے بسکہ اس کو اور حسن　　رنگ ہوتا ہے خجل لب سے ترے عناب کا
جستجو میں معنیِ نو کی سبھی حیران ہیں　　ہاتھ آنا سہل ہے کیا گوہرِ نایاب کا
گریہ کر لیتا ہے اپنی تیرہ بختی کا علاج　　بحر خوں زائل کرے رنگِ سیہ سیلاب کا
اس کی بشاشی کی مجھ کو کھینچ[3] دے مانی شبیہ　　جس سے نکلے یک قلم نقشا گلِ شاداب کا
اشک کا زنجیرہ ہے جو میرے عارض پر رواں　　اس میں میں پاتا ہوں عالم کوزۂ دولاب[4] کا
منعموں کی جس گھڑی خاکِ لحد پر جا ہوئی　　خواب یاد آوے گا ان کو بسترِ سنجاب کا
چشمِ نرگس نے مزے لوٹے تمھارے حسن کے　　ہاے رے اُٹھنا ہوا سے باغ میں جلباب[5] کا
اہلِ کاوش سے نہیں نازک مزاجوں کو نجات　　خستہ ہے تارِ رگِ گل خار کی مضراب کا
تشنہ کامِ عشق کی ہمت پہ کہیے آفریں　　مر گیا لیکن نہ منّت کش ہوا میزاب[6] کا
آ گیا ہے قبض سے جو اس کے معدے میں فساد　　کیا مزاجِ دہر بھی محتاج ہے جلاّب کا
خنجرِ مژگاں کی اس کے آبداری دیکھ کر　　آب ہو جاتا ہے زہرہ رستم و سہراب کا

ہے دلیلِ حسرتِ اہلِ تنعّم مصحفی
چھوڑ جانا عالمِ اسباب میں اسباب کا

1۔ ارتفاع = بلندی　　2۔ اصطرلاب = دوربین　　3۔ ل : کھینچ دے مجھ کو
4۔ کوزۂ دولاب = رہٹ کی بالٹی　　5۔ جلباب = چادر　　6۔ میزاب = پرنالہ

62

ساتھ غیروں کے ہو تم حرف و حکایات میں کیا　تم کو ملتا ہے مزہ غیر ہی کی بات میں کیا

سرخیِ رنگِ بدن اتنی تو زیں پیش نہ تھی　آبِ یاقوت ملایا ہے تری گات[1] میں کیا

کل تو تم بچ گئے مجھ سے مرے پاس آئے پر　نہیں لگنے کی جھڑی پھر کوئی برسات میں کیا

اور نامرد کیا نشۂ ہستی نے ہمیں　ڈر سوا گزرے ہے نیکی کے خیالات میں کیا

کون جانے ہے وہ اک دم[2] میں سبھوں کے آگے　باتیں ہو جاتی ہیں نظروں کی اشارات میں کیا

اے کہ رونے پہ مرے تجھ کو ہنسی آتی ہے　نہیں آیا تو کبھی عشق کی آفات میں کیا

مستیِ عشق ہو جب جام و سبو کی دشمن　مجھ سے دیوانے کریں جا کے خرابات میں کیا

دل سے جب دل تئیں مالوف دو ہمدم کا نہ ہو　سچ ہے جی لطف ہے ظاہر کی ملاقات میں کیا

عشق لیلیٰ کا فزوں ہو، یہ کہے تھا مجنوں　اس سوا مانگوں دعا اور مناجات میں کیا

عرق آتا نہیں عاشق کو ترے تب میں بھی　بھر دیا عشق نے قیر[3] اس کے مسامات میں کیا

میرے نسخے میں خیارین و خسک لکھ تو طبیب　بہہ نہ جاوے گا نمِ سینہ مدارات میں کیا

خو پڑی ہے تجھے گالی کی لبِ شیریں سے　بوسہ دیتے نہیں درویش کو خیرات میں کیا

یہ وہ دریا ہے کہ جس میں نہیں بَلّی[4] لگتی　صاحبِ فکر کرے خوض تری ذات میں کیا

مصحفی ہووے جو شہزادہ کسی کا معشوق
مردِ درویش کرے ایسے مقامات میں کیا

63

پردہ جب رخ پہ ترے اے بتِ مغرور نہ تھا　آئینہ محوِ تماشاے رخِ حور نہ تھا

کیا کروں دل تو بھر آیا تھا تجھے دیکھ و لے　نالہ کرنے کا شبِ وصل میں دستور نہ تھا

1۔ گات = بدن　2۔ اصل اور دیگر نسخوں میں "دل" ہے (صریحاً غلط)　3۔ قیر = رال، گوند
4۔ بلّی = چپّو

شب کہ میں یادِ خطِ سبز میں روتا تھا تری[1] دانۂ اشک بجز دانۂ انگور نہ تھا
نمک سودہ مرے زخم میں بھرتا تھا مسیح کیا کیا اس کی دوا مرہمِ کافور نہ تھا
دل میں یک چند جو رہتا تری صورت کا خیال اس سے بہتر تو کوئی کشورِ معمور نہ تھا
عذرِ تقصیر پذیرا نہ ہوا واں ورنہ سر مرا یار کے قدموں سے تو کچھ دور نہ تھا
کون یاں شکوۂ یارانِ زمانی لایا اپنی مجلس میں تو ان باتوں کا مذکور نہ تھا
ساغرِ زہر میں پی کر کے[2] رہا آخر سو اس سوا اور علاجِ دلِ رنجور نہ تھا

جان دی مصحفیِ خستہ نے آخر تجھ پر
دردمندوں میں ترے گرچہ وہ مشہور نہ تھا

64

کنگرۂ عرش سے شب نالہ مرا دور نہ تھا پھر کہوں کیوں کہ مجھے نالے کا مقدور نہ تھا
پاسِ عصمت نے ترے تجھ سے مجھے دور رکھا ورنہ طبع بشری کا تو میں مجبور نہ تھا
لبِ[3] بیمار کے گھاٹ ان کو اتارا لا کر قابلِ بوسۂ مستاں جو لبِ حور نہ تھا
داغِ چیچک نے ترے طرفہ حلاوت بخشی شہد خوبی سے بھرا خانۂ زنبور نہ تھا
مجھ سے کچھ اپنے شہیدوں کی حقیقت مت پوچھ آہ کس کُشتے کا زخموں سے بدن چور نہ تھا
حیرتِ حسن نے کس کی یہ کیا اس کو تباہ آئینہ ماہ کا اتنا بھی تو بے نور نہ تھا

لاکھ پردے تھے اگر شانِ تقدس پہ تو کیا
مصحفی حسن کبھی پردے میں مستور نہ تھا

65

در پہ پھسل کے اس کے جو میں ناتواں گرا آئی صدا یہ غیب سے ظالم کہاں گرا
کلکِ قضا سے نقطۂ سہو القلم کی طرح میں تیرہ بخت پھر وونہی اٹھا جہاں گرا

1۔ ل : مری 2۔ ل : پی کرتو رہا 3۔ یہ شعر ل سے اضافہ

موجِ ہوا بھی اس کے لیے برق ہوگئی | شاخِ بلند سے جو مرا آشیاں گرا
تیرے ہُمائے تیر کے کھانے کے واسطے | اوج ہوا سے ہو کے ہُما استخواں گرا
نرگس سوا وہاں سے نہ لالہ اُگا کبھی | خونِ شہیدِ تیغِ تغافل جہاں گرا
لیلیٰ کے دل کو توڑ کے نکلی صدائے آہ | قیس شکستہ پا جو پسِ کارواں گرا
فاقوں کے مارے چہرہ مرا زرد ہو گیا | صفرا مرے جگر پہ زبس ہر زماں گرا
دیکھے جو میرے لختِ جگر کی بہار کو | دامن سے پھول دیوے وہیں باغباں گرا
بے نور ہے بہت شبِ ہجراں میں شمع آہ | دیوے کوئی ستارہ ہی کاش آسماں گرا
دعویٰ کروں گا تجھ سے سبو کا میں دیکھیو | ساغر جو میرے ہاتھ سے پیر مغاں گرا

دیکھے جو مصحفی نے ترے تمتاتے گال
بستر پہ تپ کے جا کے وہ آتش زباں گرا

66

زخمِ تیغِ عشق کا مجھ پر یہ احساں رہ گیا | آہ بھر کر جو میں اس کوچے میں یاراں رہ گیا
جامۂ خاکسترِ گلخن میں کاٹی میں نے عمر | یہ گلا وہ ہے جو محرومِ گریباں رہ گیا
میرے سینے پر الف کھینچا یہ تیغِ یار نے | یا نشانِ جادۂ چاکِ گریباں رہ گیا
دیکھ کر شوخی تری رفتار کی اے سروِ ناز | چلتے چلتے باغ میں سروِ خراماں رہ گیا
مجھ کو جب چشمِ صنم نے کافری تعلیم کی | حق پرستوں پھر کہاں سے میں مسلماں رہ گیا
سلطنت کا عالمِ فانی کی کیا ہے اعتبار | تاجِ اسکندر نہ یاں تختِ سلیماں رہ گیا
اس کے اوپر آ رہی گویا زمیں بلّور کی | خاک میں گر کر بھی میرا لاشہ عریاں رہ گیا
حرزِ جانِ ناتواں سمجھا جو[1] تیرِ یار کو | بازوے دل پر مرے تعویذِ پیکاں رہ گیا
جب مرقع میں نظر اس گل کی صورت پر پڑی | دست حیرت حور کا زیرِ زنخداں رہ گیا

1۔ ل : میں تیرِ یار کو

دور سے آتے جو دیکھا مجھ کو کوے یار میں — زیرِ لب آہستہ کچھ کہہ کہہ کے درباں رہ گیا
کیا گرفتاروں کی جمعیت میں آیا تفرقہ — کھل کے ان بالوں کا جوڑا جو پریشاں رہ گیا
اپنے طالع ہی برے تھے کیا مدرس کا گلہ — علمِ دانش پڑھ کے میں کمبخت ناداں رہ گیا
شب دیا اس شوخ نے مجلس سے جو[1] مجھ کو نکال — اس کے دروازے ہی پر میں خانہ ویراں رہ گیا
میں گیا جب وادیِ مجنوں سے بھی آگے نکل — مجھ سے کوسوں[2] پیچھے وحشت کا بیاباں رہ گیا
آئے دن وحشت کے ویرانے ہوئے آباد پھر — کون سا یاں ساکنِ زنجیر و زنداں[3] رہ گیا
پھر وہ صحراے مغیلاں پیش آیا ہے مرے — عامری[4] کا جس میں پرزے ہو وہ داماں رہ گیا
نازکی موے میاں کی اس کے تب ظاہر ہوئی — چشمِ دقت بیں کی جب نظروں سے پنہاں رہ گیا

مجھ کو جو پایا سبک میرے گلے میں مصحفی
طوقِ آہن ہو کے ہر تارِ گریباں رہ گیا

67

جوں جوں سیا اس کو دو چنداں پھٹا — تھا نہ کبھی اپنا گریباں پھٹا
جب مِسی آلودہ لب آئے بحرف — غنچۂ سوسن کا گریباں پھٹا
لینے کو آغوش میں میرے تئیں — ہر شجرِ وادیِ حرماں پھٹا
ہوگئیں[5] تقصیرِ گزشتہ معاف — رات میرا دفترِ عصیاں پھٹا
لایا گریبان پر آفت یہ ہاتھ — کھینچنے میں اس کا جو داماں پھٹا
دیکھنے کو دیکھ میرے بولے وہ — اتنا نہ ہو دیدۂ انساں پھٹا
کیا تجھے آتے ہوئے دیکھا کہیں — راہ سے کیوں کبک خراماں پھٹا
دستِ زلیخا ہے سزاے ادب — جس سے قمیصِ مہِ کنعاں پھٹا
نفیِ فضیلت نہ ہو افلاس سے — گو کہ ہوا جامۂ قرآں پھٹا

1۔ ل : جو اپنی نکال 2۔ ل : پیچھے کوسوں 3۔ ل : زنجیرِ زنداں 4۔ عامری = آبادی؟
5۔ ل : ہوگئیں

مجھ سے دلِ یار ہے اے مصحفی
جیسے دلِ گبر و مسلماں پھٹا

68

آ کے اک شب جو کبھی گھر میں مرے یار رہا
مدعی رشک کے مارے پسِ دیوار رہا

کافرِ عشق وہ ہوں میں کہ مری گردن پر
خطِ شمشیرِ بُتاں رشتۂ زنّار رہا

صدمہ بلبل کے کلیجے پہ مگر پہنچا تھا
ہر دم اک خون کا قطرہ سرِ منقار رہا

سر جو زانو پہ رکھا میں نے شبِ ہجراں میں
دوشِ شمشیر تغافل تو سبک بار رہا

کون سا عضو کہ مجنوں کا نہیں چُور م چُور
سنگِ طفلاں سے زبس اس کو سروکار رہا

کوئی فرہاد کی تربت پہ مگر پیٹے تھا
رات شیون طرفِ دامنِ کہسار رہا

نہ گئی پیش جب اس زلف سے ہرگز اس کی
مار بھی دیکھ کے اس کے تئیں من مار رہا

نہ تھکا نسخہ نویسی سے کبھی ہاتھ ان کا
گو کہ محتاجِ طبیباں ہی یہ بیمار رہا

میں بھی سرگشتہ بیابانِ جنوں کا وہ ہوں
جس کے پانو کو نیا آبلہ درکار رہا

جنسِ خوبی رہی جب تک محلِ ارزش میں
نقدِ جاں سے نہ تہی دستِ خریدار رہا

مصحفی ایک غزل اور بھی لکھ جا کہ مدام
شعر تیرا سببِ گرمیِ بازار رہا

69

مجھ کو یک شب جو خیالِ کمرِ یار رہا
صبح تک دامِ رگِ گل میں گرفتار رہا

اٹھنے دی اس نے نہ دیوار کبھی گھر کی مرے
ضعفِ طالع سے مرا خانہ ہوا دار رہا

نہ ہوا نکہتِ گل سے مرے سودے کا علاج
زیرِ دیوارِ چمن گو کہ یہ بیمار رہا

تیرہ روزی کا بھلا ہووے کہ جس کے باعث
چاندنی میں بھی میں ممنونِ شبِ تار رہا

خواب میں بھی نہ شبِ وصل تو آئی اور میں
سالہا منتظرِ دولتِ بیدار رہا

دردمندوں نے ترے روے چمن کب دیکھا داغ سینے کا انھیں لالۂ دستار رہا
گل کی پتی نہ جھڑی بادِ صبا سے جب تک زیرِ گلبن قفسِ مرغِ گرفتار رہا
خاک سرگشتہ بگولے کی طرح اپنی پھری تو بھی گردش سے نہ یہ چرخ[1] جفاکار رہا
کوئی تقصیر نہ ثابت ہوئی اور تا دمِ مرگ زیرِ شمشیر تغافل یہ گنہگار رہا
اتنا لیلیٰ کو نہ آیا کبھی مجنوں کا خیال ضعف سے قافلے کے پیچھے یہ بیمار رہا
حشر کے دن سبھی بخشے گئے عاشق اے واے ایک محرومِ شفاعت یہ گنہگار رہا
مصحفی گرچہ ہم اور یار رہے اک گھر میں
پردۂ شرم بہ از پردۂ دیوار رہا

70

مارِ گیسو کے تئیں تو نے مگر چھوڑ دیا تیرے ہمسایے نے جو خوف سے گھر چھوڑ دیا
لے گیا نامہ کبوتر تو اسے ظالم نے کر کے بسمل بہ سرِ راہ گزر چھوڑ دیا
آستانے پر اسی کے مجھے کاش آوے موت نہ کہے تا یہ کوئی یار کا در[2] چھوڑ دیا
مجھ کو حیرت ہے کہ نقاش سے کیا کھنچ نہ سکی تیری تصویر میں جو موے کمر چھوڑ دیا
اس قدر دشمنِ پرواز مرا تھا صیاد باغ میں میرے تئیں توڑ کے پر چھوڑ دیا
نوکِ مژگاں نے ہنر اپنا دکھایا شب و روز کون سا اشک کا بن بیندھے گہر چھوڑ دیا
شام کی آہ سے کیا شکوہ، گلہ ہے تو ہے یہ نالۂ نیم شبی نے بھی اثر چھوڑ دیا
طائرِ روح نے کیا اس میں اذیت پائی قفسِ تن کو جو کرتے ہی سفر چھوڑ دیا
نہیں آتی اب اسیرانِ قفس تک گاہے تو نے رستہ بھی یہ اے بادِ سحر چھوڑ دیا
مصحفی دلّی میں رہتے تھے کبھی ہم، ہم نے
عمر گزری کہ وہ آباد نگر چھوڑ دیا

1۔ ل: چرخِ ستمگار 2۔ ل: گھر

71

زبس اپنا مونسِ بے کسی ترے غم میں رنج و محن رہا
نہ دماغ نکہتِ گل ہمیں، نہ خیالِ سیرِ چمن رہا

نہ[1] وہ باغ سبز نہ باغباں، نہ وہ لطفِ سرو و سمن رہا
نہ وہ بھینی سی پھولوں کی بو رہی، نہ وہ کیاریاں نہ چمن رہا

کچھ اِدھر سے ہم ڈھلے عمر میں، کچھ اُدھر سے دخترِ رز کے دن
نہ وہ شوخ چشمی جامِ مے، نہ وہ شوقِ توبہ شکن رہا

ہوا طے یہ دشت قدم قدم، کیا وحشیوں سے بھی ہم نے رَم
نکل آئے سینکڑوں کوس ہم، کہیں پیچھے ہم سے وطن رہا

نہ زباں تک آئی کبھی دعا، نہ گلے تک آہِ شکستہ پا
لبِ خامش اپنے کا مدّعا وہ جو تھا سو مُہرِ دہن رہا

ہوا رزقِ مورِ زمیں بدن، گیا اٹ کے خاک میں گُل کفن
کہوں کیا مصیبتِ رحتِ تن، نہ بدن رہا نہ کفن رہا

ثمر اور گل گئے جھڑ سبھی کہ شروعِ خط ہی یہ چخ مچی
نہ وہ حسن چہرے کا چمپئی، وہ نہ رنگِ سیبِ ذقن رہا

نہ گلے کی جا کہ گلہ کریں، نہ کریں جو صبر تو کیا کریں
نہ زمانے کی وہ روش رہی، نہ وہ دوستوں کا چلن رہا

جو بہشت میں گئے ہم کبھو بہ ہزار منّت و آرزو
تو ہماری آنکھوں کے روبرو وہی کانٹے اور وہی بن رہا

مرا لاشہ دیوے نہ یہ صدا؟ جو برہنہ خاک پہ ہو پڑا
میں امیدوارِ کفن رہا، میں امیدوارِ کفن رہا

1۔ ل : نہ وہ پودے پھولوں کے

رہی اس کی جانبِ در نظر، وہی اُٹھنا بیٹھنا تا سحر
مرے گھر وہ ایک بھی شب اگر بہ ہزار حیلہ وفن رہا
کوئی پان کھا کے جو ہے غضب مجھے قتل کر گیا کل کی شب
تو کلیجا آنکھوں کی راہ سب مرے جیب و سینہ پہ چھن رہا
تری بوے کاکلِ عنبریں، ہوئی آہوؤں کے جو دل نشیں
انھیں سال بھر بتِ نازنیں غمِ نافہ ہاے ختن رہا
نہ فلک نے اتنی معاونت مری کی کہ ہند میں کس طرح
میں پھرا خراب اور اس پہ بھی مجھے اشتیاقِ دکن رہا
شبِ وصل ہم نے کیا رقم، اسے صبح ہوتے ہی مصحفی
شبِ ہجر عالمِ خواب میں جو دہن پہ اس کے دہن رہا

72

شب کہ میں بیمارِ دردِ دوریِ جانانہ تھا　　شمعِ بالیں آہ تھی، لختِ جگر پروانہ تھا
کام کیا تھا ماتمی مجھ سے کو بزمِ عیش میں　　یعنی میں مسکیں چراغِ گور کا پروانہ تھا
وصل کی شب سرزمینِ دل میں ہے جوشِ نشاط　　اور یہ کل کی بات ہے یاں یاس کا کاشانہ تھا
اپنی نادانی پہ رونا کیوں نہ آوے اب ہمیں　　اس سے ہم غافل رہے اک عمر جو ہم خانہ تھا
اب وہ زلفیں غیر کا طوقِ گلو ہیں یا نصیب　　ایک دن دست ہوس اپنا بھی ان کا شانہ تھا
جب تلک شورِ جنونِ قیس تھا فرماں روا　　نالۂ زنجیر سے آباد ہر ویرانہ تھا
مصحفی جب تک جیا اس کارگاہ نظم میں
ہو کسی کے منھ سے، اچھی بات کا دیوانہ تھا

73

خمیازہ لیتے وہ رخ جب میں نگاہ دیکھا　　حیراں رہا کہ دن کو ہالے میں ماہ دیکھا

مجذوب سب جہاں کے جاذب کو ڈھونڈتے ہیں
مشتاق کہربا تھا جو برگ کاہ دیکھا

یوں سو ہوئے نشانے پر بیچ کماں نے میرے
اس پر ہی تیر مارا جس کا گناہ دیکھا

فریاد کو ہماری پہنچا نہ اک ستارہ
شب ہائے ہجر ہم نے برسوں کراہ دیکھا

ہم نے تو دوستی میں نقصان ہی اٹھائے
اب کیا بیان کیجے کس کس کو چاہ دیکھا

مژگاں کے کشتے کی تھی تربت جہاں وہاں سے
نشتر بکف ہی اُگتا برگِ گیاہ دیکھا

گو حشمتِ سلیماں، گو ثروتِ سکندر
یاں خاک ہی میں ملتا تخت و کلاہ دیکھا

مدفوں تھا جس زمیں میں سرگشتہ گیسوؤں کا
اک گردباد اٹھتا واں سے سیاہ دیکھا

بے تاب ہو سویدا آنے لگے جو منہ کو
کس کی ذقن کا اس نے خالِ سیاہ دیکھا

اس کے بھی دل سے ووں ہی فی الفور آہ نکلی
تصویر نے رخ اس کا گو بے نگاہ دیکھا

شاید کہ مصحفی پھر عاشق ہوا کسی پر
حال اس عزیز کا کل میں نے تباہ دیکھا

74

پاتا ہوں جو زلفوں کو کچھ اس کی کشیدہ سا
ہو جاؤں ہوں اک دم میں میں مارگزیدہ سا

سررشتۂ زلف اس سے اب تک جو نہیں چھوٹا
شانہ نظر آتا ہے گو دست بریدہ سا

نامے میں مگر میرے بیتابی کا مضموں تھا
اُڑتا ہے ہوا میں جو وہ رنگ پریدہ سا

جب صید مرا اپنے قابو سے نکل بھاگا
پھر ہاتھ نہیں آتا آہوئے رمیدہ سا

ابرو کے تصور میں جب آنکھ لگی اپنی
ہر عضو نظر آیا شمشیر رسیدہ سا

وحشت کے نہیں گردن، ایام بہاراں کے
اس باغ میں گل کیوں ہے پھر جامہ دریدہ سا

اے مصحفی لگتی ہے یہ بحر مجھے دلکش
اک ریختہ تو اس میں لکھ اور بھی چیدہ سا

75

پاتا ہوں میں پھر دل کو کچھ صدمہ رسیدہ سا ہے رنگ جو چہرے کا ان روزوں پریدہ سا
مژگاں کا تصور بھی کیا جانیے کیا شے ہے کھٹکے ہے مرے دل میں جو خار خلیدہ[1] سا
بیمار ہیں وہ آنکھیں کیونکر نہ اسے دیکھیں سبزہ ترے عارض کا ہے تازہ دمیدہ[2] سا
گھورے ہے یہ کس گل کو کیا جانیے گلشن میں ہر پھول ہے نرگس کا جو دیدہ دریدہ[3] سا
منظور ہے کیا اس کو اس شوخ کی جانب سے جو تیر کہ آتا ہے سو پیک دویدہ[4] سا
نسبت ہے ترے قد سے کیا سرو گلستاں کو تو صاحبِ دست و تیغ وہ کتف[5] بریدہ سا
کیا جانے گلا کس کا دیکھا ہے مہِ نو نے جو اس کے تصور میں ہے دست خمیدہ سا

اے مصحفی ساتھ اپنے مت بھیڑ بھڑکا لے
اک دن تجھے جانا ہے دنیا سے جریدہ[6] سا

76

خالی نہیں ادا سے یہ دزدیدہ دیکھنا شایانِ اہلِ ہوش ہے فہمیدہ دیکھنا
پیری ہوئی شباب[7] گئی کب کی ان دنوں بازی نہ کھائیو دلِ غم دیدہ، دیکھنا
شانہ سمجھ کے کیجیو گیسو میں میری جاں درہم نہ ہووے طرۂ ژولیدہ، دیکھنا
بس یونہی رہنے دیجیو میرے مزار کو مت کھولیو یہ نامۂ پیچیدہ دیکھنا
اس جوششِ بہار میں ہم لوگ مر نہ جائیں سیمیں بروں کا سینۂ بالیدہ[8] دیکھنا
بوسے کے اشتیاق میں آتا ہے پیش پا قاتل تو حسرتِ سرِ غلطیدہ دیکھنا
گو ضبط سے ہوں لاکھ ستم میری جان پر تو دم نہ ماریو دلِ شوریدہ، دیکھنا
ہاں اے شبِ فراق یہ کھنڈت[9] نہ کیجیو ہووے پلک[10] پلک سے نہ چسپیدہ دیکھنا

1۔ خلیدہ = چبھنے والا 2۔ تازہ دمیدہ = تازہ اُگا ہوا 3۔ دیدہ دریدہ = پھٹی پھٹی آنکھ
4۔ دویدہ = دوڑتا ہوا 5۔ کتف = بازو 6۔ جریدہ = تنہا، خالی 7۔ شباب کو مونث باندھا ہے
8۔ بالیدہ = نمو یافتہ 9۔ کھنڈت نہ کیجو = خلل نہ ڈالنا 10۔ مطلب پلک نہ جھپکے

کیا مصحفی کا حال ہوا ہے فراق میں
ٹک اس غریب کا تنِ کاہیدہ دیکھنا

77

قاتل کی آستین کا مالیدہ[1] دیکھنا ہے لاکھ سر کا خون میں غلطیدہ[2] دیکھنا
سبزے پہ پانو رکھیو صبا ٹک لحاظ سے ہووے نہ باغباں کہیں رنجیدہ دیکھنا
ہے یہ یقیں کہ زلف کے کشتے کی خاک سے اُٹھے گا گردباد بھی پیچیدہ دیکھنا
سبابہ[3] رکھ کے اس پہ تو اک دن تو اے مسیح عاشق کا داغِ سینۂ تفسیدہ[4] دیکھنا
آغازِ عشق میں تو تجھے کچھ خبر نہیں انجام اس کا اے دلِ شوریدہ دیکھنا
کیجو سمجھ کے گورِ غریباں سے تم گزر دامن نہ کھینچ لے کوئی خوابیدہ دیکھنا
کرتا ہوں گو میں دل کو قوی اس کے سامنے آنکھوں[5] سے پُر عیاں ہے ہراسیدہ[6] دیکھنا
تنہا نہ جائیو طرفِ کشورِ عدم میری بھی راہ اے دلِ غم دیدہ دیکھنا

گردن تو اک طرف رہی اپنا تو مصحفی
چھیلے ہے دل قلم کا تراشیدہ دیکھنا

78

جب اپنی چشم نے رونے کا جھاڑ[7] باندھ دیا ہر اک مژہ سے میں غم کا پہاڑ باندھ دیا
درختِ گل سے کدیور[8] نے آہ پھر کھٹکا گل آشیانۂ بلبل اجاڑ باندھ دیا
حجاب قیس سے کیا چاہیے تھا لیلیٰ کو جو پردہ بیچ میں کچھ کر کے آڑ باندھ دیا
وونہی اگاڑی سے گھوڑے کی ہاتھ عاشق کا گرا جو لات وہ کھات کر پچھاڑ باندھ دیا
یہ زور چہل اے سوجھی کہ قیس نے دمِ صبح درختِ گل سے گریباں کو پھاڑ باندھ دیا

1۔ مالیدہ = ملا ہوا یعنی مہندی میں پڑا ہوا 2۔ غلطیدہ = لوٹا ہوا، آلودہ 3۔ سبابہ = کلمے کی انگلی
4۔ تفسیدہ = جلا ہوا، گرم 5۔ ل : تو 6۔ ہراسیدہ = ڈرا ہوا 7۔ ل : تاڑ
8۔ کدیور = مالی، باغبان

ذکا تو دیکھ کہ ناقص سمجھ کے میں شبِ ہجر ستونِ عرش سے نالے کا پاڑ باندھ دیا
بھلا درستیِ اعضاے پیر کیا ہووے کہ جیسے رسّی سے ٹوٹا کواڑ باندھ دیا
چنے سے بھنتے ہیں آنکھوں میں روز و شب آنسو تپِ فراق نے مژگاں سے بھاڑ باندھ دیا
ستم کیا یہ کہ پہلو کے میرے پھوڑے پر شب اس نے سوزہ نمک چیر پھاڑ باندھ دیا
چبھیں ہیں خارِ مغیلاں سی دل میں وہ مژگاں یہ زور عشق نے دامن سے جھاڑ باندھ دیا
دل اپنا حلقۂ الفت میں مصحفی میں نے
کسی کی زلف کی زنجیر تاڑ باندھ دیا

79

سب کچھ بہم سفر کا سر انجام کر لیا منظور تھا جو ہم کو سو وہ کام کر لیا
اب صبح حشر شوق سے آ تو کہ ہم نے بس کنج لحد میں ایک دم آرام کر لیا
تب آئے بام پر وہ دکھانے کو منھ کہیں جب ہم کو آفتابِ لبِ بام کر لیا
جب چشم آفتاب اسے گھورنے لگی زلفوں میں اس نے عارضِ گلفام کر لیا
وعدہ دیا جو وصل کا اس نے دمِ غروب صبحِ مراد کو میں وونہی شام کر لیا
چوٹی سے اپنی کام لیے دونوں یار نے گاہے کمند اس کو، گہے دام کر لیا
رم کردہ آہوؤں میں ترے اب ہے یہ خواص چاہا جسے بس اس کو وونہی رام کر لیا
مجنون دل زدہ یہی کہتا تھا وقت نزع دو دن مجھے بھی عشق نے بدنام کر لیا
ساقی نے ہنس دیا مری جلدی کو دیکھ کر لبریز خونِ دل سے جو میں جام کر لیا
اب نظم شعر تجھ کو مبارک ہو مصحفی
جو مجھ سے ہوسکا سو میں ابرام کر لیا

80

ہم نے بھی ایک بت کے تئیں رام کر لیا منظور تھا جو اپنے تئیں کام کر لیا

مائل ہوئی ہے اب وہ نگہ کفر کی طرف
مدت ہوئی کہ غارت اسلام کر لیا

ساقی لگا جو بانٹنے مے، مجھ غریب نے
ہاتھوں کو وصل کر کے بہم جام کر لیا

میں اضطراب دل کے ہوں صدقے کہ یار سے
گھر بیٹھے بیٹھے نامہ و پیغام کر لیا

گر نارسیدہ[1] ہاتھ لگا کوئی پھل مجھے
میں دم میں پختہ وہ ثمرِ خام کر لیا

اب اس کا ذکر فائدہ کیا عاشقوں کے ساتھ
جو جو سلوک تو نے گلِ اندام کر لیا

کچھ وہ کرم چھپا نہیں عہد شباب میں
کیا کیا نہ شاہِ حسن[2] نے انعام کر لیا

تب اس جہاں سے کوچ کیا ہم نے مصحفی
جب سب بہم سفر کا سر انجام کر لیا

81

نقشا تری آنکھوں کا مجھے یاد دلایا
یا باغ میں نرگس نے نیا پھول کھلایا

جاں ہونٹوں پہ آئی نہ ملی دُردبھی مے کی
ساقی کے تغافل نے ہمیں خوب چھکایا

اتنا بھی تو میں کودک نافہم نہ تھا کچھ
منھ کر کے سیہ جو شبِ ہجراں نے ڈرایا

کیا کیجیے ساقی سے گلہ تشنہ لبی کا
مے ایک طرف، کل مجھے پانی نہ پلایا

آنکھ اس کی برنگِ یرقانی نظر آئی
کچھ دیدۂ نرگس کا مجھے طور نہ بھایا

اے سوزنِ عیسیٰ یہ ستم مجھ پہ نہ کر تو
کس گل نے گریباں کو بہاراں میں سلایا

اللہ رے صفا گورے بدن کی ترے کافر
تجھ کو شبِ مہتاب میں ڈھونڈا تو نہ پایا

مت عشق میں ہو مصحفی آرام کا طالب
خورشیدِ قیامت میں تو کیا ڈھونڈے ہے سایا

82

کب اس زمیں پہ رکھتے ہیں عالی دماغ پا
ہو زحشِ فکر جس پہ پہنچ کر چراغ پا

1۔ نارسیدہ = خام 2۔ل : شانِ حسن

کشتہ ترا پڑا ہے جہاں طرفہ سیر ہے — جا جا کے اس کے خوں میں بھر آتے ہیں زاغ پا
دستِ طمع کو اپنے جو کوتہ کرے کوئی — پھیلائے پیش شاہ و گدا با فراغ پا
یہ توسنِ کبودِ فلک کہنہ لنگ ہے — چشک[1] نہیں ہے اس کو کہ دیں اس کے داغ پا
پیدا ہوا ہے خار الم دل کے واسطے — ہر چند ڈھونڈیں پاویں نہ اس کا سراغ پا
ساقی تو بے خودوں تک اسے ہاتھوں ہاتھ لا — خود آوے کس طرح، نہیں رکھتا ایاغ پا

فوجِ خزاں کا منہ ابھی پھر جائے مصحفی
قائم رکھیں جو تازہ نہالانِ باغ پا

83

بلبل نے اپنا جس پہ رکھا با فراغ پا — اس شاخ گل پہ حیف ہے گر رکھے زاغ پا
میدانِ عشق سے کوئی آگے نہیں بڑھا — یاں رستموں کے رخش ہوئے ہیں چراغ پا
اس بزم میں کھڑے ہی کھڑے ہم جلا کیے — مانندِ شمع اپنے ہوئے صرفِ داغ پا
پایا نشاں نہ اس کے سُمِ رخش کا کہیں — پیکِ صبا کے تھک گئے کر کے سراغ پا
آئی شبِ وصال تو پر مجھ کو ہے یہ ڈر — کم فرشِ گل پہ رکھے ہے وہ کم[2] دماغ پا
کس روز راہوار چلا توسنِ فلک — پایا ہمیشہ ہم نے تو اس کو الاغ[3] پا
کب پیش لے گیا ہے تری[4] چال سے کوئی — کبک و تدرو دونوں ہیں اس جا کلاغ[5] پا
رفتار تیری دیکھ کے حیران رہ گیا — آگے ترے اٹھا نہ سکا سروِ باغ پا
سرگشتگی یہی ہے تو مرنے کے بعد بھی — پیدا کرے گا خاک کا میری ایاغ[6] پا

پگڈنڈیاں نہیں ہیں سراسر یہ مصحفی
راہِ طلب میں اس کی نکالے ہے راغ[7] پا

1۔ چشک = گھوڑوں کی ایک بیماری 2۔ل، ب: خوش دماغ 3۔ الاغ پا = گھوڑے کی تیز چال
4۔ ل: کوئی چال سے تری 5۔ کلاغ = جنگلی کوا 6۔ایاغ = پیالہ 7۔ راغ = مرغزار

84

رکھتے نہیں جو بزم میں شمع و چراغ پا کیا وہ بھی رک رہے شبِ غم، تجھ کو داغ[1] پا
جیسے چمن سے آئی تھی ویسے چلی گئی بولی نہ بوے گل بھی مجھے بے دماغ پا
ساقی کے ہو جو ہاتھ میں مہندی لگی ہوئی پیدا کرے بہ جنبشِ ابرو ایاغ پا
دل کا عزیز کیوں کہ نہ ہو زور جب رکھے سینے پہ میرے یار کے چھلے کا داغ پا
قاتل کے پاس نامہ مرا لے چلا ہے یہ رنگے نہ اپنے خوں سے کہیں اپنے زاغ پا
کیا کام چلنے پھرنے سے پھر اس فقیر کو بیٹھا ہو کھینچ کے جو بکُنجِ فراغ پا
لیلیٰ ملے گی قیس سے بے شک کہ نجد میں ناقہ گیا ہے آج اکیلا سراغ پا
پامال گل ہیں سب تری طرزِ خرام کے[2] کس نے رکھا چمن میں بہ ایں لہو[3] ولاغ پا

جولانِ فکرِ مصحفی پاوے نہ فکرِ غیر
لاوے کہاں سے بج عربی کی الاغ پا

85

دم بدم رنگ ترا اور نکلتا آیا ہم ملے خاک میں جوں جوں تو سنبھلتا آیا
میں نے جانا کہ یہ آتا ہے اسی کوچے سے جو کوئی تابشِ خورشید میں جلتا آیا
دیکھیو وصل کا پیغام نہ لایا ہو کہیں آج اس کوچے سے قاصد جو اچھلتا آیا
بے کسی برسے تھی لاشے پہ ترے کشتے کے جو کہ آیا کفِ افسوس ہی[4] ملتا آیا

چین سا آنے لگا مصحفی اپنے دل کو
جوں جوں دن ہجر کا اس شوخ کے ڈھلتا آیا

86

جیتا ترے کوچے سے میں جاؤں تو کچھ کہنا اور قتل کی خواہش میں پھر آؤں تو کچھ کہنا

1۔ یعنی "داغ پا کر" (داغ = گرم، خفا) 2۔ ل: کو 3۔ لہوولاغ = کھیل، مشغول 4۔ ل: کو

عکس اپنا یہ کہتا ہے اس شوخ کی صورت سے — میں آنکھ لڑانے میں شرماؤں تو کچھ کہنا
کب جائے ملامت ہے احوال مرا ناصح — میں چاکِ گریباں کو سلواؤں تو کچھ کہنا
آغوش کی حسرت کو بس دل ہی میں ماروں گا — اب ہاتھ تری خاطر پھیلاؤں تو کچھ کہنا

یہ بحر ہے گو روکھی اے مصحفی پر میں بھی
گر رخشِ طبیعت کو ٹھہراؤں تو کچھ کہنا

87

میں اور سے دل اپنا بہلاؤں تو کچھ کہنا — عاشق ہوں ترا اس پر للچاؤں تو کچھ کہنا
اے ہم سفراں مجھ کو ہے مشق قدم بازی — میں قافلے کے پیچھے رہ جاؤں تو کچھ کہنا
تم مجھ پہ ابھی سے کیوں ہوتے ہو خفا صاحب — سرگوشی میں عارض تک منہ لاؤں تو کچھ کہنا
گو رات گزر جائے بیٹھا ہوں میں بدکر شرط — زانو ترے زانو سے سرکاؤں تو کچھ کہنا

ہر چند زمیں ہے یہ خاموش ہی رہنے کی
پر مصحفی میں تجھ سے فرماؤں تو کچھ کہنا

88

جان سے تا وہ مجھے مار نہیں جانے کا — جان جاوے گی ولے یار[1] نہیں جانے کا
بعدِ مُردن بھی رہیں گے یونہی وا دیدۂ شوق — الم حسرتِ دیدار نہیں جانے کا
مرضِ عشق کو شاید ہو پس از مرگ شفا — زندگی میں تو یہ آزار نہیں جانے کا
رحم کر ضعف پر اس کے کہ چمن تک صیاد — نالۂ مرغِ گرفتار نہیں جانے کا
دستِ چالاک کی یہ خو ہے تو مرتے مرتے — ہاتھ سے دامنِ دلدار نہیں جانے کا
گر یہی چشم کی مستی ہے تری اے ساقی — میکدے سے کوئی ہشیار نہیں جانے کا
اے طبیبو، نہ اذیت دو مجھے بہرِ خدا — آہ دردِ دلِ بیمار نہیں جانے کا

1۔ "یار نہیں جانے کا" = یعنی میں جانے والا نہیں

گر شبِ وصل بھی ہم لوگ کریں گے نالہ
یہ یقیں ہے کہ وہ بیکار نہیں جانے کا

کوچۂ عشق میں سخت اس نے اذیت کھینچی
اب اِدھر مصحفیِ زار نہیں جانے کا

89

دکھاؤں کس لیے قاصد کو یارو گھر اپنا
میں آپھی نامہ نویس، آپھی نامہ بر اپنا

گیا ہے عالمِ پیری میں جی ہی مر اپنا
دیا ہے ہم نے جوانوں کو دردِ سر اپنا

قسم خدا کی صنم تیرے چشم و ابرو دیکھ
کیا حوالۂ مقراض میں جگر اپنا

غبار دل پہ نہ آیا کسی طرح ہر چند
میانِ گردِ یتیمی رہا گہر اپنا

بنایا سنگ سے کانچ اور کانچ سے شیشہ
دکھاوے اور ہنر خاک شیشہ گر اپنا

دوات و خامہ و کاغذ کو اس سے رنج نہیں
ہے اپنے دل ہی میں مضمون مختصر اپنا

اڑے تو چار طرف ہم ولے بہ پاسِ ادب
گرا نہ صحنِ گلستاں میں ایک پر اپنا

اگر تو سامنے بے پردہ ہو نہیں سکتا
دکھا دے دور سے مکھڑا تو اک نظر اپنا

کسی کی یہ بھی مگر مصحفی ہے دیوانی
کرے ہے چاک گریباں جو یہ[1] سحر اپنا

90

بے قراری سے دلِ خستہ بہ تنگ آ ہی گیا
چلتے چلتے رہِ سیماب میں سنگ آ ہی گیا

تیرہ بختی نہ مٹی اس کی شبِ وصل بھی آہ
شمع کے دُود میں آخر کو پتنگ آ ہی گیا

میں تو چاہا کہ نہ نکلے ترے خط آخر کار
صافیِ آئینۂ حسن پہ زنگ آ ہی گیا

کوچہ یار میں ٹھوکر نہ لگے یا کہ لگے
پوچھنا اس کا ہے کیا پانو میں لنگ آ ہی گیا

مژدۂ آمدنِ خط میں ہے تاثیرِ بہار
سن کے قاصد کی مرے چہرے پہ رنگ آ ہی گیا

1۔ ل : نت

میں نے جانا تھا کہ ہے عشق کا کوچہ دور
قاصدِ اشک تو بھر کر دو شلنگ[1] آ ہی گیا

مار کر ہاتھ میں گرداب سے نکلا تو وونہی
سامنے سے مرے یکبار نہنگ آ ہی گیا

آنکھ سیدھی بھی ذرا اس کی نہ ہونے پائی
کہ نگہ کا ہدفِ دل پہ خدنگ آ ہی گیا

کبکِ کوہی نے صنم کی جو تری شاگردی
رفتہ رفتہ اسے رفتار کا ڈھنگ آ ہی گیا

کیا کہیں صلح کی تقریب نہ ہونے پائی
باتوں باتوں میں وہ کل بر سرِ جنگ آ ہی گیا

مصحفی نے جو تجا[2] شعر، عجب اس کا نہ جان
تھا مسلماں اسے اس پیشے سے ننگ آ ہی گیا

91

کبھی دم گسل ہے سرمہ تری چشمِ سُرمگیں کا
کبھی پیسے ہے دل افشاں صنما تری جبیں کا

ترے حسن چمپئی سے جو ہے اس کو ایک نسبت
تو بھلا لگے ہے گجرا مجھے زرد یاسمیں کا

سوے کعبہ میں نے سجدہ کیا بعدِ سر بریدن
دمِ ذبح بھی زبس تھا مجھے پاس اپنے دیں کا

کہیں اور تو بلا کچھ نہ شبِ فراق لادے
کہ خیال بندھ رہا ہے ترے جعدِ عنبریں کا

مری آہ و اشک میں کیوں نہ فراق ہو ضروری
اسے عزم آسماں کا، اسے قصد ہے زمیں کا

تو شکار بند میں تو[3] مرے سر کو باندھتا ہے
مجھے ڈر ہے یہ کہ دامن نہ بھرے لہو میں زیں کا

تو مریض عشق کا ہو مگر آ کے اب مگس راں
کہ وہ ضعف تن سے بھولا ہے ہلانا آستیں کا

نہ ملے جو یار جانی اسے پیس پھانک جاؤں
ہے اسی لیے تعشق مجھے ہیرے کے نگیں کا

اسے قیس نے یہ جانا ہے غریب شہر لیلیٰ
سوے کوہِ نجد آیا جو لٹا ہوا کہیں کا

کہیں اور دو[4] غزل میں بکمال حسن و خوبی
مجھے مصحفی خوش آیا جو ترانہ اس زمیں کا

1۔ شلنگ = زقند 2۔ تجا = ترک کرنا 3۔ ل : گو 4۔ل : وہ

92

نہ جلے دل اس سے کیونکر گلِ لعل کے نگیں کا
کہ فروغ پر ہے شعلہ ترے لعلِ آتشیں کا

نہ اُٹھا کے آنکھیں اوپر میں فلک کے منہ کو دیکھوں
جو خدا دکھاوے پھر منہ ترے کوچے کی زمیں کا

مجھے میرے دل نے رسوا تری چاہ میں کیا آہ
نہ انیس کی خطا کچھ، نہ گناہ ہم نشیں کا

کوئی تا سحر کھنچے ہے یہ مریضِ عشق تیرا
اسے رہ گیا ہے وقفہ دمِ چند واپسیں کا

میں وہ صیدِ پرشکستہ ترے روبرو ہوں صیاد
نہ کماں کا غم ہے جس کو نہ نہیب ہے کمیں کا

کئی مرغ سدرہ اس میں ہیں اسیر مجھ کو ڈر ہے
کہیں ہو زیاں نہ تیرے خمِ زلفِ عنبریں کا

مجھے گھر سے اس کے باہر نہ نکال اے خجالت
ابھی خشک ہونے تو دے تو عرق مری جبیں کا

کہاں ایسے بخت جو ہو مجھے ایسی رات روزی
کہ میں خواب میں لوں بوسہ ترے روے نازنیں کا

میں برنگِ مرغِ بسمل جو رہا ہوں دست و پا مار
مگر اب تلک بھی یارو مجھے قصد ہے کہیں کا

یہ ہلال کا دہن ہے کہ وہ اس سے ہو مقابل
کہ ستارہ اوج پر ہے ابھی تیری قاش زیں کا

تو چراغ دل کو میرے ابھی گل نہ کیجو یارب
نہیں صدمہ اس نے دیکھا کبھی بادِ آستیں کا

تو پڑا ہے حجرے میں کیا سوے دشت مصحفی چل
کہ ملال دور ہووے تری خاطرِ حزیں کا

93

کہیں پیچ کھل گیا تھا کسی زلفِ عنبریں کا
جو ہوا کے ساتھ بھبکا ہے شمیمِ مشکِ چیں کا

میں رواں ہوں کس کے پیچھے میں کدھر ہوں اور کہاں ہوں
نہ فلک کا دھیان مجھ کو، نہ خیال ہے زمیں کا

دمِ نزع میری تیری نہ بنی کہ کہہ چکا ہوں
تو کہیں کو جاوے ہے جاں، مجھے قصد ہے کہیں کا

میں تڑپ تڑپ کے غم میں ترے جان دی ہمیشہ
پہ نہ منہ سے تیرے نکلا کبھی حرف آفریں کا

مرے راہ جاتے جاتے گئے کان اگر ادھر کو
کوئی تذکرہ کرے تھا کسی طفلِ نازنیں کا

مرے گھر وہ کس دن آیا بہ کمال بے دماغی
کہ حوالۂ عرق چیں[1] نہ کیا عرق جبیں کا

کئی نیشِ خار کھائے، لہو انگلیوں سے ٹپکا
تو نہ پوچھ ماجرا کچھ مرے دستِ غنچہ چیں کا

دیے جامِ صاف تو نے سبھی میکشوں کو ساقی
اور امیدوار رکھا مجھے دُردِ تہہ نشیں کا

طرفِ حرم گیا ہے وہ بُتِ شکار افگن
نہ لہو سے تر ہوا دامن کہیں کعبے کی زمیں کا

نہ خدا سے سرکشی کر جو تو چاہے راستی کو
ہوا بعدِ سجدہ سیدھا خطِ واژگوں نگیں کا

میں جہاں کے بیچ رہنے نہیں مصحفی کچھ آیا
ہوں عدم کا جانے والا مجھے قصد ہے وہیں کا

94

جب اس پری کی محبت کا دل میں خانہ ہوا
میں رفتہ رفتہ بہ بیگانگی یگانہ ہوا

دیا جواب مجھے عمر نے، کبھی واں سے
جواب لے کے جو قاصد مرا روانہ ہوا

درِ صنم پہ جبیں اپنی گھس گئی ساری
نصیب اس کو نہ کعبے کا آستانہ ہوا

زبس کہ گریہ میں اس زلف کا تصور تھا
گرا جو اشک وہ زنجیر ہی کا دانہ ہوا

کبھی جو ہم لبِ ساحل پہ غم میں جا بیٹھے
ہمیں ترنمِ آبِ رواں ترانہ ہوا

جو اشتیاق میں ان گیسوؤں کے ہو گئے خاک
اُگا جو خار بھی واں سے تو خار شانہ ہوا

ہزار شکر کہ اس کُو سے سب اُٹھائے گئے
رہے ہم ایک ہمیں ضعف کا بہانہ ہوا

ترے بچھڑتے ہی اے گل ہمارے چہرے سے
اُڑا جو رنگ، بہ عنقا ہم آشیانہ ہوا

دوچار ہوتے ہی ہم اس سے کر گئے جولاں
ہمیں اشارۂ ابرو ہی تازیانہ ہوا

فسانہ اپنا بھی رنگین تھا ولے افسوس
کبھی نہ گوش ترا مائلِ فسانہ ہوا

نگاہ آئینے پر تو نے کی میں کھیت[2] رہا
کسی کے تیر لگا اور کوئی نشانہ ہوا

کہے گا تم سے بھی اے دوستانِ معنی بند
جو مصحفی سے بھی موزوں کوئی ترانہ ہوا

1۔ عرق چیں = پسینہ جذب کرنے والا، مراد رومال 2۔ کھیت رہنا = مر رہنا

95

چمن میں جاتے ہی بس تن سے جی روانہ ہوا
کہ مجھ کو خندۂ گل موت کا بہانہ ہوا

برنگِ طائرِ رنگِ حنا ہوں میں وہ اسیر
جو چھوٹ کر نہ شناسائے آشیانہ ہوا

رکھا جو ہاتھ کبھی دوش پر مرے اس نے
تو رشک سے وونہی دشمن کو درد شانہ ہوا

سمندِ وحشتِ مرغِ چمن کو باغ کے بیچ
ہلا جو نخل ہوا سے وہ تازیانہ ہوا

زبسکہ ٹوٹ رہے ان میں تیغ و تیر و سناں
ہر ایک زخمِ تن اپنا سلاح خانہ ہوا

ملی وصال کی دولت سے سلطنت مجھ کو
عجب ہے یہ کہ گدا صاحبِ خزانہ ہوا

رکھا نہ کام میں دیر و حرم کے سجدے سے
کہ مجھ کو کاسۂ زانو ہی آستانہ ہوا

ہیں کاسۂ سرِ[1] گردوں میں سینکڑوں روزن
یہ کس کے ترکشِ پُر تیر کا نشانہ ہوا

شبِ وصال کی میں لذتوں سے دور رہا
فراق اوٹ کا پردہ جو درمیانہ ہوا

نہ مصحفی سے رہو دل گرفتہ آخرکار
سنو گے تم کہ موے اس کو اک زمانہ ہوا

96

مجھے بھی گمرہیِ شب کا اک بہانہ ہوا
چراغِ غول جو میرا چراغِ خانہ ہوا

اچھل کے سر مرا پانووں پہ جا پڑا اس کے
لگی جو تیغِ ادا مجھ سے یوں دوگانہ ہوا

کڑی یہ جعد گندھی کم سنی میں کافر کی
کہ جس کو دیکھ خجل سخت تازیانہ ہوا

نہ کام آئی مری سخت جانی اتنی بھی
نہ سنگِ قبر، نہ میں سنگِ آستانہ ہوا

فسونِ بادِ بہاری نہ گل کے کام آیا
یہ خستہ آنکھ کے کھلتے ہی بس فسانہ ہوا

جہاں میں بیٹھ گیا وقت سست پائی کے
وہی مرا قفس اور وہ ہی آشیانہ ہوا

کہیں ہیں مرغِ چمن نے بھی دی اسی دم جاں
نسیمِ صبح کا جب کارواں روانہ ہوا

1۔ ل : سرِ گردن

بلا ہے عالم تصویر سے بچائے خدا　　دمن کا دشمنِ جاں عشق غائبانہ ہوا

لکھی ہیں میں نے غزل مصحفی یہ دعوے سے
یہ اختلاط سخن مجھ سے دوستانہ ہوا

97

آشکارا جب ہوا حق ختم[1] باطل ہو گیا　　پرتوِ خورشید سے یہ سایہ زائل ہو گیا

نور اور ظلمت کے پردے رفتہ رفتہ اٹھ گئے　　قطرہ آب بحر سے آخر کو واصل ہو گیا

خاکِ گلزارِ محبت میں اثر ہی اور ہے　　واں سے جو پودا اُگا وہ سرو مائل ہو گیا

سرزمینِ کوے معشوقاں یہ الفت خیز ہے　　دانہ دہقاں نے جو واں بویا سو وہ دل ہو گیا

جسم خاکی کو بنایا لاغری نے عین[2] روح　　غرقِ آبِ بحر کٹ کٹ کر یہ ساحل ہو گیا

درمیاں رہتا تھا بیداری کا پردہ رات دن　　مُند گئی جب آنکھ بس مقصود حاصل ہو گیا

بعد طفلی کے ہوا حاصل اسے حسن شباب　　یہ ہلال آخر کو بڑھ کر ماہِ کامل ہو گیا

ہاتھ رکھ قبضے پہ بھپکی سی جو اس نے مجھ کو دی　　دیکھتے ہی یہ ادا بس میں تو بسمل ہو گیا

قیس از خود رفتہ نے دیکھا نہ اک دن روے یار　　نجد میں سو بار یوں لیلیٰ کا محمل ہو گیا

مجھ سے اس کی آنکھ ملتی ہی نہیں حیران ہوں　　کون سا پردہ مرے اور اس کے حائل ہو گیا

کام ہی میرا کیا آخر تمام اے مصحفی
نیچہ[3] ہی اس کا میرے حق میں قاتل ہو گیا

98

بے درد آشنا تو نہیں دل کے درد کا　　کیا جانے اضطراب کسی کوچہ گرد کا

نوکِ قلم سے دوں ہوں دلِ خصم کو فشار　　عالم کچھ اور ہے مری طرزِ نبرد کا

سرگشتہ نالہ کش ہے کوئی دشت میں جو آج　　اُٹھتا ہے رو بہ چرخ تنورا[4] سا گرد کا

1۔ اصل و ل، ب: جسم　　2۔ ل میں ''عین'' ندارد　　3۔ ل: نیچہ اس کا مرے حق میں تو

4۔ تنورا = مراد آگ

کیا آ کے میں کروں ترے گلشن میں باغباں　　اک پھول بھی کھلا نہ مرے رنگ زرد کا
نکلے ہے اس کی تیغِ تغافل میاں سے　　اب امتحان ہووے گا نامرد و مرد کا
گھورا نگاہِ گرم سے مجلس میں یار نے　　لانا لبوں پہ جرم ہوا آہِ سرد کا
کھلنے میں یوں تو پھول سبھی خوش نما ہیں لیک　　کشتہ ہوں میں تبسمِ گل ہائے زرد کا
کیا راہِ نجد تھی یہ جو اک بار پڑ گیا　　کانٹوں پہ پانو ناقۂ صحرا نورد کا
آخر نہ ہووے دفترِ عصیان مصحفی
لیوے اگر حساب کوئی فرد فرد کا

99

ہرگز نہ مری خاک سے فرزانہ بنے گا　　پتلا جو بنے گا بھی تو دیوانہ بنے گا
ہونے دو ابھی جمع حکایات محبت　　جب جمع یہ ہوویں گے اک افسانہ بنے گا
اے برق جلا مت خس و خاشاک چمن کو　　اس گل کے لیے باغ میں خس خانہ بنے گا
کس واسطے ہیں جمع بہم خار مغیلاں　　کیا گیسوے مجنوں کے لیے شانہ بنے گا
نیرنگ رخ گل جو یہی ہے تو چمن میں　　شبنم کا ہر اک دانہ پری خانہ بنے گا
بے وجہ نہیں داغ سیہ لالہ کے دل پر　　شاید ہدفِ ناوکِ جانانہ بنے گا
اس دست حنائی کے تصور میں جو رویا　　یاقوت مرے اشک کا ہر دانہ بنے گا
گر شمع کے شعلے کی یہ ہے وضع شرارت　　فانوس بھی خاکستر پروانہ بنے گا
بے کار تو ساقی نہ سمجھ خاک کو میری　　اک روز اسی سے خم و پیمانہ بنے گا
ڈھے جائے گا گر خانۂ دل جور فلک سے　　تو اور ہوادار یہ ویرانہ بنے گا
تو مصحفی اس کوچے میں مت جائیو ورنہ
عقل و خرد و ہوش سے بیگانہ بنے گا

100

مجھ سے کنارہ کر گیا وہ بتِ نازنیں مرا
عشق نہاں نہ رکھ سکا آہ دلِ حزیں مرا

ہے وہ گھڑی گھڑی نپٹ[1] عشق میں نکتہ چیں مرا
دیوے رقیب کو خدا کاش دلِ حزیں مرا

شکر کہ میں کبھی نہ کیں غیر کی نکتہ چینیاں
میرے ہی رخ پہ وار ہا دیدۂ عیب بیں مرا

بندگیِ جنابِ عشق پائی جو اس میں بیشتر
سخت قضا ہوئی ملول پڑھ کے خطِ جبیں مرا

ہے یہی اضطرابِ عشق تو پسِ دفن دیکھیو
رہنے کا ایک جا نہیں لاشہ تہِ زمیں مرا

آفریں جذبِ عشق پر کہتے ہیں آشنا اسے
جانبِ کوے یار تھا رخ دمِ واپسیں مرا

مثلِ صبا پھرا بہت باغ و چمن میں دشت میں
تو جو نہ ساتھ تھا مرے جی نہ لگا کہیں مرا

پردہ اُٹھا کہ یار کے عارضِ لالہ رنگ سے
تازہ نہ گل کھلائے کچھ نالۂ آتشیں مرا

نالہ ہے، آہ وزاری ہے، درد ہے، بیقراری ہے
زخمِ نگاہ کاری ہے، عشق نہاں نہیں مرا

نیم نگہ کو تو کبھی رخصتِ یک نظارہ دے
کام تمام ہے یہاں اے بتِ شرمگیں مرا

مرنے کے بعد بھی وہی مجھ میں[2] رہے گا جذبِ دانس
پہلوے گور سے جدا ہوگا نہ ہم نشیں مرا

منکرِ گریہ مصحفی کیونکہ میں ہوں تو ہی بتا
خون سے تر ہے اب تلک گوشۂ آستیں مرا

101

قطعِ مراحلِ جنوں ہے قدمِ اولیں مرا
سایہ بھی راہِ عشق میں پیچھے رہا نہیں مرا

اس رخِ شعلہ رنگ کی شرم و حیا پہ کر نظر
لب تلک آ کے پھر گیا نالۂ آتشیں مرا

زاغ و زغن سگ و ہُما جلد خبر لو آن کر
آج تلک گڑا نہیں لاشہ تہِ زمیں مرا

چشمِ سرشک بار سے پونچھتے پونچھتے لہو
حلق ذبیح بن گیا حلقۂ آستیں مرا

زلف سے لوں گا میں سمجھ اینٹھے ہے کیوں تو بے سبب
تجھ سے تو کچھ گلہ نہیں کاکلِ عنبریں مرا

1۔ ل،ب: بہت 2۔اصل : مجھ سے

دیوے گا داغ یاس تو ہجر کی شب کلیجے پر کچھ نہ کرے گا گر سلوک مجھ سے دلِ حزیں مرا
آج ہی اعتبار ہے جب میں جہاں سے اُٹھ گیا تجھ کو وبال ہووے گا نام بھی اے نگیں مرا
زلف سیہ غرور سے کہتی تھی کل یہ برملا اک حبشی غلام ہے نافۂ مشک چیں مرا
آ تو سہی نگاہوں میں تیری بلائیں لوں گا میں بس نہ چلے گا اتنا بھی کیا دمِ واپسیں مرا
پیری میں مرگ کی مجھے سوجھے نہ کیوں کہ مصحفی
اتنا تو بے بصر نہیں دیدۂ دوربیں کا

102

تنہا نہ آستیں ہی کو مژگاں نے تر کیا جامہ تمام دیدۂ گریاں نے تر کیا
آبِ حیاتِ لب کے ترے سامنے صنم کوثر سے لب نہ ایک مسلماں نے تر کیا
جو صید تشنہ کامِ شرابِ وصال تھا حلق اس کا آبِ قطرۂ پیکاں نے تر کیا
جس لعلش لب سے تھا رطبِ تازہ منفعل آخر وہ تیرے گوہرِ دنداں نے تر کیا
ناسورِ پائے قیس ہوا عاقبت وہی جو آبلہ کہ خارِ بیاباں نے تر کیا
تو نے ہی کی نہ نشو ونما اے نہالِ عمر کیا کیا درخت ابرِ بہاراں نے تر کیا
مژگانِ نم زدہ مری دیکھیں[1] جو مصحفی
سبزے کو آبشارِ گلستاں نے تر کیا

103

وہ دل کہ جسے میں نے کیا آنکھ کا تارا آخر کو اسی دل نے مجھے مار اتارا
افسانہ رہا عاشق و معشوق کا باقی گو جھنگِ سیالان و کجا تخت ہزارا
رشکوک[2] ہیں آنسو مرے، چشم گہر افشاں فوارہ ہے، پر وہ اسے کہتے ہیں ہزارا
تلوار تو کھینچے ہے عبث قتل کو میرے کافی ہے میاں اک ترے ابرو کا اشارا

1۔ ل،ب: دیکھی 2۔رسکوک، رشکوک = موتی

آیا ہے تو نرگس کی طرح کھول کے آنکھیں　　کر لے تو ذرا گلشنِ ہستی کا نظارا
میں کیونکہ بچائے نہ رکھوں شیشۂ دل کو　　دل یار کا سختی میں تو ہے آہن و خارا
خال سیہ اس عارض رنگیں پہ نہ سمجھو　　زنگی نے لیا ہے چمن حسن اجارا

کرتی ہی نہیں وا گرہِ غنچۂ دل کو
اے مصحفی امروز چہ شد بادِ صبا را

104

گر نالۂ رنگیں دلِ ناشاد کرے گا　　تو کنج قفس میں چمن آباد کرے گا
گر دام میں بسمل مجھے صیاد کرے گا　　حسرت[1] کی نگہ کو وہ مری یاد کرے گا
اندازِ خرام اس کا اگر یہ ہے تو اک دن　　ٹھوکر میں مری خاک کو برباد کرے گا
گر داورِ محشر کے اسے سامنے[2] لائے　　عاشق لبِ خاموش سے فریاد کرے گا
صیّاد سمجھتا ہے مری طرزِ فغاں کو　　ہرگز نہ قفس سے مجھے آزاد کرے گا
خامی سے محبت کی یہ سوجھے ہے مجھے عشق　　مجنوں ہی بناوے گا نہ فرہاد کرے گا
میں خشک ہوں اتنا کہ نہیں خوں بھی بدن میں　　کیا مجھ سے گلہ نشترِ فصّاد کرے گا
ہے خیرہ کش اول سے دلا وضع فلک کی　　سچ ہے کہ غریبوں ہی پہ بیداد کرے گا
اس صید زبوں پر یہ گماں کس کو پڑے تھا　　آغشتہ بخوں خنجرِ فولاد کرے گا
اتنا ہے وہ خوش چہرہ اگر سامنے آیا　　آئینے کو حسن اس کا پری زاد کرے گا

اے مصحفی لکھوں گا، اگر فیضِ طبیعت
مجھ کو غزل اک اور بھی امداد کرے گا

105

شمشیر کی برش کو اگر یاد کرے گا　　لاشہ مرا محشر میں بھی فریاد کرے گا

1۔ ل: حیرت　　2۔ل : روبرو

مذبوح ترا عرش ہلا دیوے گا باللہ گر نالہ تہِ خنجرِ فولاد کرے گا
محشر میں جو پائی دل رنجور نے طاقت تم دیکھیو فریاد سی فریاد کرے گا
افلاک بناتا ہے مرے جسم کو سرمہ یعنی کہ اسے پیس کے برباد کرے گا
گر دام سے چھوٹے گا گرفتارِ محبت تو رُو طرفِ خانۂ صیّاد کرے گا
سر تیغِ تغافل سے اگر میں نے بچایا تو ننگ مرے قتل سے جلاد کرے گا
ایذا طلبی یہ ہے تو آخر سر عشاق اک دن ہوسِ تیشۂ فرہاد کرے گا
تصویر کو کھینچے گا اگر یار کی میرے عالم پہ ستم خانۂ بہزاد کرے گا
صیاد سے کہہ دو کہ کوئی دم تو ٹھہر جائے مرغِ قفسی زمزمہ بنیاد کرے گا

لکھ جائے گا پھر مصحفی اک اور غزل بھی
گر رنگ سخن میں سخن ایجاد کرے گا

106

گلشن میں وہ جا شکوۂ صیاد کرے گا صیاد قفس سے جسے آزاد کرے گا
مت حلق بریدہ سے مرے رہیو تو غافل قاتل یہی اک دن تری فریاد کرے گا
سو طرح سے مارا ہے جسے شوخ نے وہ شخص سوچے ہے کہ اب کیا ستم ایجاد کرے گا
رہنے کا نہیں خوں مرا پوشیدہ زمیں میں واللہ تہِ خاک بھی فریاد کرے گا
جاوے گا اگر باغ میں وہ سروِ خراماں مجرے کو دوتا قد وونہی شمشاد کرے گا
محشر میں گر آوے گا گنہگارِ محبت تو واں بھی قدم بوسیِ جلاد کرے گا
بیداد کو دیکھے گا اگر تیری تو گردوں ہرگز نہ کسی شخص پہ بیداد کرے گا
بالیں پہ مری عیسی مریم کو نہ لاؤ وہ خاک علاجِ دلِ ناشاد کرے گا

اے مصحفی استاد وہی ہووے گا آخر
جو میری طرح عزّتِ استاد کرے گا

107

نہیں ممکن کہ پڑے دم کی ہوا سے دھبّا　　محو ہے اس تنِ آئینہ صفا سے دھبّا
شست وشو کی بہت اس شوخ نے پر خوں کا مرے　　نہ چھُٹا گوشۂ دامانِ قبا سے دھبّا
چاندنی آج جو بے داغ نہیں مجلس میں　　کس کے پانو کی لگا تازہ حنا سے دھبّا
چاہتا ہے یہی اقبال تو کچھ عیب نہیں　　فرشِ شہ پہ جو پڑے پاے گدا سے دھبّا
خاک کے فرش پہ کیا ہستی وہمی کی نمود　　مٹ ہی جاوے گا یہ جاروب قضا سے دھبّا
کیونکہ کہیے کہ ہوا خشک مرا زخم اے واے　　ابھی پٹی میں تو پڑتا ہے دوا سے دھبّا
آستیں سے نہیں جانے کا یہ داغ جگری　　گو چھپاوے مرے خوں کا وہ حیا سے دھبّا
داغ پیشانیِ زاہد نہ گیا جیتے جی　　ساتھ لایا تھا یہ کیا ملکِ بقا[1] سے دھبّا
آصف الدولۂ مرحوم وہ تھا شستہ مزاج　ق　جس کے گلزار میں پڑتا تھا[2] صبا سے دھبّا
سنگِ حمام کی کیا اس کے صفا بتلاؤں　　جس پہ پڑتے ہوئے دیکھا کفِ پا سے دھبّا

مصحفی کیونکہ رکھوں اس سے طمع الفت کی
دل میں جس بت کے نہ ہو رنگِ وفا سے دھبّا

108

قصۂ دردِ غریبی کا سخن یاد رہا　　ہم کو غربت میں نہ آرامِ وطن یاد رہا
قلزمِ حسن میں اس کے دلِ مضطر کو مرے　　پیرتے وقت نہ گردابِ دہن یاد رہا
بادہ نوشوں نے بہت شیشہ و ساغر توڑے　　آخر اس صحبتِ بد کا بھی چلن یاد رہا
گور میں بھی رہے پامال انھوں کے ہم لوگ　　واں بھی ان کبک خراموں کا چلن یاد رہا
گات اک دن کہیں دیکھی تھی نہاتے اس کی　　نہ پڑی نیند ہی جب تک وہ بدن یاد رہا
تفرقے لاکھوں ہوئے اس پہ نہ ہم غافلوں کو　　سنگِ ظلمِ فلکِ شیشہ شکن یاد رہا

1۔ ل و ب : ملکِ فنا　　2۔ل : پڑتا ہے

جا کے ویرانے میں تقلید کروں گا میں اگر — رقص تیرا مجھے طاؤسِ چمن یاد رہا
بعد مردن میں گیا دل سے جہاں کے ایسا — نہ کفن چور کو بھی جس کا کفن یاد رہا
ہر بُنِ مُو سے مرے شعلۂ آتش نکلے — بے قراری میں نہ نالے کو دہن یاد رہا
بادیِ چشمۂ حیوان ہوئی راہِ ظلمت — خط سے مسّی کے ہمیں اس کا دہن یاد رہا
ہم صفیروں کو سنا دیں گے چمن میں جو ہمیں — نالۂ دردِ اسیرانِ کہن یاد رہا
گِھر گئے ہم تو شبِ مرگ کے اندھیارے میں — شبِ ہجراں کا کسے رنج و محن یاد رہا

مصحفی یاد فراموش[1] نہ بھولا اس کی
مرتے مرتے بھی اسے عشق کا فن یاد رہا

109

سختی میں دلِ یار تو پتھر نظر آیا — نے نامہ بر آیا، نہ کبوتر نظر آیا
پاس اس کے گیا دوریِ لیلیٰ میں جو مجنوں — ہر بید کا پتّا اسے خنجر نظر آیا
دامن کو جھٹک کر جو گیا اس کا تصور — ہر داغ مجھے سینے میں اخگر نظر آیا
مجھ ساتھ لگی تُو بھی تو کچھ کرنے کجی سی — تیرا بھی رخ اے بازیِ اختر نظر آیا
پانی جو پڑا تن پہ دمِ غسل کسی کے — وہ موے کمر رشتۂ گوہر نظر آیا
تھا مقتلِ مرداں بھی عجب بزم کہ جس میں — جز کاسۂ سر اور نہ ساغر نظر آیا
جیتے تو رہے عہد جدائی میں پہ ہم کو — ہر روز شبِ مرگ سے بدتر نظر آیا
جس دن سے بندھا کاکلِ مشکیں کا تصور — اک مارِ سیہ خواب میں اکثر نظر آیا
بے چین ہوا عشق میں کس گوہرِ تر کے — دریا کا جو پانی مجھے مضطر نظر آیا

شاید نہ اُٹھا مصحفیِ خستہ لحد سے
جو وہ نہ میانِ صفِ محشر نظر آیا

1۔ یاد فراموش: ایک کھیل جس میں دو دوستوں کے درمیان شرط ہوتی ہے۔ ایک دوست کوئی چیز دیتا ہے۔ لینے والا کہے "یاد ہے" تو وہ جیتا ورنہ دینے والا کہتا ہے "فراموش" اور وہ جیت جاتا ہے۔ ہارنے والے کو وہ چیز دوگنی کر کے لوٹانی ہوتی ہے۔

110

یہ نہ سمجھو کہ اسیری میں دم آساں توڑا
سر یہ پٹکا میں کہ آخر درِ زنداں توڑا

دلِ عاشق کو بیک جنبشِ مژگاں توڑا
حلبی آئینہ کیا شوخ نے آساں توڑا

حرمتِ کعبہ و بت خانہ میں کیونکر نہ کروں
مجھ سے جاتا ہے دلِ گبر و مسلماں توڑا

اس قدر حسن پہ مغرور نہ ہو یوسف مصر
نہیں اس جنس کا بازار میں چنداں توڑا

جسم خاکی کو بنانا تھا مرے تودۂ تیر
سنگِ تربت پہ عبث یار نے پیکاں توڑا

اس چمن سے کہ جہاں تیری نہ آواز آئی
میں نے اک گل بھی نہ اے مرغ خوش الحاں توڑا

نیشِ فتنہ کو کیا جس نے بہ نرمی نابود
اس نے گویا بہ نمد مار کا دنداں توڑا

آہ و نالہ سے زباں کو نہیں اک دم فرصت
تو نے کیا قہر یہ مجھ پر شبِ ہجراں توڑا

قوتِ حسن ہے قوت پہ بدن کی غالب
دستِ نازک نے ترے پنجۂ مرداں توڑا

دم ہی یاں ٹوٹ گیا اپنا جو واں شانے نے
بال زلفوں کا تری اے مہِ تاباں توڑا

بچھ گئے جھونک میں دامن کی ہزاروں تختے
تو نے کیا کیا شجر اے سروِ خراماں توڑا

چمنِ عشق میں کی دست درازی ہم نے
نخلِ خواہش سے گلِ حسرت و حرماں توڑا

مصحفی بادہ کشی سے نہ رہا جب کچھ کام
شیشہ خالی میں پٹک کر سرِ سنداں[1] توڑا

111

بروز حشر بھی تربت سے خندہ رو نہ اٹھا
گرا جو آنکھ سے تیری وہ پھر کبھو نہ اٹھا

گل آوے بہر کنیزی[2] تو اس سے بھی یہ کہے
تو میری فصد کا چل دور ہو، لہو نہ اٹھا

کمر کی تاب نہ لائی میانِ نازک یار
سرینِ نرم سے کافر کی بارِ مو نہ اٹھا

صفا کو دیکھ کے اس کی یہ ہو گیا بے خود
کہ آئینے کا تری پشت پا سے رو نہ اٹھا

1۔ سنداں = اہرن، نہائی 2۔ کنیزی = غالباً خدمت گاری، نرس کا کام

عذارِ مہر جو رنگِ شفق[1] سے گلگوں[2] ہے نماز صبح کو شاید وہ لالہ رو نہ اٹھا
بھٹکتی کس کی بلا جا کے دشتِ امکاں میں بھلا ہوا کہ مرا پائے جستجو نہ اٹھا
شبِ وصال سحر دوست دم غنیمت ہے ٹک اور بھی مرے زانو سے سر کو تو نہ اٹھا
ادا و ناز و نگاہ و حیا سے تیری صنم دیارِ حسن سے کب فتنہ چار سو نہ اٹھا
نسیم صبح یہ تحفہ وہاں پسند نہیں تو ساتھ اپنے بہار جناں سے بو نہ اٹھا
ترے ذبیح کا لذت کے مارے اے قاتل زمیں سے ساتھ ہی خنجر کے کب گلو نہ اٹھا
یہ رخ کا یار کے حیراں رہا میں وصل کی شب کہ تا بہ صبح تو شطرنج آرزو نہ اٹھا
ہوا نہ زخم جدائی کا التیام[3] اے وائے کہا تھا کس نے کہ تو زحمتِ رفو نہ اٹھا
جو بادہ مانگی میں ساقی سے ظرف قسمت میں تو اس کے ہاتھ سے شیشہ اٹھا سبو نہ اٹھا

کب اس کی بزم میں مذکورِ مصحفی آیا
کہ لے کے ہاتھ میں تیغہ وہ جنگ جو نہ اٹھا

112

جب بر میں ترے جامۂ چسپاں نہیں ہوتا صد چاک کبھی گل کا گریباں نہیں ہوتا
معیوب ہے کیا ابر میں بجلی کا چمکنا وہ لعلِ مسّی زیب جو خنداں نہیں ہوتا
کیا دست نگاریں کو ترے اشک کی پروا خواہانِ گہر پنجۂ مرجاں نہیں ہوتا
وہ درد دیا ہے مجھے اللہ نے میرے جس درد کا بقراط سے درماں نہیں ہوتا
ہے حکم جوانسے[4] کا مرے مزرعِ دل کو یہ کھیت ہرا موسمِ باراں نہیں ہوتا
کیا جان کا خواہاں ہے شبِ ہجر کا صدمہ آرام جو دل کو کسی عنواں نہیں ہوتا
محروم ہوں میں نکہتِ گل ہائے چمن سے وا روئے صبا پر درِ زنداں نہیں ہوتا
پرہیز ہے کیوں زخمیِ شمشیر کو تیرے کچھ حقۂ مرہم[5] تو نمکداں نہیں ہوتا

1۔ اصل: رشک، ل وب: اشک 2۔ل: ہے گلگوں 3۔التیام = زخم کا مندمل ہونا
4۔جوانسا = خودرو جھاڑی جو پانی کے بغیر بھی زندہ رہتی ہے 5۔حقۂ مرہم = مرہم کی ڈبیا

زاہد کو دکھاتے ہیں بتاں روے کتابی اس پر بھی یہ کافر تو مسلماں نہیں ہوتا
کب رنگِ حنا سے ترے اے دستِ نگاریں تاراج گلستاں کا گلستاں نہیں ہوتا
آتے نہیں کب حور و ملک پیٹتے، کس رات شیون بہ سرِ گورِ غریباں نہیں ہوتا
ہے کام مرا سینہ زنی، چہرہ خراشی اس ہاتھ سے کیا کیا شبِ ہجراں نہیں ہوتا
یہ ضبط کا عالم ہے مرے خوں میں کہ اس سے آلودہ کبھی یار کا پیکاں نہیں ہوتا
کشتے نے کہاں رتبۂ خود میر[1] کو پایا مردے پہ کبھی تیغ کا احساں نہیں ہوتا

جب بیٹھ گیا تھک کے یہی مصحفی بولا
طے مجھ سے محبت کا بیاباں نہیں ہوتا

113

میں وقتِ نزع روے اجل سے خجل ہوا چھاتی میں رک کے دم مری چھاتی کی سل ہوا
آخر بنا وہ مردمکِ دیدۂ سہیل جو نقطہ اس کے سیبِ زنخداں کا تل ہوا
رنگِ ثبات چہرے پہ اک گل کے یاں نہ تھا سروِ چمن چمن میں عبث پا بہ گل ہوا
مجنوں غبارِ رشک سے ماٹی میں مل گیا ناقے کے گرد باد بھی گر متصل ہوا
پہچان جب گیا مری نظروں سے وہ مجھے اس کے دو چار جا کے میں کتنا خجل ہوا
ممنوں کیا نہ اس نے کسی کا پس از وفات میرا چراغِ گور مرا داغِ دل ہوا
دکھلا رہا تھا لعلِ مسیِ زیب وہ مجھے ہونٹوں پہ دودِ آہ کا آنا مخل ہوا
پرسش ہر اک کے خون کی ہووے گی حشر میں عاشق کا خون تھا وہ کہ تجھ کو محل[2] ہوا

لکھی غزل اک اور بھی میں نے تو مصحفی
جس وقت میں بہ فکرِ سخن مشتغل[3] ہوا

1۔ خودمیر = جو اپنی موت مرے؟ 2۔ محل = حلال؟ 3۔ مشتغل = مصروف

114

بہزاد سے درست نہ جب ایک تل ہوا — تصویر اس کی کھینچ[1] کے کتنا خجل ہوا

کوتاہی نصیب نے چھلکا دیا اسے — جب جامِ مے لبوں کے مرے متصل ہوا

جھلکے ہے بر میں دانۂ انگور کی طرح — از بس گدازِ عشق سے دل مضمحل ہوا

کیا احتیاجِ سنگ ہے میرے مزار کو — جب داغ سینہ سوز ہی چھاتی کی سِل ہوا

آتی ہے اس کی وضع سے اک بوے دشمنی — کیا جانے کس کا دوست وہ پیماں گسل ہوا

اعجازِ خط نے رخ کا تماشا دکھا دیا — یہ شعلہ خار وخس میں نہ جب مشتعل ہوا

آئینہ تیرے حسن سے اے نو بہار حسن — رشکِ نگار خانۂ چین و چگل ہوا

بھاگے گی اس سے شوخیِ سیماب لاکھ کوس — جس وقت مضطرب مرے پہلو میں دل ہوا

زیبا غزل اک[2] اور لکھی میں نے مصحفی
جب عارضِ ورق پہ ہر اک نقطہ تل ہوا

115

تنہا نہ غنچہ دیکھ دہن منفعل ہوا — گل بھی تو تیرے رنگِ کفک سے خجل ہوا

کتنا میں روے برق سے یا رب خجل ہوا — رنگِ گل آشیاں میں مرے مشتعل ہوا

تفسیر[3] حسن لکھنے میں نامے میں عشق کے — گر اس سے کچھ خطا ہوئی تو میں خجل ہوا

آخر تو اس کا رنگ زمرد فریب تھا — سبزہ نہ کان کا یہ دلِ مضمحل ہوا

کوچے میں اس کے کل شبِ باراں کی سیر تھی — کوئی پھسل پڑا تو کوئی پا بہ گِل ہوا

افسوس جس پہ صورتِ شیریں کا نقش تھا — وہ سنگ کوہ کن کی نہ چھاتی کی سل ہوا

طبعِ غیور کا یوں ہی فرماں تھا مصحفی
اس ریختے میں شعر کوئی گر سجل[4] ہوا

1۔ ل : کھینچ بہت منفعل ہوا 2۔ل : اک اور بھی لکھی 3۔ل،ب: تقصیر حسن 4۔سجل = عمدہ

116

تلملانا میں دلِ یار کا دیکھا نہ سنا — حال ایسا کسی بیمار کا دیکھا نہ سنا

چشم و گوشِ فلکِ پیر نے اے جنس نفیس — کہیں یہ جوش خریداری کا دیکھا نہ سنا

تندی دم سے فلک کی کوئی ہم ڈرتے ہیں — کشتہ بندوق ہوا دار کا دیکھا نہ سنا

سامنے رخ کے ترے ہووے ہے پھولوں کا جو رنگ — یہ تماشا گل و گلزار کا دیکھا نہ سنا

دمِ شمشیر تلک اس کا پتا ملتا[1] تھا — پھر نشاں تیرے گنہگار کا دیکھا نہ سنا

گرچہ دیکھیں[2] میں زمانے میں بہت سی برسات — ساون اس دیدۂ خونبار کا دیکھا نہ سنا

جز دلِ خستہ کہ کاکل پہ تری عاشق ہے — آرزومند کوئی مار[3] کا دیکھا نہ سنا

درد عاشق کا وہ کیا سمجھے کبھی اس نے تو — ماجرا دیدۂ خونبار کا دیکھا نہ سنا

مصحفی کا مرضِ عشق نے کیا رنگ کیا
آدمی ہم نے اس آزار کا دیکھا نہ سنا

117

خوں مرا تیغ[4] تراہی سے نہیں اڑ سکتا — مرغ پر سست تناہی سے نہیں اڑ سکتا

تیرہ بختی نے مری تھام رکھا ہے مجھ کو — جیسے کافور سیاہی سے نہیں اڑ سکتا

گو ہو پرواز کا اسباب تنک[5] حوصلہ پاس — آب دریا پر ماہی سے نہیں اڑ سکتا

بال طاؤس ہو مہروں[6] سے جو کاغذ تو اڑے — ایک دو کی تو گواہی سے نہیں اڑ سکتا

دل کا سیماب ہے مجلس میں تری شعلہ طلب — تپشِ گرم نگاہی سے نہیں اڑ سکتا

صید دام گل محرم ہے مگر مرغ نگاہ — چمنِ سبزہ لاہی سے نہیں اڑ سکتا

اولِ شب سے بندھا ہے تری زلفوں کا خیال — یہ تصور دلِ واہی سے نہیں اڑ سکتا

طائرِ روح کو الفت ہے گل و برگ کے ساتھ — تب تو گلزار مناہی سے نہیں اڑ سکتا

1۔ ل، ب: ملتا ہے 2۔ل : دیکھی ہیں 3۔مار = سانپ 4۔تیغ تراہی = شہر تراہ کی بنی ہوئی تلوار جس کی کاٹ مشہور ہے۔ 5۔ل : تنگ 6۔ل : محضر

مصحفی ضعف نے تصویر بنایا ہے مجھے
رنگِ رخ فضلِ الٰہی سے نہیں اڑ سکتا

118

اگر ہمیں کسی شب روغن و چراغ ملا
تو تا صبح تماشے کو خانہ باغ ملا

بروزِ عید جو معشوق بافراغ ملا
تو ہم یہ سمجھے کہ ہم کو نشاط باغ ملا

سرشک خوں سے مری آستیں کو داغ ملا
سوادِ چشم کو لختِ جگر کا باغ ملا

قریب شمع کے جاتے تو اس کو دیکھا تھا
ولے نہ پھر ہمیں پروانے کا سراغ ملا

جبیں پہ پڑتی ہے چیں اس کی عطر کی بو سے
ملا جو یار بھی ہم کو تو بے دماغ ملا

ہزار زخم ہیں جس[1] میں وہ چار پارہ ہوں
نہ میرے داغ سے اے لالہ اپنا داغ ملا

مگر وہ آوے تھا مقتل سے کشتگاں کے ترے
کہ آج پنجہ بھرے خوں میں ہم کو زاغ ملا

لگی جو عالمِ مستی میں پشت دست اس کی
صراحی ٹوٹ گئی، خاک میں ایاغ ملا

ہزار کوہ و بیاباں کو میں کیا غربال
نہ مجھ کو خضر جنوں کا کہیں سراغ ملا

مسافرانہ لگا لیتے ہم بھی ایک ٹلّی[2]
کسی کا گرم نہ اس شہر میں اُجاَغ[3] ملا

ضعیفی میں بھی رہے مصحفی فدائے حسن
فراغ ہم نے نہ چاہا اگر فراغ ملا

119

بالشِ پر پہ نہ سر کو مرے آرام آیا
خواب آیا بھی تو اس کو تہِ صمصام آیا

ہم کو یاران عدم بھول گئے جاتے ہی
واں سے مدت ہوئی نے نامہ نہ پیغام آیا

میں نے نامے میں دعا اس کو جو لکھ کر بھیجی
در جواب اس کے وہاں[4] سے خطِ دشنام آیا

ساتھ قاصد کے نہ دو گام گیا اس کو تک
کام میرے نہ کبھی یہ دلِ ناکام آیا

1۔ ل، ب: اس میں وہ چار پارہ ہنوز 2۔ ٹلّی = تکیہ، روئی 3۔ اجاغ = چولھا 4۔ ل: ادھر سے

گوشِ ہر شخص میں کہتی ہے دمِ نزعِ اجل
باپ بیٹا نہ ترے آج کسی[1] کام آیا

بس تو مختار ہے جو چاہے کر اس کے حق میں
تیرے قابو میں جو اے گردشِ ایام آیا

کہیں کوٹھے پہ تجھے پھرتے ہوئے دیکھا تھا
ماہ اس رات سے ہرگز نہ لبِ بام آیا

مجھ سا خوش نغمہ نہ پھر ہاتھ لگا اس کے کبھی
بارہا باغ سے صیّاد تہی دام آیا

اٹھ کے بس پڑھنے لگا پھر وہ اسی کا کلمہ
خواب میں جس کے وہ غارت گرِ اسلام آیا

ضعف نے دی ہی نہ پینے کی دوا کے فرصت
رعشۂ دست سے لب تک نہ مرے جام آیا

مصحفی اتنا نہ قاصد کے لیے ہو بیتاب
جان لے صبح نہ آیا تو میاں شام آیا

ب

120☆

دیکھی ہے کس کی تیغ کی تحریرِ موجِ آب
کاغذ پہ بے قرار ہے تصویرِ موجِ آب

کاواک[2] کر دیا جگر اس کا تراش کر
ساحل سے پوچھ برشِ شمشیرِ موجِ آب

پلکوں نے راہ اشک کے آنے کی کھول دی
جب ہو سکی نہ ان سے بھی تدبیرِ موجِ آب

ہے پیچ و تاب لازم دریاے زندگی
مٹتی نہیں مٹائے سے تقدیرِ موجِ آب

لاکھوں ہی گھر حباب کے برباد کر دیے
اک خس بھی ہو سکا نہ گلوگیرِ موجِ آب

دریا کے کچھ قدم میں تامل نہیں ولے
حجت حدوث کی ہے یہ تفسیرِ[3] موجِ آب

کیا ان سے ہو سکے جو ملائم ہیں وضع کے
روکے نہ ایک خس کو بھی زنجیرِ موجِ آب

مثلِ حباب کان رکھے تو تو بے خبر
ہے زمزمہ مہین سا تقریرِ موجِ آب

1۔ ل، ب: کوئی ☆ ل (نسخۂ لکھنو) میں ردیف ب کے آغاز میں لکھا ہے: "آغاز ردیف الباکہ در ردیف ہذا ہفت غزل است"۔ 2۔ کاواک = کھوکھلا 3۔ل : تعبیر (ایک مفہوم اس سے بھی برآمد ہوتا ہے۔

حیراں ہوں میں کہ بحر میں ہستی کے مصحفی
بن بن کے کیوں بگڑتی ہے تعمیرِ موجِ آب

121

نہ ہوا ہو کہیں خط دیکھ کے دلبر بیتاب — اس کے کوچے سے جو آتا ہے کبوتر بیتاب
بے قراری نے مجھے دل کی شبِ ہجراں میں — مثلِ سیماب رکھا بر سرِ بستر بیتاب
خون کم کرنے کو سودائِ مژگاں کا ترے — دستِ فصّاد میں جوں برق ہے نشتر بیتاب
یہ بگولا نہیں جاتا ہے جو رقصاں سوئے نجد — اشتیاقِ سرِ مجنوں میں ہے افسر بیتاب
آتشِ عشق میں رستم کو نہیں تابِ ثبات[1] — یہ وہ آتش ہے کہ ہو جس میں سمندر بیتاب
کھل گئے سینکڑوں عقدے دلِ سودائی پر — کبھی آئی جو نظر زلفِ معنبر بیتاب
اُربسی[2] ہے جو یہ الماس کی چھاتی پہ تری — شوق میں اس کے ہے صد دیدۂ اختر بیتاب
اپنے قاتل کے تجسّس میں ترے کشتے کے — خوں کے قطرے ہیں بروئے دمِ خنجر بیتاب
طور سب جل کے جس آتش سے ہوا تھا سرمہ — اب تک اس کے لیے ہیں طور کے پتھر بیتاب

مصحفی دیکھ کے اس آتشِ سوزاں کا جمال
دل ہوا مثلِ سپندِ سرِ مجمر بے تاب

122

آہ پھر مجھ کو کیا یار نے چھپ کر بیتاب — روئے خوش دیدہ بلے[3] ہووے ہے اکثر بیتاب
آوے کس طرح اسے نیند شبِ ہجراں میں — آہ کرتی ہو جسے چشمکِ اختر بیتاب
شہد لب کا جو ترے عکس پڑے اس میں تو ہوں — صورتِ مورچہ آئینے کے جوہر بیتاب
ہوسِ قتل میں عاشق کے سدا رہتے ہیں — نازنینوں کے کف و بازو و خنجر بیتاب
مے سے اس بزم میں محروم نہ رہ جائے کوئی — اتنی خاطر ہیں مہ و خور کے دو[4] ساغر بیتاب

1۔ ل : اثبات　2۔ اربسی = گلے کا ایک زیور　3۔ بلے = ہاں　4۔ ل : وہ

اس نے جب آئینہ توڑا تو پھری ساتھ اس کے　داد خواہی کے لیے روحِ سکندر بیتاب
غوطہ جب اس نے لگایا تو وونہی موج کی طرح　بدگمانی سے ہوئے لاکھ شناور بیتاب
تا نہ قیفال[1] کھلے اس کی اسے چین نہ ہو　برق کا بہرِ رگِ ابر ہے نشتر بیتاب
مصحفی جب سے نظر آئی ہے پازیب اس کی
صدفِ چشم میں ہیں اشک کے گوہر بیتاب

123

سر سے عاشق کے جدا سایۂ دیوار ہے کب　جو کہ دیوانہ پری کا ہے وہ بے یار ہے کب
تیرے کوچے سے تو البتہ میں اٹھ جاتا لیک　پانو کہتے ہیں ہمیں طاقتِ رفتار ہے کب
زیرِ بال اپنے میں کرتا ہے وہ گلگشتِ چمن　باغباں کو خبرِ مرغِ گرفتار ہے کب
یارِ ہمسایہ کا ہم دید اُڑاتے ہیں مدام　مانعِ مدِ نظر بیچ کی دیوار ہے کب
میں نہ مانوں گا اگر عابد و زاہد یہ کہیں　اچھی صورت کی ہمیں خواہشِ دیدار ہے کب
آنکھیں ہنستی ہیں کسی وقت جو دل کہتا ہے　صورتِ خوب سے اب مجھ کو سروکار ہے کب
عشق[2] مفہوم ہے رسوائی کا اب عالم میں　ہر کوئی کشتۂ معشوقِ حیادار ہے کب
ظلم ہے دل پہ مرے تہمتِ شادی رکھنا　نیم واشد کا بھی یہ غنچہ گنہگار ہے کب
تم چلے آؤ اندھیرے میں تو کچھ دور نہیں　دولتِ وصل کی مانع یہ شبِ تار ہے کب
مصحفی اس سے نہ ملنے کا سبب کچھ تو بتا
آپ ہی بیزار ہے تو، تجھ سے وہ بیزار ہے کب

124

قفسِ تنگ کی ہم کو تو ہوا ہے مرغوب　نہ چمن اور نہ نسیم اور نہ صبا ہے مرغوب
کیوں نہ شب باش گلستاں میں رہوں میں کہ مجھے　غنچۂ گل کے چٹکنے کی صدا ہے مرغوب

1۔ قیفال = فصد　2۔ل، ب: عشق رسوائی کا مفہوم ہے اب عالم میں

بے سبب دل نہیں کھنچتا تری زلفوں کی طرف　　اس خم و پیچ میں کوئی تو ادا ہے مرغوب
طیش میں آ کے جو رکھا ہے کبھی قبضے پر　　ہاتھ اس وقت بھی قاتل کا لگا ہے مرغوب
پنکھڑی گل کی نزاکت نہیں پاتی اس کی　　تب تو مجھ کو وہ حنائے کفِ پا ہے مرغوب
کون کرتا ہے علاجِ دلِ حرماں زدہ آہ　　درد ہی درد ہے یاں کس کو دوا ہے مرغوب
ایک دم سینے میں میرے وہ ٹھہرتا ہی نہیں　　چرخِ اخضر کی جو نالے کو فضا ہے مرغوب
آئینہ ہاتھ سے چھٹتا ہی نہیں یک ساعت　　کچھ تو تیری بھی طبیعت کو ہوا ہے مرغوب
بحرِ ہستی میں ٹھہرتے نہیں مانندِ حباب　　ہم کو کتنا سفرِ ملکِ فنا ہے مرغوب
آشیاں اپنا بناتا ہی نہیں ہے وہ کہیں　　اسی باعث مجھے تجرید[1] ہما ہے مرغوب
خوب رو رکھتے ہیں آئینے سے جو اکثر کام　　ان کو کیا دوستیِ اہلِ صفا ہے مرغوب

مصحفی گر تو سنے باغ میں جا کر گاہے
نالۂ بلبلِ بے برگ و نوا ہے مرغوب

125

ہو کیوں نہ بوئے گل مری آہنگ عندلیب　　غنچے سے بھی قفس ہے مرا تنگ عندلیب
نازک دماغ مجھ سا چمن میں کوئی نہیں　　لگتی ہے مجھ کو نکہتِ گل سنگ عندلیب
اک دن جلا رہے گی اسے برقِ رنگِ گل　　کہتا ہے آشیاں کا ترے ڈھنگ عندلیب
طاقت نے جب جواب دیا چل کے رہ گئی　　دنبال بوئے گل کئی فرسنگ عندلیب
اب چاہیے ترا پسِ دیوار آشیاں　　تو ہو گئی ہے باغ کی کچھ ننگ عندلیب
سوسن زباں دراز ہے اور تو بھی ہرزہ[2] گو　　ڈرتا ہوں تیری اس کی نہ ہو جنگ عندلیب
تصویرِ تازہ گل کی کوئی انتخاب کر　　صحنِ چمن ہے صفحۂ ارژنگ[3] عندلیب
صیقل گری بتائی ہے کس نے تجھے بتا　　نالے سے دل کا چھیلے ہے تو زنگ عندلیب

1۔ تجرید = تنِ تنہا زندگی گزارنا　　2۔ ہرزہ گو = بیہودہ گو　　3۔ ارژنگ = چینی مصور مانی کا مرقع

یہ شعر مصحفی جو میں کل باغ میں پڑھے
سن کر مری غزل کو ہوئی دنگ عندلیب

126

وہ چہچہے، نہ وہ تری آہنگ عندلیب — کس گل کی یاد میں ہے تو دل تنگ عندلیب
بیدادِ باغباں سے، جو میں سیر باغ کی — لاکھوں دبی پڑی تھیں تہِ سنگ عندلیب
اب برگ گل بھی چھینے ہے دستِ نسیم سے — آگے تو اس قدر نہ تھی سرہنگ[1] عندلیب
کیا ظلم ہے کہ تو ہے اسیر اور باغ میں — کلیاں نکالتی ہیں نئے رنگ عندلیب
تجھ کو اسیر گردشِ ایام نے کیا — چوبِ قفس سے کرتی ہے کیوں جنگ عندلیب
گر شاخ گل میں ہو کمرِ یار کی لچک — اس سے اڑے نہ کھاوے اگر سنگ عندلیب
جاتا ہوں گر چمن میں تو رکھ رکھ کے کان کو — نالے کا مجھ سے سیکھتی ہے ڈھنگ عندلیب
واللہ بھول جاوے تو سب اپنے چہچہے — گر باغ میں ہو وہ صنمِ شنگ[2] عندلیب

آ کر چمن میں مصحفی خستہ کیا کرے
اب سیرِ گل کو سمجھے ہے یہ ننگ عندلیب

127

لیکھے[3] کی یاں بہی[4] نہ زر و مال کی کتاب — ہے اپنے حق میں واشدِ دل فال کی کتاب
بلبل کا زیرِ بال نہ بے جا سمجھ تو ہے — اس کے مطالعے میں پر و بال کی کتاب
مذکور زلف ہے مرے دیواں میں سر بسر — ہر صفحہ اس کا کیوں نہ بنے جاں کی کتاب
فرصت ملی تو خامۂ بالِ تدرو سے — عاشق ترے لکھیں گے تری چال کی کتاب
جز یسفک الدما کی آیہ نہ وہ پڑھے — قرآں ہو گرچہ اس بتِ قتال کی کتاب
شکل عروس چھٹ نہ خوش آوے مجھے کبھی — رکھ دیں جو میرے سامنے اشکال کی کتاب

1۔ سرہنگ = سرکش، کوتوال 2۔شنگ = شوخ، خوبصورت 3۔لیکھا = حساب کتاب 4۔بہی = کھاتا

دیکھے جو غور سے کوئی دیواں مرے تو ہاں ہر بیت ہے زمانے کے احوال کی کتاب

شرمِ گنہ سے آب ہوا گرچہ میں ولے دھوئی گئی نہ نامۂ اعمال کی کتاب

پایا نہ سعد و نحس سے کوئی ورق تہی تاروں کی میں نے خوب جو غربال[1] کی کتاب

کس طرح روز حشر وہ ہوویں گے سرخرو دیکھا کیے ہیں یاں جو خط و خال کی کتاب

اس دہر میں بلندیِ اذہان کند سے ق میں گرچہ جانتا تھا انھیں فال کی کتاب

ہر جلد مصحفی ترے دیوان کی ولے
نقطوں سے شک کے بن گئی رمّال کی کتاب

128

کٹنی گو کہ تُو ہے پر ابھی جلاّد سے چھپ چند روزے تو ذرا اُس ستم ایجاد سے چھپ

اس نے گھر دیکھ لیا تیرا شبِ ہجراں میں اے اثر اب تو نہ عاشق کی تو فریاد سے چھپ

چاہ پر اس کی نظر کر ابھی مرجاوے گا بے مروت نہ بہت عاشقِ ناشاد سے چھپ

تیری تصویر وہ نظروں ہی میں لیویں نہ اُتار پردہ تو ہم سے نہ کر، مانی و بہزاد سے چھپ

تو نے اے عشق یہ کیا پردہ دری کی ظالم نہ کہا اتنا بھی شیریں کو کہ فرہاد سے چھپ

مرگ کی دیکھتے ہی شکل گئے بھاگ حواس لڑکے جوں کھیلتے میں جاتے ہیں استاد سے چھپ

حورِ جنت کو ہے نظارے کی اس کے خواہش اے پری تُو تو نہ اس طفلِ پری زاد سے چھپ

روح آخر پڑے گا کام اجل سے تجھ کو اے عروس اتنا بھی[2] پردے میں نہ داماد سے چھپ

حسن کی شرم یہ کہتی ہے اسے موسمِ فصد مردِ فصّاد[3] کو کیا تو زنِ فصّاد سے چھپ

جب سے دیکھا ہے صنم قد کو ترے قمری نے ہو کے کچھ جی میں خجل جاتی ہے شمشاد سے چھپ

1۔ غربال کرنا = چھاننا (غربال = چھلنی) 2۔ ل : ہر وقت نہ 3۔ ل : فساد

آشیاں جس کا ہو بالائے درختِ بے برگ کیونکہ وہ مرغ رہے دیدۂ صیّاد سے چُھپ

مصحفی تھا اسے کس شوخ کے مژگاں کا خیال
دل جو پہلو میں رہا خنجرِ فولاد سے چُھپ

ت ☆

129

کیا کھلا تھا باغ میں شب نافۂ گیسوے دوست نکہتِ گل سے مجھے آتی ہے ہر دم بوے دوست

جا جو اک دن مل گئی پہلو میں، شوخی دیکھیو چٹکیاں لے لے میں نیلا کر دیا پہلوے[1] دوست

میں تو جاتا ہوں طرف کعبے کے پر کافر یہ پانو دیر کے رستے لیے جاتے ہیں مجھ کو سوے دوست

ہاتھ میں یوسف کے ہوتا جس گھڑی تیغ و ترنج پھر تماشا تھا جو اٹھ جاتا نقابِ روے دوست

سرخ ڈورے کو کیا ہے کس لیے زیبِ پلک خون کی کس کے ہے پیاسی نرگس جادوے دوست

رشک آتا ہو جسے پہلو کے تکیے سے مدام غیر کو کس طرح سے[2] دیکھے وہ ہم پہلوے دوست

کس طرح طے ہووے منزل آبلے پانو میں ہیں اور دمِ شمشیر سے نازک ہے راہِ کوے دوست

سامنے اس کے تنفّس کی نہیں پاتے مجال گل سے بھی نازک نظر آتی ہے از بس خوے دوست

بدگمانی نے مجھے کیا کیا ستایا کیا کہوں صبح کو بکھرے ہوئے دیکھے تھے اک دن موے دوست

باندھ دیتا میں تو نقدِ دل کو ہنگامِ سفر نازکی مانع ہوئی، خالی رہا بازوے دوست

دل کو سینے سے مرے کھینچے لیے جاتا ہے آہ کم نہیں قلّابِ[3] ماہی سے خمِ ابروے دوست

مصحفی غفلت نے از بس دور رکھا ہے ہمیں
دوست کے پہلو میں ہم کرتے ہیں جستجوے دوست

☆ ل : آغاز ردیف التا کہ در ردیف ہذا ہشت غزل است 1۔ ب: زانوے دوست

2۔ ل : پھر 3۔ قلابِ ماہی = مچھلی پکڑنے کا کانٹا

130

اپنے دل کی طرح ہوتے ہیں یہ ہرجائی بہت
ہم نے دیکھی عشق میں خوباں کی رسوائی بہت

ایک نے میری سفارش کی تو اس نے[1] یوں کہا
پھرتے ہیں گلیوں میں ایسے مرد سودائی بہت

ناقہ راں نے ایک دم وقفہ نہ خاطر سے کیا
دور[2] تک چلّا رہا مجنونِ صحرائی بہت

دم بدم رہتا ہے جو پیشِ نظر ہی آئینہ
ہے مزاجِ یار کچھ محوِ خود آرائی بہت

کل گیا تھا کشتہ تیری چشم کا گلشن کی سمت
نرگسِ شہلا نے اس کو آنکھ دکھلائی بہت

دل کو خلوت ہے کسی کی چاہ سے سینے کے بیچ
جو پسند آتا ہے مجھ کو کنجِ تنہائی بہت

کیا کروں اے ہم نشیں باقی نہیں اب اختیار
کر چکا میں ناتواں صبر و شکیبائی بہت

مصحفی کس التفاتِ خام پر بھولا ہے تُو
تیری کیا پروا اسے، ہیں تجھ سے ہرجائی بہت

131

شکوے ہیں مجھ کو اس بتِ مغرور سے بہت
گھورا کرے ہے دیکھ مجھے دور سے بہت

مجھ پر ہی تیغِ ناز نہیں اس نے تیز کی
مارے گئے ہیں یاں اسی دستور سے بہت

آوازِ لن ترانی سے موسیٰ نہ[3] چپ ہوئے
ایسی صدائیں آتی رہیں طور سے بہت

کھلتا ہے کس پہ خاک کے دخمے[4] کا ماجرا
مدفوں ہیں اس میں قیصر و فغفور[5] سے بہت

راضی ہوا نہ اس پہ مزاجِ غیورِ حسن
تشبیہ دے رہا میں اسے حور سے بہت

کیا یہ فروغِ صبح ہے، کوئی اٹھ کے دیکھیو
پروانہ مضطرب ہے جو اس نور سے بہت

اکٹھے ہوئے ہیں جب دلِ سوزاں کے آبلے
لٹکا کیے ہیں خوشۂ انگور سے بہت

ڈرتا ہوں میں کہ اس کا تصور نکل نہ جائے
روزن ہیں دل میں خانۂ زنبور سے بہت

1۔ ل،ب : اس سے 2۔اصل : دیر تک 3۔ل : نہ چپ رہا 4۔ دخمہ = مردہ خانہ
5۔ قیصر، فغفور = بادشاہوں کے خطاب

ہرگز ہوا نہ وہ ہی طرف اس کی ملتفت نرگس الجھ رہی ترے مخمور سے بہت
کروٹ بھی اس کو ضعف سے لینا محال ہے طاقت گئی ہے اب دلِ رنجور سے بہت
دامن تمام لالہ ستاں ہو گیا مرا از بسکہ خوں گرا مرے ناسور سے بہت
تیغِ جفائے چرخ رہی ہے سدا علم سولی پہ اس نے کھینچے ہیں منصور سے بہت
کیوں داغِ دل پہ اپنے رکھوں اس کو ہم نشیں نفرت ہے مجھ کو مرہمِ کافور سے بہت
کیوں لکھوٴ نہ ثانیِ طہراں ہو مصحفی
ملتی ہے گفتگو تری شاپور سے بہت

132

جی[1] میں کبھی ہوئی ہے اک نازنیں کی صورت کیونکر خوش آوے مجھ کو پھر نقش چیں کی صورت
مت دیکھ دیکھ اس کو ہو جی میں شاد ناداں تصویر ہے دو چشمی دنیا و دیں کی صورت
گریے کا رنگ اپنے کس طرح ہم چھپاویں دامن کا حال وہ کچھ، یہ آستیں کی صورت
مضطر ترے کھڑے تھے جس جا الٹ گئی وہ پہچاننے میں آوے کیونکر زمیں کی صورت
رویا ہے خون کوئی شاید چمن میں اس کی لالے سے مل گئی ہے جو یاسمیں کی صورت
کل طیش میں ہوا تھا اس کا جو لال چہرہ شمشیر خوں چکاں تھی چینِ جبیں کی صورت
خوباں کی چشم میں بھی یہ لطف کم ہے پنہاں کب پیار سے ہے خالی چینِ جبیں کی صورت
جتنے کہ رو سیہ ہوں ہنگام سجدہ، ہم کو ملتی ہے روسپیدی نقشِ نگیں کی صورت
تھی شمعِ حسن اس کی از بس کہ برقِ[2] خاطف مجنوں نے بھی نہ دیکھی محمل نشیں کی صورت
احوال مصحفی کا کیا پوچھتے ہو یارو
ہے خود زبان گویا اندوہ گیں کی صورت

1۔ یہ غزل نسخہ لکھنؤ سے اضافہ 2۔ خاطف = سیماب صفت

133

کچھ اس روش سے ہوئی دل کو بے قراری رات | کہ گھر میں پینترے بدلا کیا میں ساری رات
وداعِ گل کا جو عالم چمن میں شام سے تھا | عیاں تھی دیدۂ نرگس سے اشکباری رات
زمیں پہ طائرِ بسمل کی طرح یہ تڑپا | کہ خار وخس سے اٹھائے میں زخم کاری رات
فسانہ گو کی کہانی سے جب نہ آئی نیند | بلا کے اس نے سنی داستاں ہماری رات
کہ کس کی جنبشِ ابرو کا تھا خیال مجھے | چلا رہی تھی ہر اک سانس دل پہ آری رات
مسیح بیٹھ کے بالیں پہ اس کی رویا خوب | کہ تھی مریضِ محبت کو دم شماری رات
شبِ وصال کسی کی تو تھی، جو تھے خاموش | خروسِ صبح سے تا بلبلِ بہاری رات
فغاں[1] کہ برق سی سینے پہ میرے لوٹا کی | کسی کے دامنِ زیبندہ کی کناری رات
گلے پر اپنے جو رکھا تو ایک رگ نہ کٹی | میں دیکھ لی ترے خنجر کی آبداری رات
سحر تلک نہ پڑا چین اور نہ نیند آئی | دلِ حزیں کو یہ رٹ لگ گئی تمھاری رات
کسی کی بات کچھ، اے مصحفی جو یاد آئی ق | کیا اگرچہ بہت ضبط آہ و زاری رات

قلق میں پر مری آنکھوں سے گر پڑے آنسو
کہ منع گریہ نہ تھا امر اختیاری رات

134

مریضِ عشق کو جو تھی نفس شماری رات | کرے تھی شمع کھڑی سر پہ اس کے زاری رات
نہ تم نے سوتے سے میری طرف کو کروٹ لی | یہ صبح تک رہی مجھ کو امیدواری رات
قلق ہے آج بہت دل کو، واں ہوئی ہے مگر | کسی سے عہدِ محبت کی استواری رات
رقیب نے مجھے کیا کیا کہا نہ مجلس میں | میں کر گیا تری خاطر سے بردباری رات
ہزار بار میں صدقے گیا فلک کے و لے | دکھائی وصل کی اس نے نہ ایک باری رات

1۔ اس غزل کے آخری پانچ شعر اور آگے کے پانچ غزلیں نسخۂ لکھنو سے اضافہ

میں دردمند تھا ایسا کہ تا بہ صبح رہی　　مزاجِ چرخ کو نالے کی ناگواری رات
نسیم مضطرب الحال جائے تھی پیچھے　　یہ کس پری کی گئی باغ سے سواری رات
دو چار تھا جو خیال اس کا مصحفی میرے
میں جھیلے جنبشِ مژگاں سے زخم کاری رات

ٹ

135

لگی یہ غم کی دل و جانِ بافراغ کو چوٹ　　کہ سانس لینے سے لگنے لگی دماغ کو چوٹ
ہو کیوں نہ اس کی بھلا ساکنانِ باغ کو چوٹ　　جب آبشار سے لگتی ہو یاں دماغ کو چوٹ
ایاغ سر سے مرے مارتا ہے تو ساقی　　مجھے یہ ڈر ہے نہ الٹی لگے ایاغ کو چوٹ
کوئی نہ سنگِ ملامت لگاؤ مجنوں کو　　لگے ہے اس سے دلِ آہوانِ راغ کو چوٹ
یہ پارسال کے صدمے کا ہے بہار میں غم　　کرے ابھر کے ہرا پھر نہ دل کے داغ کو چوٹ
زبس کہ مامنِ[1] روشن دلاں ہے مے خانہ　　گرے چراغ تو آوے نہ واں چراغ کو چوٹ
یہ سنگلاخ ہے کچھ راہِ کعبۂ مقصود　　کہ ہر قدم پہ لگے ہے سُمِ الاغ کو چوٹ
یہ گیند بازی کو آیا تھا کون گلشن میں　　لگے ہے جس کی دلِ لالہ ہائے باغ کو چوٹ
یہ کون آنکھوں کے آگے سے ہو گیا پنہاں　　جو دے گیا دل خو کردۂ سراغ کو چوٹ
رکھا اب نشیدِ[2] غزل مصحفی وہ جس سے لگے
چمن میں نغمۂ طوطی و بانگِ زاغ[3] کو چوٹ

136

لگی یہ ژالے سے ہر اک نہالِ باغ کو چوٹ　　کہ لالہ سینکے ہے دل پر سمجھ کے داغ کو چوٹ

1۔ مامن = جائے امن　　2۔ نشید = آوازِ بلند　　3۔ زاغ = کوّا

خدا کرے تو کسی سنگدل پر عاشق ہو
لگے ترے بھی دل و جانِ بافراغ کو چوٹ

ہمیشہ کی مرے نالے نے برق اندازی
شبِ فراق کی لیکن لگی نہ زاغ کو چوٹ

لگاویں اپنے ہی پھر سنگ کودکاں مجنوں
دکھاوے دل کی گران صاحبانِ لاغ[1] کو چوٹ

محافہ لیلیٰ کا لاؤ کہ اترے محمل سے
صدائے زنگ[2] سے لگتی ہے یاں دماغ کو چوٹ

یہ تیرے عہد میں ایمن ہے دستِ جور سے خلق
کہ آستیں سے نہیں لگتی اب چراغ کو چوٹ

تجھی کو پھینک کا ہے شوق اور میں ڈرتا ہوں
لگے نہ تیرے تنِ نارسیدہ داغ کو چوٹ

وہ اک گلی میں کرے جب کہ سرکشی اس سے
لگے نہ پشتکِ تازی[3] سے کیوں الاغ[4] کو چوٹ

شکست پہنچے ہے مستوں کے شیشۂ دل کو
حبابِ مے کی بھی لگتی ہے گر ایاغ کو چوٹ

بس اب خموش رہ اے مصحفی کہ لگتی ہے
فغاں سے تیری دلِ طائرانِ باغ کو چوٹ

137

نشاں نہیں پرِ طاؤس پر یہ رنگا رنگ
لگی ہے گیندوں کی اس گل کے داغ داغ کو چوٹ

جریب اس کی نہ جاوے ہزار سال تلک
اگر زمانہ بہر گام دے الاغ کو چوٹ

اگر ہو دستِ حمایت ترا پناہ اس کی
لگے نہ سیلیِ صرصر سے پھر چراغ کو چوٹ

قفائے ناقہ گرا قیس جس پہ گھبرا کر
نہ آوے یوں کسی وارفتۂ سراغ کو چوٹ

ہر اک کے گھر میں پہنچتا تھا جس سے خوانِ مراد
نظر کی لگ گئی اس گھر کے کیوں اجاغ کو چوٹ

عبث سحاب میں رنجک[5] اڑاوے ہے بجلی
اجل کی لگتی ہے اس باغ میں کلاغ کی چوٹ

میں کیونکہ منکرِ غم ہوں کہ مصحفی میرے
اچٹتی سی تو لگی ہے دلِ فراغ کو چوٹ

1۔ لاغ = کھیل کود　2۔صدائے زنگ = گھنٹی کی آواز　3۔پشتکِ تازی = گھوڑے کی پاچھی
4۔الاغ = گھوڑا　5 رنجک اڑانا = گولی چلانے کے لیے بارود میں آگ لگانا

ث ٭

138

تودے پہ جب کمان سے اس نے لگائی لیٹ ‏ غرق اس قدر ہوئی کہ جو ڈھونڈی نہ پائی لیٹ

آہن رکاں فلک پہ نہ پرواز کر سکیں ‏ پاوے کبھی نہ رتبہٗ تیرِ ہوائی لیٹ

ترکش میں اس نے رکھ لی وہ از بہر یادگار ‏ عاشق کے خون سے جو ہوئی تھی حنائی لیٹ

سدِ سکندری سے گزر جائے توڑ کر ‏ دکھلاوے اس کی شصت کی جس جا صفائی لیٹ

آنکھوں نے تیری سرمہٗ دنبالہ دار سے ‏ عاشق کے دل کے واسطے شاید بنائی لیٹ

عاشق کشی میں اس نے کمی کی ہے کس جگہ ‏ دنبالہ تک تو خوں میں ہے اس کے نہائی لیٹ

کس کوہِ غم کا توڑ ہے منظور مصحفی
تیروں کی قسم سے جو پسند اس کو آئی لیٹ

139

یاں نہ روبہ کی اور نہ شیر کی بحث ‏ رات دن ہے یہی بٹیر کی بحث

پیش آوے ہے مدرسے میں ہمیں ‏ گہہ زبر کی تو گاہ زیر کی بحث

نہیں پایاں پذیر دور فلک ‏ ہے جو آپس میں زود دیر کی بحث

ہے یہاں قصہٗ تسلسل دور ‏ زہِ دامن کی اور نہ گھیر کی بحث

رقص دیکھ اس کا اور کر رکھ یاد
مصحفی تو بھی ایر پھیر کی بحث

140

نزع کے وقت ہوا تو[1] بھی گلوگیر عبث ‏ مجھ کو مانی نے دکھائی تری تصویر عبث

1۔ ل،ب: عشق

جانتا ہے کہ یہ گلزار نہیں جاے نشاط　ہے تبسم کی لب و غنچے پہ تحریر عبث
سخت جانی تو مجھے دے چکی آگے ہی جواب　یار نے سان پہ رکھوائی ہے شمشیر عبث
چین پاوے گا نہ ظالم تو جلا کر مجھ کو　نالۂ سوختگاں کی نہیں تاثیر عبث
دیکھ کر قیس کو لیلیٰ نے قفاے ناقہ　یہ کہا جان پہ کھیلا ہے یہ رہ گیر عبث
عاقبت زیر زمیں خانۂ ہر منعم ہے　اتنی اونچی جو بناتے ہیں یہ تعمیر عبث
مجرم عشق کوئی عشق سے باز آتا ہے　دیتی ہیں ہجر کی راتیں اسے تعذیر عبث

غم چھپائے سے بھلا[1] مصحفی کب چھپتا ہے
آپ کرتے ہیں مرے سامنے تقریر عبث

ج ☆

141

کرے نہ آہ مری کیونکہ شعلہ باری آج　ہے کل سے سخت مرے دل کو بے قراری آج
ثواب قتل کو پہنچے گناہ گار تمام　دلا تو خوش ہو کہ آئی ہے تیری باری آج
ہجومِ خلق ہے تابوت میں وہ جاتی ہے　دکھاؤ قیس کو لیلیٰ کی یہ سواری آج
الٰہی کس سے لڑائی ہے اس جفا جو کو　جو ہو رہی ہے سلاخوں کی آبداری آج
مگر ہوئے ہیں وہاں جمع کتنے فریادی　زیادہ ہے ترے کوچے میں شور و زاری آج
ہماری جان کے دشمن کو لائے نزع کے دم　کوئی تو اتنی کرے ہم سے دوست داری آج

مگر تو رات کو رویا ہے مصحفی کر شور
چھپا نہ ہم سے، ہے آواز تیری بھاری آج

1۔ ل : میاں مصحفی　☆ ل: آغاز ردیف الجیم کہ در ردیف ہذا پنج غزل است۔

142

تزک سے نکلی ہے اس شوخ کی سواری آج
نثار ہو جیے ہے روزِ جاں نثاری آج

نشاطِ وصل نہ روزِ دگر پہ رکھ موقوف
تو میرے کام کو کر اے امیدواری آج

خبر ہے شرط کہ پیارے قریب پہنچا ہے
مریضِ غم کا ترے وقتِ دم شماری آج

خرام ناز سے کر قتل کس کو آئے ہو
بھری ہے خون سے دامن کی جو کناری آج

وداعِ گل کی مگر صبح ہے گلستاں میں
کرے ہے اوس جو شدت سے اشکباری آج

نپٹ ہجومِ قلق ہے نکل ہی جا اے دم
ہم آگئے ہیں بہت زندگی سے عاری آج

خرابی اصل میں روزِ ازل سے ہے اس کی
بنائے عمر کی کیا ہووے استواری آج

اٹھائے دشت کو منھ جاوے ہے چلا ناقہ
نہ سو گئی ہو کہیں صاحبِ عماری آج

ضعیف اتنا ہوا ہوں میں مصحفی غم سے
کہ مجھ پہ اشک مرا کھینچے ہے کٹاری آج

143

ہے روزِ عید نہ نکلا اگر وہ گھر سے آج
لہو بہاؤں گا میں اپنی چشمِ تر سے آج

مرض ہے صعب[1] بھروسا نہیں مجھے کل کا
جو کچھ کہ کہنا ہے کہہ لوں میں نامہ بر سے آج

چمن میں آنے کی اس گل کے ہے خبر شاید
جو مضطرب سی ہے بادِ صبا سحر سے آج

سرشکِ چشم میں رنگ دگر جھمکتا ہے
جدا ہوا کوئی ٹکڑا مگر جگر سے آج

مگر بہار گلستاں سے ہوگئی رخصت
دھواں سا اٹھتا ہے بلبل کے بال و پر سے آج

پڑا رہے تھا ہمیشہ جو مثلِ نقشِ قدم
جنازہ اُٹھتا ہے اس کا ہی اس کے در سے آج

مگر وہ داد رسِ عاصیاں سوار ہوا
فغاں بلند ہے ہر ایک رہ گزر سے آج

شبِ فراق[2] یہ کیسی ہے جو نہیں ہوتا
طلوع مہر گریبانِ باختر[3] سے آج

1۔ صعب = سخت 2۔ل : شب سیاہ 3۔ باختر= مشرق (نیز مغرب=نور اللغات، چہارم)

وہ آپ تیغ علم کر کے مجھ پہ دوڑا تھا مجھے تو سینہ چھپانا نہ تھا سپر سے آج

نشانہ دیکھیے کس کس کا مصحفی دل ہو
لگا ہے ترکشِ پُر تیر واں کمر سے آج

144

دل جو گلگشتِ چمن سے مرا بیزار ہے آج نوک سبزے کی بھی آنکھوں میں مرے خار ہے آج

تو جو اے گل سببِ رونقِ گلزار ہے آج نالۂ مرغِ چمن کتنا اثر دار ہے آج

لذتِ وصل کے شب اس نے مزے لوٹے ہیں سو اذیّت کے دلِ خستہ سزاوار ہے آج

میں نے کیا اور نگہ سے ترے رخ کو دیکھا آئینہ بیچ میں کس واسطے دیوار ہے آج

نہیں بے وجہ کیا تو نے صنم اپنا بناو بختِ خوابیدہ کسی شخص کا بیدار ہے آج

عید آئی ہے، گرفتار رہا ہوویں گے اہلِ زنداں کے تئیں مژدۂ دیدار ہے آج

جس پہ تلوے ترے رہتے تھے دمِ خواب صنم خوں سے آلودہ اسی کشتے کا رخسار ہے آج

کوئی مخمور مگر باغ میں آیا تھا نسیم رنگِ رفتہ سی بہت نرگسِ بیمار ہے آج

وعدۂ وصل کیا اس نے کسی ساتھ وفا بدتر از مرگ جو حالِ دلِ بیمار ہے آج

کیونکہ [1] در سے ترے جاؤں کہ مری قسمت میں ہشت ہی ہشت ہے دشنام ہے دھتکار ہے آج

مصحفی لالہ جو کچھ آب ہوا جاتا ہے
ظاہرا رنگ پہ یہ دیدۂ خوں بار ہے آج

145

دیکھی نہ میں کبھی تہِ دریا حباب و موج - یعنی بروے آب ہیں پیدا حباب و موج

وحدت میں شک نہ لا، تجھے کثرت کی شان پر رکھتے ہیں گو کہ محو تماشا حباب و موج

ہستی کہیں ہیں جس کو وہ رکھتی ہے یہ مثال پنہاں حباب و موج ہے پیدا حباب و موج

کچھ [2] اصل بھی رکھیں ہیں یہ نقش و خطوط ہا یا جوشِ آب کا ہے تقاضا حباب و موج

1۔ ل میں یہ شعر نہیں 2۔ ل : جو

شاہد پرست سمجھے کہ مجنوں کی چشم میں ہے ناقہ و عماری لیلیٰ حباب و موج
چوگان و گوے بحر نے حاضر تو کیں ہزار آیا و لے وہ طفل یہ کہتا حباب و موج
کچھ آرزو نہیں دلِ پیر و جواں میں یاں مٹنے ہی کی رکھیں[1] ہیں تمنا حباب و موج
اس تیغ و خود سے نہ ہوئی فتح ایک کی
یوں مصحفی جہاں نظر آیا حباب و موج

چ☆

146

کہنے کو یوں ہر اک کے زباں ہے دہن کے بیچ لاوے کہاں سے پر یہ فصاحت سخن کے بیچ
رزقِ ہماے غم جو میں تھا مردہ خوار نے ڈھونڈا تو استخواں بھی نہ پایا کفن کے بیچ
واں بھی نہ مجھ کو حور کا عاشق کرے کہیں ہوں گا نہ ساتھ دل کے میں دفن اک کفن کے بیچ
عہدِ جنوں میں واں سے جو آیا جوابِ خط نشتر دھرے تھے نامے کی ہر اک شکن کے بیچ
گل ہو نہ بے دماغ کہ آتے ہی باغ میں بادِ صبا نے خاک اڑا دی چمن کے بیچ
حیرت تو مجھ کو یہ ہے کہ آ کر ہوئی اسیر روحِ نفیس کیونکہ گلی پیرہن کے بیچ
تارے جو شب کو چشم زلیخا سے باز ہیں یوسف جمال ہے کوئی اس انجمن کے بیچ
ایسا تو عزلتی ہوں کہ جوں مردمانِ چشم سیرِ جہاں کروں ہوں میں بیٹھا وطن کے بیچ
پڑھ اک غزل تو اور بھی، آخر تو مصحفی
طبعِ شگفتہ لائی ہے تجھ کو سخن کے بیچ

1۔ ل : رکھے ہے ☆ ردیف جیم فارسی کہ در ردیف ہذا چہار غزل است

147

آزردہ دل نہ ہو کوئی مجھ سے سخن کے بیچ
سوراخ نے صفت یہ دہن ہے دہن کے بیچ

ناخوردہ زخم آئے یہ ممکن نہیں کبھو
جا کر نگاہ ان مژۂ تیغ زن کے بیچ

میں حسنِ صندلی کا ہوں عاشق کہ آئے ہے
بو سیوتی کی اس گلِ نازک بدن کے بیچ

کس سے کروں میں اس کی بناگوش کا بیاں
دیکھی[1] نہ آب و تاب یہ برگِ سمن کے بیچ

یا رب میں مانگتا نہیں کچھ تختِ سلطنت
تھوڑا سا صبر دے مجھے رنج و محن کے بیچ

اللہ رے داغِ دل کی چمک دیکھیو ذرا
شوخی نہیں یہ چشمِ غزالِ ختن کے بیچ

حسنِ حبش میں جاذبہ اتنا نہ تھا دریغ
تِلی اٹک رہی ترے خالِ ذقن کے بیچ

سرو ر طناب پاتے ہیں بازار میں اسے
یوں شمع سرکشی کرے کتنی لگن کے بیچ

یوسف سے کہیو بادِ صبا جا کے مصر میں
روِوے ہے کوئی[2] ترے لیے بیت الحزن کے بیچ

کچھ آیہ و حدیث نہیں مصحفی[3] کا قول
جو کچھ بکا ہے اس نے سو دیوانہ پن کے بیچ

148

دمبدم شانہ نہ کر زلفِ پریشان کے بیچ
تار رہنے دے کوئی میرے گریبان کے بیچ

رنگ سے لالۂ کوہی کے مجھے شام و سحر
آگ لگتی نظر آتی ہے بیابان کے بیچ

نکہتِ گل نے ہوا باندھی ہے ایسی کہ ہنوز
جا نہیں نالۂ بلبل کو گلستان کے بیچ

نقشِ حب گر تجھے تسخیر پری ہے منظور
لکھ کے رکھ سورۂ یوسف میں تو قرآن کے بیچ

آسماں اور زمیں تک جو سماتا نہیں کچھ
نقش کس کا ہے مرے دیدۂ حیران کے بیچ

بزمِ خوباں میں ہوا رات یہ دل کا احوال
جیسے گھر جائے ہے پروانہ چراغان کے بیچ

چشمِ مجنوں سے کوئی دیکھے تو آتا ہے نظر
سحر مژگان پری خار بیابان کے بیچ

1۔ ل، ب: دیکھی یہ آب وتاب نہ 2۔کوئی "کی" کے وزن پر 3۔ل : قولِ مصحفی

مصحفی جس سے سبھی سینہ پھنکا جاتا ہے
یہ عجب آگ رکھی ہے دلِ انسان کے بیچ

149

آتش زباں ہوں لاؤ نہ مجھ کو سخن کے بیچ
شعلہ لگ اٹّھے گا ابھی چرخِ کہن کے بیچ

میری زباں زبانۂ سوزاں سے کم نہیں
آتش کدہ رکھوں ہوں میں گویا دہن کے بیچ

وہ تیرہ بخت ہوں کہ سوادِ فراق میں
پاتا ہوں لطف شام غریبی وطن کے بیچ

تو اٹھ گیا جو گھر کو، میں ناچارہ رہ گیا
تکتا ہوا ہر ایک کا منہ انجمن کے بیچ

شمعِ زباں دراز نہ بڑھ چل وگرنہ کارد[1]
رکھ دے گا سر کو کاٹ کے تیرے لگن کے بیچ

خاطر سے تیری گاڑ دیا اپنے جیتے جی
صد آرزوے دل کو میں رکھ کر کفن کے بیچ

رہتا نہیں میں ہستیِ موہوم کے سبب
جوں ژالہ ایک دم کے سوا پیرہن کے بیچ

کشتے کو اپنے ہجر سے کرتی نہیں ہلاک
خوبی یہی ہے اس نگہِ تیغ زن کے بیچ

میں رشک کش نہ ہوں جو صبا بوے مشک زلف
ہر صبح ارمغاں لیے جاوے ختن کے بیچ

نومید کیوں ہوں میں کہ درستی کی ہیں ہنوز
باتیں ہزار اس بتِ پیماں شکن کے بیچ

شاکی تھا رنگِ گل سے میں آگے ہی کیا کہوں
لالے نے اور آگ لگا دی چمن کے بیچ

جلتا ہوں میں کہ شمع کے مانند مصحفی
آتی ہے سر کی آگ چلی کیوں بدن کے بیچ

150

بعدِ[2] مُردن بھی نہ آرام ملا خاک کے بیچ
کیوں نمک ہم نے بھرا تھا دلِ صد چاک کے بیچ

کیوں ہوں پھر قید سے آزاد کہ ہم نے کی ہے
بیعتِ پیرِ مغاں سلسلۂ تاک کے بیچ

سامنے ہوتے ہیں اپنے جو حسینانِ جہاں
کچھ تو دیکھا ہے ہماری نگہِ پاک کے بیچ

1۔ کارد = چھری 2۔ یہ اور اس کے بعد کی دو غزلیں ل میں نہیں

صاحبِ دولت و حشمت سے تو تو مت ہونا جو تکلف کہ کرے زیور و پوشاک کے بیچ
ڈوب جاوے نہ کہیں زورق خورشید اس میں قلزمِ حسن کا گرداب ہے نتھ ناک کے بیچ
اس کے مسمومِ محبت کی خدا خیر کرے وہ اثر اب نظر آتا نہیں تریاک کے بیچ
کیا نحوست سے نکالیں گے ہمیں بیچارے ماہ و خورشید ہیں خود گردشِ افلاک کے بیچ
مصحفی آنکھوں سے آنسو جو چلے آتے ہیں
کیا یہ غم رک نہیں سکتا دلِ غم ناک کے بیچ

151

پانو رہتے ہیں نہیں خانۂ زنجیر کے بیچ دشت گردی ہی لکھی تھی مری تقدیر کے بیچ
سرخ کر دیتی ہے معشوق کو عاشق کی نگاہ یہ اثر میں نہیں دیکھا کسی اکسیر کے بیچ
گو وہ تیزاب ہے یہ بھی نہیں تیزاب سے کم بیٹھ جاوے گا مرا خوں تری شمشیر کے بیچ
خط کو لکھ لکھ کے جلاتا ہوں یہ معلوم نہیں کیا مزہ ہے رقمِ شوق کی تحریر کے بیچ
چوک مانی سے ہوئی یہ نہ بھرا رنگ کی جا خون عاشق کا ترے خاکۂ تصویر کے بیچ
صید دم لے لے کے اپنا جو کٹاتے ہیں گلا کچھ تو ملتا ہے مزہ برّشِ شمشیر کے بیچ
اے کماندار ابھی رخ تو نہ میداں سے پھرا حسرتِ تیر دگر ہے دلِ نخچیر کے بیچ
دل کو ہے سخت قلق آج کے دن اے نالے اور تاثیر بھرا چاہیے تاثیر کے بیچ
بیٹھے بیٹھے وہیں بل کھا کے بگڑ جاتا ہے یہی اک خو ہے بری اس بتِ بے پیر کے بیچ
خمِ گیسو نے کیا ہند کو گر حلقہ بگوش تو صفاہاں ہے تری چشم کی تسخیر کے بیچ
اس سبب قاسمِ قسمت سے ملا روز ازل
سوز دل مصحفیِ خستہ کی جاگیر کے بیچ

ح☆

152

چشم[1] نے کی گوہر افشانی صریح ہو گئی یہ ہم سے نادانی صریح
منھ چھپا قاتل کہ تیری ہی طرف تک رہی ہے چشمِ قربانی صریح
کربلائے عشق میں عشاق کی تیغ و خنجر پر ہے مہمانی صریح
آئینے میں بھی نہیں پڑتا ہے عکس ہے تری تصویر لاثانی صریح
ژالہ ساں کیونکر گھلے جاویں نہ ہم ہے جو آنسو میں پریشانی صریح
کیونکہ استقلال کا دم ماریں ہم استخواں اپنے تو ہیں پانی صریح
مزرعِ دل کس طرح سرسبز ہو برق یاں کرتی ہے جولانی صریح
ماہِ نو ہے کس کے در کا سجدہ پاش رک گئی ہے اس کی پیشانی صریح

مصحفی دم توڑے ہے، مرتا نہیں
کر رہا ہے یہ گراں جانی صریح

153

دیتی ہے شبِ وصل مجھے اپنا جو غم صبح کہتا ہوں یہی اور نہ ہووے کوئی دم صبح
زاہد نہ کرے سجدۂ محرابِ حرم صبح دیکھے جو وہ طاقِ خمِ ابروئے صنم صبح
امید پھر اٹھنے کی پس از مرگ غلط ہے ہوتے ہوئے دیکھا ہے شبِ گور کو کم صبح
میں اس شبِ مظلم[2] کا گرفتار ہوں جس کی منصف ہو سدا کھاتی رہے آپ قسم صبح

☆ ل: آغاز ردیف حائے حطی کہ در ردیف ہٰذا دو غزل است

1۔ ل اور ب میں یہ غزل نہیں ہے

2۔ مظلم = تاریک

دروازے سے باہر ہی شبِ وصل کھڑی رہ — رکھ گھر میں نہ عاشق کے یہ منحوس قدم صبح
صادق[1] سے بس اک آن میں ہوجاوے تو کاذب — دکھلاؤں اگر تجھ کو میں اس زلف کا خم صبح
بیتابیِ دل دشنہ زنِ سینۂ جاں ہے — کرتے نظر آتے نہیں اس شب کو تو ہم صبح
اے ابر ترشح کی ترے کچھ نہیں حاجت — رکھتی ہے مرے کھیت کو شبنم ہی سے نم صبح
آثار بھی دنیا میں نہ رہتا کہیں اس کا — ہوتی جو مرے چاک گریباں سے بہم صبح
یا وصل کی شب کاٹ گلا مرغِ سحر کا — یا مجھ کو ہی کردے کسی صورت تو اصم[2] صبح
دیجورِ شبِ غم میں پھنسے ایسے کہ ہم کو — نے صبح نخستیں[3] نظر آئی، نہ دویم صبح
ہے شام سے غم اس کو ترے تیر مژہ کا — یہ شام تو کرنے کا نہیں صیدِ حرم صبح

اے مصحفی پہلی مہِ شعباں کی یہ شب ہے
لازم ہے بناں سے رکھیں ہم اپنی قلم صبح

154

سمجھے ہیں تری مانگ کے عالم کو تو ہم صبح — اس طول سے ہوتی ہے شبِ تیرہ میں کم صبح
رکھ شامِ غریباں سے تو باہر نہ قدم صبح — خو کردۂ ظلمت ہیں، نہیں مانگتے ہم صبح
اک[4] ایسی غزل اور لکھیں لوح صفا پر — لے جس سے چھپا اپنی جواہر کی رقم صبح
کیا چمکے بناگوش تری زلف کے نیچے — ہاں سچ ہے کہ بدلی میں نظر آتی ہے کم صبح
بے حوصلہ تا ہم کو نہ سمجھے یہ سمجھ کر — ہم مردۂ شب کا بھی نہیں کرتے ہیں غم صبح
خورشید جبیں[5] اس کے لگاوے کفِ پا سے — گر بھول کے کھاوے ترے تلووں کی قسم صبح
گورے بدن اس کے کا لکھا وصف جو کوئی — کاغذ پہ عیاں ہوگئی ہنگامِ رقم صبح
مت بھولیو تو مہرِ درخشاں کی ضیا پر — ہے تیرے مقابل مرے[6] بختوں کی ظلم[7] صبح

1۔ ل : صادق سے تو ہو جاوے 2۔اصم = بہرا 3۔صبح نخستیں = پہلی صبح یعنی صبح کاذب، دویم صبح مراد صبح صادق 4۔ ل میں یہ شعر مقطعے سے پہلے درج ہے 5۔ل : وہیں
6۔ ل : ترے مجنوں 7۔ ظلم = سیاہی

خاور میں کبھی ہے مرے بختوں کی سیاہی
خورشید کا مغرب سے نکالے گی علم صبح

تاریک ہے شب اپنی یہاں تک کہ ہمیشہ
اس شب کے سمجھتے ہیں پرِ زاغ کو ہم صبح

گر شب [1] نہ لگا ہاتھ ترے کچھ تو غضب ہے
کم طالعی اپنی کا نہ ہو وزد کو غم صبح

جانے سے ترے پیشتر اے کاش میں مرجاؤں
تا مجھ کو جدائی کا دکھاوے نہ الم صبح

ہے سطح جو سینے کا دہاں اور کمر میں
مجھ کو نظر آتی ہے میان دو عدم صبح

اس صبح کو پھر کیوں نہ کہوں صبحِ قیامت
راتوں سے مری کشت کو ہوتی ہے بہم صبح

بکے کا یہ عالم جو نظر آوے تو کیونکر
والشّمس کو رخ پر نہ کرے یار کی دم صبح

رویا جو کروں ہوں میں شب ہجر میں، احباب
پاتے ہیں مرے بستر و بالین کو نم صبح

کیا اس کو عبادت کا مزا شرمِ گنہ سے
مژگاں بھی نہ کی ہو کبھی جس شخص نے نم صبح

اے مصحفی ہوتا جو یہ دل طورِ تجلی
کرتی نہ مرے کلبۂ تاریک سے رم صبح

خ ☆

155

ہے اشکِ سرخ سے مری آنکھوں کا رنگ سرخ
دریاے [2] خوں کا کیونکہ نہ ہووے نہنگ سرخ

شعلہ کی جست و خیز سے ہے رونقِ جمال
اس گل کا چہرہ کیوں نہ ہو وقتِ شلنگ [3] سرخ

کیا جانے کس شہید کی تربت کی خاک تھی
تودے سے جو نکلتے ہیں اس کے خدنگ سرخ

مانی جو تیرے حسن کا نقشہ لکھے کبھی
ہو اس کے سامنے نہ شبیہِ فرنگ سرخ

1۔ ل : نہ ترے ہاتھ لگا ☆ ل : آغاز ردیف حرف الخا کہ در ردیف ہذا ہشت غزل است

2۔ ل : دریاے خوں کہ کیونکہ نہ ہوویں 3۔ شلنگ = چھلانگ

دریاے خوں میں کس کے شناور ہوا جو ہے اس شوخ خانہ جنگ کے گھوڑے کا رنگ سرخ
مریخ کا طلوع کچھ اچھا نہیں سمجھ سیندور سے نہ مانگ کرائے شوخ شنگ سرخ
روکش ہوا ہے وہ صنمِ پوربی مرا ہو جس کی پشت پا سے مہاور[1] کا رنگ سرخ
دیوانہ بہار کو رنگیں مزاج دیکھ لڑکوں نے جھولیوں میں بھرے اپنی سنگ سرخ
خنجر سے اس کے منھ کو رگڑتا ہے مصحفی
خوں سے گلا کرے نہ یہ بے نام و ننگ سرخ

156

ہے آبِ تیغ کا تری قاتل جو رنگِ سرخ شاید کہ تو نے اس کو چٹایا تھا سنگ سرخ
پرزے ہو، صرفِ رقعۂ شادی وہ ہو گیا گھر میں گرا کسی کے گر اس کا پتنگ سرخ
دو دل کا آنا ایک پہ ہے باعثِ نزاع چنی[2] کے رخ پہ کرتے ہیں کٹ کٹ کے جنگ سرخ
نخچیر گاہِ عشق کا خوں خشک کب ہوا چن چن کے واں سے لاتے ہیں اب تک خدنگ سرخ
جب اس گلو بریدہ کو محشر میں لے گئے سب تھا ترے شہیدِ نگہ[3] کا پلنگ سرخ
ٹپکے تھا میرے خط سے شکایت کا بسکہ خوں جوں برگِ گل[4] سے بالِ کبوتر کا رنگ سرخ
تب جانوں میں کہ دینِ محمدؐ کے ہیں حریف جب روزِ حشر ہو رخِ اہلِ فرنگ سرخ
جوں برگ گل عیاں ہے لطافت بدن کی سب شبنم کا اس کی ہووے نہ ملبوس[5] رنگ سرخ
مہندی کی احتیاج نہیں اس کو مصحفی
ہاتھوں کا اس کے خود ہے نزاکت سے رنگ سرخ

157

یک پیچہ[6] سر پہ باندھے جو وہ خانہ جنگ سرخ ترکِ فلک[7] کا ہو نہ خجالت سے رنگ سرخ

1۔ مہاور = سرخ رنگ جو لاکھ سے تیار کیا جاتا ہے (فرہنگ آصفیہ) 2۔ چنی = یاقوت
3۔ ل: تکیہ پلنگ سرخ 4۔ ل: ہے 5۔ ل، ب: بنگ 6۔ یک پیچہ = پگڑی کی ایک قسم
7۔ ترکِ فلک = مریخ

گریے سے کیوں نہ ہو مری آنکھوں کا رنگ سرخ	لالوں کا برشگال میں ہوتا ہے رنگ سرخ
رکھتی ہے رنگِ سرخ کو لیلیٰ بہت عزیز	کندن کی باندھی چاہیے ناقے کو زنگ[1] سرخ
کرتا ہے طائرانِ حرم کا وہ کب خیال	ہو خونِ مرغِ سدرہ سے جس کا خدنگ سرخ
برسے نہ کیونکہ خون کہ نت شوخ نے مرے	برسات کی ہوا میں اڑایا پتنگ سرخ
مت پوچھ حالِ اخگرِ سوزانِ داغِ دل	ایسا نہ ہووے چشمِ کبوتر کا رنگ سرخ
تازہ شہید ہے، ترے کشتہ کے ڈھیر پر	کیا دور اگر رخام[2] کا ہو جاوے سنگ سرخ

خوں رو کے تو نے قہر کیا رات مصحفی
طرفِ دروں سے گھر کی ہے ساری النگ سرخ

158

ہوتا ہے پہلے خون سے مانجھے کا رنگ سرخ	واں سادی ڈور پر نہیں اُڑتا پتنگ سرخ
خون شکار ناز کو حسرت ہی رہ گئی	اک آدھ بھی ہوا نہ تمھارا خدنگ سرخ
نازک دماغ ہے مہ جی[3] اب کے تو صبا	کلیوں کی لا کے باندھیو مخمل میں زنگ سرخ
کشتوں کے خوں کے اچھلیں گے فوارے گر یونہی	اوجِ ہوا پہ ہووے گا گھوڑے کا تنگ[4] سرخ
ہونٹوں پہ پھیرے پان چبا کر جو وہ زباں	پھر کس طرح نہ ہو مسّیِ دُود رنگ سرخ
وہ صیدِ خستہ ہوں میں بیابانِ عشق کا	ہیں جس کے خوں سے ناخنِ شیر و پلنگ سرخ
لے جائے گر صبا تری مہندی کی بو اُدھر	جوں اہلِ روم ہو رخِ اہلِ فرنگ سرخ
خونِ شہیدِ ناز جو جوشاں تھا خاک سے	گرتے ہی اس پہ ہو گئے اولوں کے رنگ سرخ
گلیوں میں تا کمر ابھی بہنے لگے گا خوں	پٹکا کمر سے باندھیو مت خانہ جنگ سرخ
لالے کا پھول دیکھ کے کھاتا ہے جس کو داغ	نکلا ہے ان دنوں میں یہ وہ غولہ[5] دنگ سرخ
مرغِ اسیر سر نہ پٹکنے سے باز آئے	جب تک نہ تیلیوں کا قفس کی ہو رنگ سرخ

1۔ زنگ = گھنٹی	2۔ رُخام = ایک پتھر	3۔ل: آپ تو صبا	4۔تنگ = گھوڑے کی پوشش
5۔ غولہ دنگ (پلیٹس: غولدنگ) شوخ، شریر

منت کش مغاں نہ ہو زنہار مصحفی
آنکھوں کو اپنی کر تو بیک قرط بنگ سرخ

159

ہے اس کی انگلیوں پہ جو فندق کا رنگ سرخ
پیکاں رکھیں ہیں خون سے میرے خدنگ سرخ

آنسو سے داغِ دل کی سیاہی نہ وہ رہی
روغن سے دور کرتے ہیں لوہے کا زنگ سرخ

لایا ہے میرے نامۂ رنگیں کا کیا جواب
نامِ خدا کچھ آج ہے قاصد کا رنگ سرخ

اک خلق دادخواہ ہے قاتل کے در پہ آج
کچھ چارپائیاں ہیں دھری، کچھ پلنگ سرخ

خونِ نظار بسکہ گرا تیغِ ناز سے
اس بت کی جالیوں کے نظر آئے سنگ سرخ

تھا ابتدائے عمر سے شوق اس کو خون کا
محفل میں بھی اڑائے تھا اکثر پتنگ سرخ

اوقات کاٹتے ہیں تنک مایگانِ عشق
چہرے کا اپنے کر کے طمانچوں سے رنگ سرخ

نامے میں رنگِ عشق نہ میں لکھ سکا و لے
مہندی سے کر کے بھیجے کبوتر کے چنگ سرخ

ملنے لگا گلے سے جو چلتے ہوئے کوئی
دشنے سے میں گلے کو کیا ہو کے تنگ سرخ

اتنا تو ان میں خون نہیں، اہلِ جاہ کے
چہرہ رکھے ہے آرزوے نام و ننگ سرخ

ڈر ہے کرے نہ مخملِ شاہاں کے فرش سے
پاے پُر آبلہ کو مرا عذرِ لنگ سرخ

درویشی کو بھی چاہیے اک رنگ مصحفی
کرتے ہیں اتنے واسطے آنکھیں پلنگ سرخ

160

یوں آہ کی شدت سے ہوا کام و زباں تلخ
جوں خانۂ پُر دود میں لگتا ہے دُھواں تلخ

شیریں سخن ایسے کو کوئی دوکھے[1] سو کیوں کر
دشنام کی تلخی سے نہ ہو جس کی زباں تلخ

پایانِ شبِ ہجر تو منہ بند رکھا کر
کرتی ہے خروسِ سحری تیری فغاں تلخ

1۔ دوکھنا = دوش دینا، الزام دینا

اس کی نگہِ تلخ کا گزرے جو تصور — ہو جاوے ابھی چاشنیِ شیرۂ جاں تلخ
حصّے میں نہ دے غیر کے اپنے لبِ شیریں — تو زیست کو میری نہ کرائے دشمنِ جاں تلخ
ہم وے نہیں جو بے مزہ ہوں ایسے[1] جواں سے — گو منھ سے کہیں کچھ ہمیں شیریں دہناں تلخ

اب خاک کرے زیست کہ بے یار شکر لب
ہے زندگیِ مصحفی اے ہم نفساں تلخ

161

تھا زہر جدائی سے مرا کام و زباں تلخ — تب تو لگی ہمسایہ کو تا صبح فغاں تلخ
اس کشورِ معمور میں ہم اترے ہیں آ کر — با وصفِ حلاوت ہے جہاں آب رواں تلخ
برچھی کہیں کھائی تھی تری نوک نگہ کی — اس دن سے نہیں لگتی ہے عاشق کو فغاں تلخ
اس کے لبِ شیریں کے تصور میں کسی شب — گر جان بھی دیجے نہ لگے تلخیِ جاں تلخ
کیا قافلہ یاروں کا یہ جاتا ہے عدم کو — جو گرد ہے اس دشت کی اے ہم سفراں تلخ
لب بند ہی رکھو، نہیں پھر اور کرے گا — افسانہ مرے خواب کو اے ہم نفساں تلخ
جس دشت میں پانی نہ مسافر کو نظر آئے — جوں ریزۂ الماس ہے واں آبِ رواں تلخ
اتنا بھی مرا جی نہ جلا ہجر کی شب ہے — مت زیست کو کرائے نفسِ شعلہ فشاں تلخ
دوری نے تری بے مزہ ازبسکہ کیا ہے — لگتا ہے نگاہوں میں مری کون و مکاں تلخ
ہوتا ہے کوئی کم اثرِ زہرِ جدائی — انگشتِ عسل کرتی ہے عاشق کی زباں تلخ
ہر حرف میں ہے اس کے مزہ شہد و شکر کا — عاشق کو کہیں[2] لگتی ہے دشنامِ بتاں تلخ
کرتا ہی نہیں بے مزہ معشوق کا غصہ — شیریں ہے وہ جتنی ہوئے اے بادہ کشاں تلخ
جھیلا ہے میں برسوں المِ زہرِ جدائی — ہووے گی نہ اب زہرِ ہلاہل سے زباں تلخ
کیا فائدہ مصری سے کہ بیمار کو تیرے — شربت بھی دمِ نزع تو لگتا ہے میاں تلخ

1۔ ل : اتنے پہ ان سے   2۔ ل : کوئی

کیا فکر کے توسن کی کہوں مصحفی اپنے
جل جائے ہے بجلی تو یہ ہوتا ہے جہاں تلخ

162

اس نے پیشانی پہ جب اپنی مَلا صندل سرخ
درد سر کا ہوا کافر کے دوا صندل سرخ

صنما، صندلِ ابیض میں یہ انداز کہاں
زیب دیتا ہے تجھے نامِ خدا صندل سرخ

کفِ پامَلتے[1] ہی سر پر نہ رہا رنجِ صداع[2]
حق میں عاشق کے ہوا رنگِ حنا صندل سرخ

مَلتی پھرتی ہے جبینوں پہ گلوں کی ہر صبح
بَن کے مشاطۂ گلزار صبا صندل سرخ

درد سر کا تجھے اندیشہ ہے گر اے قاتل
خونِ مقتول سے ماتھے پہ لگا صندل سرخ

دن جو گرمی کے ہیں لگ کر تری پیشانی کو
سر پہ لاتا ہے مرے زور بلا صندل سرخ

گھور[3] میں سرخی کو قشقے کی نہیں چنداں دخل
سر پہ لایا مرے ہو سو وہ بلا صندل سرخ

تیرے ماتھے[4] نے دیا ہے جو اسے حسن قبول
استخواں جان کے کھاتا ہے ہما صندل سرخ

بسکہ عالم کو دیا ہے تری بندی نے صداع
نہیں عطار کی دوکاں میں رہا صندل سرخ

استخواں دیکھے جو کشتوں کے ترے خوں میں بھرے
مجمر رشک میں بن آگ جلا صندل سرخ

صدمۂ رعد سے ہوتا ہے جو صد پارہ سحاب
منھ پہ ہر لکّے[5] کے ملتی ہے ہوا صندل سرخ

درد سر کا تھا مرے درد جگر میں انداز
اس لیے میں نے بھی سینے سے مَلا صندل سرخ

کام سرخی کا جو ہر ایک روش پر ہے تمام
نظر آتی ہے گلستاں کی فضا[6] صندل سرخ

زندہ و مردہ نہ کیوں خوش ہوں کہ اس بت کا
پشتِ پا صندلِ ابیض، کفِ پا صندل سرخ

نام دنیا میں رکھا باقی انھوں نے اس کا
مصحفی دیں مرے اشکوں کو دعا صندل سرخ

1۔ ل : رکھتے ہی　　2۔صداع = دردِ سر　　3۔گھور = گھول　　4۔ل : بالو

5۔ لکّا = (ابر کا) ٹکڑا　　6۔ل : فزا

د ☆

163

گنتا[1] کا ہے اگرچہ سنہرا ازار بند گلّو کا بھی غضب ہے گلہرا[2] ازار بند
گویا گرہ بہانے کی ایک اس پہ تھی لگی ناخن کے لگتے ہی جو نہ ٹھہرا ازار بند
عاشق کے دل کو باندھ رکھے یوں کمند میں کب یہ پری کا رکھتا ہے زہرا ازار بند
ممکن نہیں کہ دزدِ ہوس کا ہو واں گزر دیتا رہے ہے راتوں کو پہرا ازار بند
اُلھڑ پنے سے ہووے وہ ڈولی میں جب سوار للچائے کیوں نہ دیکھ کے مہرا[3] ازار بند
شب کھینچ ہی لیا تھا میں جنگلے میں اس کا ہاتھ الجھا رکھے اگر نہ کٹہرا ازار بند
گر خوں پہ مصحفی کے چلے اس کا جی کبھو
رنگریز سرخ رنگیو یہ گہرا ازار بند

164

کب سخن چینِ فصیحاں کو ملے نام استاد خط کی اصلاح سے ہوتا نہیں حجام استاد
خلق سب طفل ہیں عالم ہے دبستاں گویا آپ ہر ایک کی ہے گردشِ ایام استاد
یہ فضیحت نہ روا رکھ فلکِ ناانصاف بات بات اس کی میں کھایا کرے الزام استاد
روزِ آدینہ بھی اے طفل دبستاں آشوب شوخیوں سے تری پاتا نہیں آرام استاد
جیت سکتا ہے کوئی تیرے کماں ابرو سے تیر کے علم میں ہر چند ہے بہرام استاد
اس کے مضموں[4] کو سمجھ جائیو اے طفل حسیں کم صلا میں کرے خط تجھ کو جو ارقام استاد
کھائیوں مت تو انھیں اے صنمِ نرگس چشم پڑھ کے لاوے جو ترے واسطے بادام استاد

☆ ل : درردیف ہذا دو غزل است 1۔ گنتا = ب میں گنتا کے نیچے لکھا ہے "ایک نام" (گنتا کے معنی گلہری کے بھی ہیں) 2۔ گلہرا = غالباً گلہری کی طرح دھاری دار 3۔ مہرا = کہار 4۔ ل سے اضافہ

منتقم میر سا جب ہو تو حضورِ تیمور کھاوے کیوں اس سے نہ اک حرف پہ الزام استاد
گہرے پانی میں وہ بت پیرے ہے اور دیکھ اسے ہاتھ ملتا ہے کھڑا پل کے سر بام استاد
فنِ کشتی کی رذالت سے نہیں معیوبی کیوں نہ کھاوے تری لٹ پنٹ[1] میں دشنام استاد
چاہیے طورِ فصاحت کو نہ دے ہاتھ سے تو گو پئے قافیہ ہو دشمنِ ادغام[2] استاد
کیونکہ دیکھوں میں کہ اس طفلِ دبستانی کو سبقِ ناز پڑھا دے سحر و شام استاد
مصحفی صعوہ[3] سمجھ کر نہ زیاں کاری کر
ٹک ادھر دیکھ کہ عنقا ہے تہِ دام استاد

165

کارِ کشادہ دل کو کرے روزگار بند باور نہیں تو دیکھ لے نے میں ہزار بند
اس کا شکار چاہیے ہو گل ہی اے نسیم جس شہسوار کی ہو رگِ گل شکار بند
ذکر اس دہان تنگ کا کرتا ہوں گر کبھی ہو جاتی ہے زباں مری بے اختیار بند
کشتہ کا نازکی کے تری بلبلان باغ کرتے ہیں برگِ گل سے شگاف مزار بند
ذراتِ خاک یوں ہیں گرفتارِ چاہِ غم جیوں چنگ[4] کے تنورے میں ہووے غبار بند
قرص اس کے مہر و مہ تو ثریا گہر بنی تیار اس صنم کا ہوا تب ازار بند
بسمل پڑے ہیں مجلس عشاق میں نزار کس کس کو ذبح کر نہ گیا وہ کٹار بند
ہر چند ضبط آہ میں کرتا ہوں مصحفی
آتش سے اس کی ہو نہیں سکتے شرار بند

166

جوشِ گریہ سے پڑے یوں دلِ افگار میں چھید جیسے فوارے کی ہوں چشمِ گہر بار میں چھید
کاش صیاد تو پھولوں سے کرے بند ان کو جس قدر ہیں قفسِ مرغِ گرفتار میں چھید

1۔ لٹ پنٹ = زور آزمائی 2۔ ادغام = باہم پیوست ہو جانا (فن قافیہ سے متعلق)
3۔ صعوہ = ممولا 4۔ ل : جنگ (چنگ = ایک باجا)

جس نے برقع کو بنایا ترے کیا سحر کیا رکھ دیے چشم کی جا پردۂ رخسار میں چھید

بسکہ تیزاب سے کچھ کم بھی نہ تھے وہ دمِ قتل خوں کے قطروں سے مرے پڑ گئے تلوار میں چھید

خوب رویوں سے[1] تو ہے آنکھ لڑانے کا مزا سینکڑوں ہوویں جہاں جالی کی دیوار میں چھید

بھولیو مت کہ مجحّر[2] ہے ترے گھر کی جِدار[3] آہِ آتش نفساں کرتی ہے کہسار میں چھید

آہ و نالہ کی ہوا خاک بندھے اے بلبل مثلِ قُقنس[4] نہ پڑیں تا تری منقار میں چھید

آتش افشاں ہے مرا نالہ عجب کیا اس کا مثلِ قُقنس کے پڑیں گر مری منقار میں چھید

ہو گیا مصحفی آخر کو وہ ناسور کہن

کاوشِ غم سے پڑا تھا جو دلِ زار میں چھید

167

قلقِ دل سے ہیں جیسے مرے رخسارے زرد پھول گیندے کے بھی ہوں ایسے نہ بیچارے زرد

کس نے پہنا یہ شبِ مہ میں بسنتی جوڑا عکس سے جس کے نظر آنے لگے تارے زرد

چشمِ نرگس بھی جنھیں دیکھ کے شرماتی[5] ہے کیا کرن پھول ہیں کانوں میں ترے پیارے زرد

سبزہ تیرہ[6] نظر آیا مجھے رنگ اس گل کا میں نے چن چن کے کبوتر جو کئی مارے زرد

کشورِ حسن میں یہ رنگِ شہِ حسن ہے آج ہاتھ میں اپنے چھڑی رکھیں نہ ہرکارے زرد

مشتری چہرے کا بیمار ہوا تھا مجھ پر تب تو یاروں نے مرے پھول کئی وارے زرد

ان پہ بھی سوز محبت سے ہوا کیا صدمہ نظر آتے ہیں مجھے آگ کے انگارے زرد

چمپئی حسن ترا دیکھ کے اے رشکِ بہار پھول جو باغ میں تھے ہو گئے وہ سارے زرد

دوکھتا تھا تو ہمیں مصحفی رفتہ رفتہ

رنگ تیرا بھی مری جان ہوا بارے زرد

1۔ ل : سے ہے واں آنکھ 2۔ مجحّر = پتھر کی بنی ہوئی نیز جالی دار 3۔ جدار = دیوار

4۔ نور اللغات میں لکھا ہے کہ یہ یونانی لفظ قوقنوس کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ایک خوش رنگ، خوش آواز پرندے کا نام۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی چونچ میں 360 چھید ہوتے ہیں۔ ہر ایک سے الگ راگ نکلتا ہے۔ 5۔ ل : تھی

6۔ سبزہ تیرہ = سبزہ دھوما (سیاہی مائل سبز کبوتر کی ایک قسم)

ڈ

168

اک بال سی کمر پہ ہے یوں یار کا گھمنڈ
کافر کو جیسے ہووے ہے زنّار کا گھمنڈ

وارستگاں کا ہے ترے عریاں تنی لباس
رکھتے نہیں وہ جامہ و دستار کا گھمنڈ

یا رب سنا جو نام انھوں نے ترا غفور
افزوں ہوا ہر ایک گنہگار کا گھمنڈ

لاشہ مرا مقابل اگر اس کے آگیا
معلوم ہوگا آپ کی تلوار کا گھمنڈ

لے ایک دن تو تُو بھی میاں تیغ ہاتھ میں
تا کچھ تو کم ہو خرچِ ستم گار[1] کا گھمنڈ

واقف نہیں زبان سے اردو کی تس[2] پہ آہ
کیا کیا عزیز کرتے ہیں اشعار کا گھمنڈ

یوں شہر میں ہیں اور بھی کتنے گھمنڈیے
لیکن بجا ہے مصحفیِ زار کا گھمنڈ

ذ☆

169

ایسے یہ تیر کھا کے ہوئے تھے کہاں لذیذ
لگتے ہیں کیوں ہما کو مرے استخواں لذیذ

بجلی نے آشیاں کو مرے جب جلا دیا
بولے کہ تھے یہ خاور خس آشیاں لذیذ

تلخی شبِ فراق کی دے وصل کا مزا
چاہے تو زہر کو بھی کرے آسماں لذیذ

مجنوں کہے ہے لیلیٰ تو آتی نہ ہو کہ آج
لگتا ہے نالۂ جرسِ کارواں لذیذ

جاتا[3] ہے ناقہ نجد میں کہتا ہر ایک گام
اس بادیہ کے خار ہیں اے ساربان لذیذ

1۔ ل : جفا کار 2۔ ل : جس پہ ☆ ل : در ردیف ہذا دو غزل است۔ 3۔ ل: جاتا تھا

فرمائشوں سے تیری تو میں تنگ آ گیا کھانے تو اس قدر بھی نہ ڈھونڈا اے زباں لذیذ

وہ تشنہ کام ہوں کہ مجھے آبِ شورِ تیغ لگتی ہے اس کے کف سے دمِ امتحاں لذیذ

باورچیِ فراق پکاتا ہے سو خیال تب ہے نمک چشِ مژۂ خونچکاں لذیذ

ہر چند تُو تو پیر ہوا، لیک مصحفی

لگتے ہیں اب تلک ترے شعرِ جواں لذیذ

170

پڑھتا ہے کب ہمارا وہ رشکِ ماہ کاغذ کرتے ہیں گھر میں بیٹھے ناحق سیاہ کاغذ

روزِ قیامت اے دل ہووے گی تب قیامت لیویں کے ہاتھ میں جب اہلِ گناہ کاغذ

نامے کو مجرموں کے پھینکے ہے طاق پر وہ کس منہ سے اس کو لکھے یہ پُر گناہ کاغذ

استاد کی نگہ کو شاید وہ طفل سمجھا پڑھنے میں جو کرے ہے رخ کی پناہ کاغذ

یہ تیرے عاشقوں کو ہے یاد خوش نویسی مشقِ الف سے دیکھا میدانِ آہ کاغذ

نامے سے مصحفی کے لازم ہے منہ پھرانا؟

گاہے تو تُو پڑھا کر اے[1] کج کلاہ کاغذ

ر ☆

171

کیا کروں اہلِ صفاہاں کی بھی خاطر ہے ضرور اور مجھے ہندی فصیحاں کی بھی خاطر ہے ضرور

کر چکا کنجِ قفس میں ہمیں تو نالے لاکھ بار اب نوا سنجانِ بستاں کی بھی خاطر ہے ضرور

1۔ ل، ب: اے رشکِ ماہ ☆ ل: آغاز ردیف الراکہ در ردیف ہذا سی و ہفت غزل است۔

دہریہ تو ہیں پر اس الحاد پر اپنے تئیں
بیش وکم گبر و مسلماں کی بھی خاطر ہے ضرور

دو قدم چل کر سر اپنا دیجے قدموں پر جھکا
اب تو اس سروِ خراماں کی بھی خاطر ضرور

بعد سینے کے نہ اس کا قصد کر دستِ جنوں
بخیۂ چاکِ گریباں کی بھی خاطر ہے ضرور

دیجیے تیرِ اجل کو کیوں نہ پہلو میں جگہ
ہم کو اس ناخواندہ مہماں کی بھی خاطر ہے ضرور

نالۂ آتش فشاں کرتا تو میں پر کیا[1] ضرور
ظلمتِ شب ہائے ہجراں کی بھی خاطر ہے ضرور

آہوانِ دشت سے کیوں کر میں خوگر ہو رہوں
مجھ کو تو شہری غزالاں کی بھی خاطر ہے ضرور

آج کی شب گر رہیں گے مصحفی بیرونِ در
کیا کریں ہم کو تو درباں کی بھی خاطر ہے ضرور

172

دل خوش نہ ہوا زلفِ پریشاں سے نکل کر
پچھتائے ہم اس شامِ غریباں سے نکل کر

یہ اس سے زیاں کار تو وہ اس سے بد آئیں
جاؤں میں کہاں گبر و مسلماں سے نکل کر

استاد کوئی زور[2] ملا قیس کو شاید
لی راہ جو جنگل کی دبستاں سے نکل کر

معلوم نہیں مجھ کو کہ جاوے گا کدھر کو
یوں سینہ ترا چاک گریباں سے نکل کر

گزرا[3] رگِ گردن سے کہ جوں شمع سر اپنا
تلوار ہی کھاتا ہے گریباں سے نکل کر

نازوری میں آیا نہ کبھو تا سرِ مژگاں
یک قطرۂ خوں بھی بُنِ مژگاں سے نکل کر

تیروں میں کماں دار مرا گھیر لے جس کو
وہ جانے نہ پاوے کبھی میداں سے نکل کر

ہم آپ فنا ہو گئے اے ہستیِ موہوم
جوں موجِ تبسم لبِ جاناں سے نکل کر

صورت کے تری سامنے رہ جائے ہے کیسے
ہر بت کی نگہ دیدۂ حیراں سے نکل کر

اس دستِ حنائی میں رہا آئینہ اکثر
دریا نہ گیا پنجۂ مرجاں سے نکل کر

اب پڑھ وہ غزل مصحفی تو شستہ و رفتہ
سننے جسے خلق آئے صفاہاں سے نکل کر

1۔ ل: کیا کروں 2۔ل، ب: اور 3۔ل سے اضافہ

173

خط تیرہ ہوا عارضِ جاناں سے نکل کر
جوں پھیلے دھواں آتشِ سوزاں سے نکل کر

اب سخت ندامت ہے اسیرانِ قفس کو
کیوں فصل گل آئے تھے گلستاں سے نکل کر

یک شب بھی جو عالم کو ترے خوابوں میں دیکھے
حور آئے چلی روضۂ رضواں سے نکل کر

ڈرتا ہوں کہ رسوا نہ کرے روز قیامت
نالہ دلِ ناگشتہ پشیماں سے نکل کر

جا سکتی نہیں ہے حد[1] گردن مری باہر
شمشیر سیاست کے گریباں سے نکل کر

غبغب سے بچا دل تو زنخدان میں ڈوبا
گرداب میں کشتی گئی طوفاں سے نکل کر

ملتی ہے حیات ابدی قید میں ان کو
مر جاتے ہیں قیدی ترے زنداں سے نکل کر

یاں معرکہ مہندی سے ہے باہر تو ٹک آ تو
خون جگری دیدۂ گریاں سے نکل کر

پکھراج کے آگے تو تری دیکھ لوں میں بھی
زردابۂ اشک آئے جو مژگاں سے نکل کر

نازک ہے دل یار بہت چاہیے مجھ کو
فریاد کروں عالمِ امکاں سے نکل کر

تاریکی میں ہوتا ہے اسے وصل میسّر
پروانہ کہاں جائے شبستاں سے نکل کر

کیا جانیے منھ دیکھیں کے کب وصل کے دن کا
ہم لوگ عذابِ شبِ ہجراں سے نکل کر

اس تیر کا پیکاں بھی ہلالی ہے نہ بچ جائے
تا مرغ کوئی پہلوے پیکاں سے نکل کر

کیا رستمی اس کی نگہِ شرم کی کہیے
ستھراؤ کیے ہیں وصفِ مژگاں سے نکل کر

آخر ہوئی زاہد کے لیے دامِ اسیری
زنّار رگِ گردنِ ایماں سے نکل کر

تنہائی کے گوشے میں اک آرام ملا ہے
جاؤں میں کہاں مصحفی اب یاں سے نکل کر

174

موجِ نکہت کی صبا دیکھ سواری تیّار
خار سے کی ہے گلِ تر نے کٹار تیّار

1۔ ل : مد

کہہ[1] دو مجنوں سے کرے اپنی سواری تیّار — آج یاں ہوتی ہے لیلیٰ کی سواری تیّار
ہاتھ دونوں کفِ افسوس کی صورت لکھے — کی جو نقّاش نے تصویر ہماری تیّار
تیغ کو سان پہ رکھا تھا تبھی قاتل نے — گردن اپنی نہ ہوئی تھی ابھی ساری تیّار
لبِ جاں بخش کی تیرے جو صفا کو دیکھے — آبِ حیواں ہو پئے آئینہ داری تیّار
کسی مِسی زیب کا گلشن سے سنا ہے جانا — برگِ سوسن نے جو پھرکی ہے کٹاری تیّار
ہم سبک روح اسیروں کے لیے لازم ہے — قفسِ گل کو کرے بادِ بہاری تیّار
ہار کیوں اس کے گلے کا میں نہ ہوں زرگر نے — کی ہے زنجیر گلے کی ترے بھاری تیّار
اے اجل زیست کا کیا ان سے تو مانگے ہے حساب — جو ہیں ہر دم پئے انفاس شماری تیّار
سرخ نیفے سے پے صیدِ دلِ بوالہوساں — کمر اس کی ہوئی جوں یوز[2] شکاری تیّار
جوں جوں بڑھتے ہیں مرے دست جنوں کے ناخن — ووں ووں ہوتے ہیں پئے سینہ فگاری تیّار
پُتلیاں جائے ستاروں کی ٹکی ہیں اس میں — دیدہ ریزی سے ہوئی کفش تمھاری تیّار
ہو خجل کیونکہ نہ نعماں کہ گلابی لالہ — مے سے کرتی ہے تری چشم خماری تیّار
از برائے کمرِ نازکِ رشکِ رگِ گل — باغباں کیجو تو پھولوں کی کٹاری تیّار

لکھ بہ تبدیلِ قوافی غزل اک مصحفی اور
نافۂ نقطہ سے کر مشکِ تتاری تیّار

175

کر کے ورزش جو ہوا وہ مہِ تاباں تیّار — جان دینے کو ہوئے گبر و مسلماں تیّار
وقتِ صنعت کے ہی صانع نے ترے چہرے میں — نوکِ مژگاں سے کیا خالِ زنخداں تیّار
کشتنی ہو کہ نہ ہو قاعدہ ہے یوں ان کا — دمِ شمشیرِ ستم رکھتے ہیں خوباں تیّار
چشمِ عبرت سے کوئی دیکھے تو صانع نے کیے — صفحۂ خاک پہ کیا کیا نہ گلستاں تیّار
میں بھی اس کو میں یہ بگڑا کہ خبر اس کو ہوئی — مجھ سے لڑنے کو ہوا رات جو درباں تیّار

1۔ ل سے اضافہ 2۔ یوز = تیندوا

اے کماں دار چمن میں ترے تیروں کے لیے
غنچے کرتے ہیں سرِ شاخ سے پیکاں تیّار

قصد ہے آبلہ پاووں کے ادھر آنے کا
رکھیو اے دشتِ جنوں خارِ مغیلاں تیّار

قیس نے رختِ سفر نجد سے جس دم باندھا
ساتھ چلنے کو ہوئے اس کے غزالاں تیّار

عقلِ اول کے یہی بات تخیّل میں نہ تھی
اک کفِ خاک سے ہو پیکرِ انساں تیّار

چاک کرنے کو ترے دستِ جنوں موج کی طرح
دم بدم ہووے ہے یاں تازہ گریباں تیّار

قالبِ آدمِ خاکی نہیں صانع نے کیا
روح کے واسطے اک طرفہ یہ زنداں تیّار

نگہِ زخم زنی تیغ تری رکھتی ہے
دستِ ہر حلقۂ جوہر میں نمک داں تیّار

کس کے زخمی کی ہے گلشن میں خبر آنے کی
غنچے کرتے ہیں جو دن رات نمکداں تیّار

طائرِ سدرہ کے بچنے میں تامل ہے مجھے
اس نے تیروں کے کیے پھر پرو پیکاں تیّار

بیقراری نے مرے زخم کو سینے نہ دیا
گرچہ تھیں بہرِ رفو سوزنِ مژگاں تیّار

فتنے لاکھوں یہ اسی نے تو اُٹھائے جس کے
کُن کے کہنے میں ہوا عالمِ امکاں تیّار

مصحفی گریۂ خونیں سے مری آنکھوں نے
اس کے کوچے میں کیا روضۂ رضواں تیّار

176

ہے دل کے سویدا کا مرے خالِ ذقن چور
اور رنگ کا ہونٹوں کے ترے لعلِ یمن چور

آگے یہ صباحت تھی کہاں رنگ میں اس کے
ہے ناخنِ پا کا ترے ہر برگِ سمن چور

اس گل کے اگر لب سے ہنسی لب تلک آوے
تو رشک سے ہو موجِ تبسم کا دہن چور

مت غارتِ ایام سے غافل ہو کہ تا مرگ
در پے کفنِ مردہ کے رہتا ہے کفن چور

مردے پہ بھی یہ دیکھ نہیں سکتے کفن کو
خسّت سے زمانے کی ہوئی خلق کفن چور

مشکل ہے بہت حسن کی منزل سے گزرنا
واں زلف ہے طرّ ار تو ہے خالِ ذقن چور

تنگ آیا ترا سرو کے اندام پہ جامہ
اس لاغریِ تن پہ تو کہتا ہے بدن چور

سب سال مری عمر کے اس نے ہیں چرائے مدت سے میں تاڑا ہے کہ ہے چرخِ کہن چور

سرقہ سے برا مانیے کیوں مصحفی سچ ہے
کہتے ہیں جسے شاعری یہ[1] آپ ہے فن چور

177

کچھ کاغذی جامہ ہی نہیں تیرا بدن چور زلفیں بھی نظر آتی ہیں مجھ کو تو شکن چور

آتی نہیں ہونٹوں پہ نظر پان کی لالی غنچے کی طرح بسکہ ہے اس گل کا دہن چور

تھالی کے چرا لینے کا شاید ہے ارادہ جاتا ہے چلا شمع کا جو سوے لگن چور

لیتا جو مرا خوں بھی مِلا تُو تو نہ رہتا مہندی[2] میں تری ہاتھ کے اے سیم بدن چور

وا ہووے اگر اس کی کمندِ خمِ گیسو نزدک[3] سے چلے آویں ابھی بستہ رسن چور

تہمت کوئی کیوں رکھے نسیم اور صبا پر رنگ اپنے کے جب آپ ہوں گلہاے چمن چور

موقوف نہیں مردے پہ یاں چاندنی شب میں لے بھاگے ہے مہتاب کی چادر کو کفن چور

شب دزدیے[4] بوسے سے ہوا شاد میں اتنا لے جاوے چرا کر کوئی جوں لعلِ یمن چور

بو نازکی آتی ہے مجھے نافوں سے ان کے اس کاکلِ مشکیں کے ہیں آہوے ختن چور

مت باندھیو اے مصحفی مضموں تو کسی کا
ہے ننگِ خلائق وہ جو شاعر ہو سخن چور

178

کیا خاک کرے رہ کے یہ دل تنگ زمیں پر جب سینہ زنی کو نہ ملے سنگ زمیں پر

ساغر کی طرف چشمِ طلب سے جو میں دیکھا ساقی نے گرا دی مے گل رنگ زمیں پر

گر لڑ پڑیں شاعر بھی تو کیا اس کا عجب ہے ہوتی ہے زمیں داروں میں نت جنگ زمیں پر

1۔ ل : ہے آپ یہ 2۔ مہندی کا چور = وہ جگہ جہاں مہندی لگنے سے رہ جائے

3۔ نزدک ؟ 4۔ دزدیہ بوسہ = چوری چوری بوسہ لینا

دل اور سیاہ ہوگئے ماہِ رمضاں میں | اک حوض ہے آئینۂ نیرنگ زمیں پر
نقشہ کہوں کیا روے عرق ناک کا تیرے | ٹپکے ہے ہر اک قطرے سے ارژنگ زمیں پر
جوں نقشِ قدم رہتے ہیں کر جاتے ہیں یعنی | یوں زیست بسر صاحبِ فرہنگ زمیں پر
خوں ریزیِ گردوں سے دلا رہ نہ تو غافل | ہر روز یہ لاوے ہے نیا رنگ زمیں پر
تیرتھ سمجھ اس کو وہ گر اشنان کو آوے | اشکوں نے بہائے ہیں مرے گنگ زمیں پر
پانو کو حنا کس نے لگائی تھی دو رویہ | بہتا تھا لہو تا بہ شتالنگ[1] زمیں پر
کاوش ہے صبا کو بھی کفِ خاک سے میری | رہنے کا مرے کون سا ہے ڈھنگ زمیں پر
کُشتے تھے تری چشمِ خماری کے جہاں دفن | واں سبزے کی جا سبز ہوئی بنگ زمیں پر

اے مصحفی کیا خاکِ رہ اس شوخ کا ہوں میں
ہو پانو کا رکھنا بھی جسے ننگ زمیں پر

179

نالہ سر کھینچے ہے یوں سینے کو اکثر توڑ کر | نخل جوں نکلے کوئی پتھر سے پتھر توڑ کر
باسلیقِ[2] عاشقاں میں تھے رگِ خارا کے ڈھنگ | پھر نہ آیا جو گیا فصّاد نشتر توڑ کر
ساقیِ میخانہ کا گر کم دہی پر ہے مزاج | ہم بھی یک فنجاں بنالیویں گے ساغر توڑ کر
سوزِ دل کیا اس کو ہووے ضد کے مارے جو حریف | آگ میں دیوے جلا بالِ کبوتر توڑ کر
قتل گاہِ عاشقاں میں منفعل کیا کیا ہوئے | سخت جانوں پر دمِ شمشیر و خنجر توڑ کر
کیا کیا اس کا کسو نے باغ سے جاتی رہی | سر درختوں کے ہزاروں[3] بادِ صرصر توڑ کر
تجھ کو اے صیّاد کاوش ہی اگر منظور ہے | تو چمن میں چھوڑ دے مجھ کو مرے پر توڑ کر
کہہ دو لیلیٰ سے کہ ہے وہ ضعف کے زنداں میں قید | کیوں کہ نکلے بیڑیاں مجنونِ لاغر توڑ کر
اے فلک تو کم نہ جان اس کو مرے نالے کا تیر | پار جاتا ہے گزر سدِ سکندر توڑ کر
دستِ بے صبری برا ہووے ترا یہ کیا کیا | ڈال دی دامن میں میرے سلکِ گوہر توڑ کر

1۔ شتالنگ = ٹخنہ 2۔ باسلیق = ہاتھ کی رگ 3۔ ل :ہزاروں شاخ صرصر توڑ کر

بدشرابی[1] سے تمھاری سوجھتا ہے یہ مجھے — جاؤ گے تم شیشۂ دل کو مکرر توڑ کر
چاہیے ہے یہ کہ دیویں دستۂ دل کو شکست — ناز سے طرفِ کُلہ ترکانِ دلبر توڑ کر

رشک سے فرصت نہ پائی ورنہ میں شب مصحفی
پھینک دیتا شانۂ زلفِ معنبر توڑ کر

180

یوں خطِ چینِ جبیں سے ہے وہ چہرہ شان پر — جس طرح ہوتا ہے طغرا خوش نما قرآن پر
اہلِ معنی اس قدر محتاجِ زینت کے نہیں — گو نہ سرلوحِ مذہب[2] ہو سرِ دیوان[3] پر
چار موجہ کا عناصر کے ہمیں اندیشہ تھا — لے گئی آخر جہاز اپنا ہوا طوفان پر
آئینہ دیکھ اس نے اپنے عکس کا بوسہ لیا — ڈر ہے کیا گر رکھ دیا قرآن کو قرآن پر
مردِ بے جوہر نہ پاوے آبرو تقلید سے — تیغِ چوبیں کو کبھی چڑھتے نہ دیکھا سان پر
کیا اٹھاوے وہ تکانِ رشتۂ زنارِ زلف — جھونک بالی کی گرانی ہووے[4] جس کے کان پر
روح کی صحبت سے عزت نفس نے پائی کچھ اور — کد[5] خدائے خانہ کو نازش ہے اس مہمان پر
زہرہ ہر شب لاوے ہے تیرے لیے اے رشکِ ماہ — ہار پرویں کا لگا کر ماہ کے گلدان پر
بے ادب اتنا تو میں کب تھا یہ ہے اقبالِ بخت — لب سے ہو بوسے کو لغزش جا[6] رہے دندان پر
اہلِ دنیا کو بنایا گو خدا نے پاے پیل — چاہیے صدمہ نہ پہنچے مورچے کی جان پر
قتل کرنے کی غریبوں کے کوئی ہے یہ بھی وضع — رحم کیا تم کو نہیں آتا کسی انسان پر

نعمتِ الواں[7] زمیں میں گر نہیں تو مصحفی
خوان پوشِ آسماں واژوں[8] ہے کیوں اس خوان پر

1۔ بدشرابی = بری طرح شراب پینا؟ 2۔ مذہب = جس پر سونے کا کام ہو 3۔ ل: مرے دیواں پر
4۔ ل: گرانی کرتی ہو جس کان پر 5۔ کدخدائے خانہ = صاحبِ خانہ 6۔ ل: چاہیے
7۔ نعمتِ الوان = قسم قسم کی نعمتیں 8۔ واژوں = اوندھا

181

ہے آئینے میں اک اس کی نظر اور اک نظر ہم پر
کرو انصاف یارو ہے مصیبت کس قدر ہم پر

کہے ہے اک مہینے میں جوابِ خط میں لاؤں گا
گماں جینے کا رکھتا ہے ہمارا نامہ بر ہم پر

شبِ رحلت میں اس کی اے اجل تو کام کر[1] اپنا
خدا جانے کہ کیا آوے بلا وقتِ سحر ہم پر

نہیں جانے کا تبریدوں سے تیری سوز سینے کا
دماغ اپنا جلاتا ہے عبث تو چارہ گر ہم پر

خدا جانے کہ کس سروِ رواں کے ہم ہیں شیدائی
چمن میں جائیں تو خمیازہ ڈالے ہر شجر ہم پر

اسیری کاش تو کنجِ عدم ہی میں ہمیں رکھتی
قفس ہے بیضہ فولاد سے بھی تنگ تر ہم پر

ثنائے سلکِ دنداں کا صلہ شاید یہ ہوتا ہے
نچھاور کرتے ہیں اشکوں[2] کی جو سلک گہر ہم پر

انھیں کس واسطے صیاد ڈورے سے تو باندھے ہے
گراں ہیں ان دنوں آپھی ہمارے مشت پر ہم پر

زبانِ شکر ہووے خار و خس کا اپنے ہر شعلہ
گرے برقِ تبسم سے گر اس کی ایک شرر ہم پر

دلِ نازک کا شیشہ اپنے ہم رکھتے ہیں پہلو میں
سمجھ کر پھینکیو اے باغباں گل اور ثمر ہم پر

درختِ گلشنِ تصویر ہیں اے مصحفی ہم تو
لگاوے گر کوئی، کیوں کر لگیں تیر و تبر ہم پر

182

رکھی یہ طرفہ حکیموں نے لاگ پانی پر
کہ نفت سے یہ لگاتے ہیں آگ پانی پر

شکار کھیلنے[3] آیا جو بر لبِ دریا
تو دیکھ عکس وونہی ڈالی باگ پانی پر

خیالِ زلف میں یہ غرق تھا کہ میرے تئیں
ہر ایک موج نظر آئی ناگ پانی پر

مجھے تو کام صبوحی کا تجھ سے لینا ہے
ابھی سے ساقی تو لایا یہ راگ پانی پر

ہوا[4] ہوں اتنا سبک میں کہ استخواں میرے
پھریں ہیں ترتے ہوئے جیسے جھاگ پانی پر

بنے ہیں عکسِ شفق سے جو قمقمے سے حباب
کوئی تو کشتی میں کھیلے تھا پھاگ[5] پانی پر

1۔ ل : کر کام تو اپنا 2۔ل : اشکوں کی بوندیں جو گہر ہم پر 3۔ ل :کھیل کے

4۔ ل، ب : ہوا ہوں اتنا سبک ہو 5۔ پھاگ کھیلنا = ہولی (پھاگن) کا رنگ کھیلنا

لگی ہے خشکی میں آتش جمالِ دوست سے یاں　　دا! تو بیٹھ کے کشتی میں بھاگ پانی پر
ہر ایک موج میں دلہن کی بو جو آتی ہے　　بہایا کس نے یہ عطرِ سہاگ پانی پر
بنے نہ کیوں لبِ ساحل مرقعِ تصویر　　کہ ہے بتوں کا ہجومِ پراگ پانی پر
ہوئی ہیں کیا کسی کشتی نشیں کی وارفتہ　　بطیں جو گاتی ہیں شب کو بہاگ[1] پانی پر

محیطِ چشمِ ترِ مصحفی ہیں یوں مژگاں
کہ جیسے پھیلے ہے ناڑی کا ساگ پانی پر

183

انجام ہو کیا دیکھیں یہ آغاز ہے کچھ اور　　طرزِ نگہِ حوصلہ پرواز ہے کچھ اور
عنقا ہوں نہ سیمرغ ہوں پر سمجھوں ہوں اتنا　　اس گم شدگی میں مری پرواز ہے کچھ اور
کیا تازہ کوئی غنچہ کھلا آج چمن میں　　جو مرغِ نواسنج کی آواز ہے کچھ اور
یاں بے خبراں رقص پہ لعبت[2] ہی کے غش ہیں　　واں بھید پسِ پردۂ شب باز[3] ہے کچھ اور
گو اس کی حیا بھی تو نہیں لطف سے خالی　　پر توسنِ تازی[4] کی تگ و تاز سے کچھ اور
لیتا ہے تصور سے مزہ وصل کا عاشق　　اس سحرِ مجسّم میں یہ اعجاز ہے کچھ اور
ہیں حسن کی تصویر کے رفتہ[5] تو ہزاروں　　خوبی کا تری پر ورقِ ناز ہے کچھ اور
خالی رگِ گردن سے نہیں دیکھو جہاں تک　　اس دشت کا ہر خار سرِ افراز ہے کچھ اور

اے مصحفی سمجھے ہیں ہمیں اپنا وہ جی سے
گو وضعِ نگاہِ غلطِ انداز ہے کچھ اور

184

کہنے کا مرے شعر کے انداز ہے کچھ اور　　سحر اور ہے اور رتبۂ اعجاز ہے کچھ اور

1۔ بہاگ = ایک راگ　　2۔ لعبت = گڑیا　　3۔ شب باز = کٹھ پتلی　　4۔ ل : توسن شوخی
5۔ رفتہ = عاشق

نسبت مجھے کیا زمزمہ سنجانِ چمن سے　　ہوں طائرِ سدرہ مری[1] پرواز ہے کچھ اور
نغمہ ہے مرا زمزمۂ طائرِ قدسی　　اور نغمۂ مرغانِ خوش آواز ہے کچھ اور
صعوہ نے نہ پایا کبھی شاہین کا رتبہ　　کنجشک ہے کچھ اور تو شہباز ہے کچھ اور
سو زمزمے نکلیں ہیں مرے تارِ نفس سے　　نے چنگ نہ قانون[2] ہے یہ ساز ہے کچھ اور
سم[3] لیوے ہے اس دشت میں رستم کا بھی گھوڑا　　الحق کہ میں میدانِ تگ و تاز ہے کچھ اور
فیضی کا دہن یہ ہے کہ ہو روکشِ عرفی　　ناگور ہے کچھ اور تو شیراز ہے کچھ اور

فخریہ غزل یہ تو لکھی مصحفی تو نے
اب[4] اور بھی کہہ جا وہ جو انداز ہے کچھ اور

185

آنے کا شبِ وصل کے انداز ہے کچھ اور　　انداز ترا اور تو یہ ناز[5] ہے کچھ اور
میں خوش جو ہوا دیکھ کے یاقوتِ لب اس کے　　سمجھا نہ وہ جی میں یہ نظر باز ہے کچھ اور
ایذا نہیں دیتا میں کسی[6] دامِ قفس کو　　جوں رنگِ پریدہ مری پرواز ہے کچھ اور
میں فکر میں اس کی کہ کہیں وصل ہو اس کا　　اس پر یہ غضب فکر در انداز ہے کچھ اور
ملنا ترا رستے میں ہوا موجبِ شادی　　آرے خوشیِ کارِ خدا ساز ہے کچھ اور
ہوتا ہے خجل نغمۂ داؤد بھی اس جا　　یعنی وہ[7] گلا اور، یہ آواز ہے کچھ اور
صدقے نہ کروں اس پہ میں کیوں کبکِ دری کو　　رفتار تری اے بتِ طنّاز ہے کچھ اور
رخ سے ترے تصویر پری لگ نہیں سکتی　　یعنی تری تصویر کی پرواز ہے کچھ اور
نالے کا حیا پیشہ کے انداز ہے کچھ اور　　بندوق ہوادار کی آواز ہے کچھ اور
گویائی کا عشاق کی انداز ہے کچھ اور　　اپنے لبِ خاموش کی آواز ہے کچھ اور
فریاد حدی خواں کا تو انداز ہے کچھ اور　　ناقوسِ صنم خانہ کی آواز ہے کچھ اور

1۔ ل : مرا　2۔ قانون = پیانو　3۔ سم لینا = گھوڑے کا ٹھوکر کھانا۔　4۔ ل: اب اس میں بھی
5۔ ل : ہے ناز ترا اور　6۔ل : کبھی　7۔ل : یہ

سر رکھ کے مرا نوک پہ شمشیر کی قاتل کہتا ہے یہ مقتول سرِ افراز ہے کچھ اور

یہ قدر نہیں زمزمہ سنجانِ چمن کی[1]
گلشن میں ترا مصحفی اعزاز ہے کچھ اور

186

مشکل ہے ہم شبیہ مرا مجھ سا ہو دلیر ہرگز کوئی کبھی نہ کہے تینڈوے[2] کو شیر

اس کا مقام فوق ہے اس کا مقام تحت صورت کے بیچ گو کہ ہو مانا زبر نہ زیر

نازک بدن کا اس کو ملا مرتبہ کہاں جھر بیری کے بھی بیر کو کہتے ہیں یوں تو بیر

آتش نفس خیال میں لاتا ہے کب اسے جس کا کلام ست ہو کوڑے کا جیسے ڈھیر

بُرّش نے مصحفی مری تیغِ زبان کی
کیا کیا نہ سرکشوں کو کیا[3] ہے رُلا کے زیر

187

نظر پڑیں ہیں کچھ آثارِ یار اور سے اور سماں دکھاوے ہے فصلِ بہار اور سے اور

مریضِ غم کا ترے دم نکل گیا ہوتا قلق رہا یہ شبِ انتظار اور سے اور

کسی سے وصل کا وعدہ وہاں ہوا ہے جو آج ہے اضطرابِ دلِ بیقرار اور سے اور

ہم آئے کر کے سفر جوں ہی بعد مدت کے تو دیکھی صورتِ شہر و دیار اور سے اور

مگر کہ تھا مرے قاتل کا اسپ پھلواری ہوا میں ہووے ہے رنگِ بہار اور سے اور

درختِ حسن ہے اس گل کا کس قدر پُر بار ہمیشہ اترے ہے تازہ انار اور سے اور

ہم اپنے دل میں سدا اور کچھ سمجھتے ہیں فلک دکھاوے ہے لیل و نہار اور سے اور

بہ یک طریق رہا راہِ آشنائی میں اگرچہ ہوگئی شکلِ ہزار اور سے اور

بہ رنگِ نقشِ قدم خاک میں ملا تو بھی
ہوا نہ مصحفیِ خاکسار اور سے اور

1۔ ل : کو 2۔ ل : تینڈووں 3۔ل : کیا زندگی سے سیر

188

مکھڑا چھپا بھی لے، نگہِ آشنا سے ڈر
ہے ہے یہ کیا سلوک ہے کافر خدا سے ڈر

یاں ابتدائے حسن میں مارے پڑے کئی
اے انتہائے عشق تو اس ابتدا سے ڈر

بلبل چمن میں اب نہیں[1] رکھنے کی آشیاں
بیٹھا ہے اس کے دل میں خزاں کی ہوا سے ڈر

کہتے ہیں جس کو عشق دوا اس کی کچھ نہیں
دانا گئے ہیں اس مرضِ لا دوا سے ڈر

قیمت میں دست و تیغ کی میں نے دیا ہے سر
قاتل نہ فکر کر نہ مرے خوں بہا سے ڈر

مجمر بھی پاس چاہیے اس کے کہ ہم نشیں
جاڑوں میں اس کو لگتا ہے ٹھنڈی ہوا سے ڈر

تو نو سفر ہے، راہ میں رہ جائے گا کہیں
مت کربلا کو جا، سفرِ کربلا سے ڈر

آنکھیں تو چاہتی ہے لگا دے پہ کیا کرے
نرگس رہی ہے نازکیِ پشتِ پا سے ڈر

رخسار گل ہیں لال نہ جا صبح باغ میں
نازک بدن طمانچۂ بادِ صبا سے ڈر

امیدوارِ یک نگہِ لطف تھے جو لوگ
آنکھیں جو جھک گئیں گئے طرزِ حیا سے ڈر

کیا جانے کیا ہو دیکھیے عرصے میں حشر کے
ہے مصحفی کو پرسشِ روزِ جزا سے ڈر

189

چہِ ذقن کی ہے وہ سنبلِ رسا زنجیر
کہ ہووے اس کے غریقوں کا آسرا زنجیر

وہ عندلیبِ گرفتار ہوں جو توڑ قفس
طرف چمن کے پَر افشاں ہو لیک پا زنجیر

چمن سے کیونکہ میں دیوانہ جاؤں صحرا کو
ہے میرے پانو کی موجِ گل اے صبا زنجیر

میں مجرموں میں ہوں تیرے[2] اسیر عزت دار
جو بیٹھتا ہوں تو دامن تلے چھپا زنجیر

فقیر ہیں ہمیں کیا کام سیر دریا سے
کہ اپنے پانو کی ہے موج بوریا زنجیر

رہی ہمیشہ ترقی مری اسیری کو
گلے پڑی جو ہوئی پانو سے جدا زنجیر

1۔ ل : نہیں رکھیں گی 2۔ل :ترے ہوں

تمام عمر رکھا اس نے سر فرو میرا ہوئی تھی کیوں مری گردن سے آشنا زنجیر

میں اس پری کا ہوں نازک دماغ دیوانہ ضرور ہے مرے پانو میں کم صدا زنجیر

تری گلی[1] سے جو جانے لگا میں وحشت میں تو سایہ پیچھے سے پانو کے ہو گیا زنجیر

تڑپ تڑپ کے اگر مر گیا وہ زنداں میں ترے اسیر کا مانگے گی خوں بہا زنجیر

جو استخواں کہ مشبّک[2] تھے اس کے تیروں سے نہ آیا پاس انھیں جان کر ہما زنجیر

گلی سے اس کی مرا مرغِ نامہ بر نہ پھرا مگر کہ اس کے لیے ہو گئی ہوا زنجیر

رہا اسیر میں زندانِ ہجر میں یاں تک
کہ مصحفی ہوئی آخر کو توتیا زنجیر

190

مغرور کیوں نہ ہو سرِ عاشق وہ کاٹ کر تیغ اس کی اور تیز ہوئی خون چاٹ کر

میں سخت بے دماغ ہوں فریاد عندلیب مت سیر باغ سے تو مرا جی اچاٹ کر

یوں چشم تر سے چہرے پر آنسو ہوئے رواں دریا سے جیسے لاوے کوئی نہر کاٹ کر

اے دیدہ جا کے تربت مجنوں پہ خوب رو تختے کو سنگِ قبر کے دریا کا پاٹ کر

ملبوسِ خسروی کے میں قابل نہیں اگر یا رب نصیب میرے گدائی کا ٹاٹ کر

اے بحرِ حسن بھاگے ہے کیا میرے خون سے رنگیں کبھی تو اپنی سروہی[3] کا گھاٹ کر

قالب ہو مصحفی کا جو دیرِ مغاں میں خاک
یا رب تو اس کو راح[4] مروّق کا ماٹ کر

191

سنبل لٹا[5] ہے زلف کے بالوں کو دیکھ کر کمھلا گئے ہیں گل ترے گالوں کو دیکھ کر

1۔ ل: گلی میں 2۔مشبّک = جالی دار 3۔سروہی = مارواڑ کا ایک قصبہ کوہِ آبو کے نزدیک جہاں کی تلوار مشہور ہے۔ 4۔ راح = شراب مروّق = مصفا، ماٹ = مٹکا 5۔لٹنا = دبلا، کمزور ہونا (سنبل کو مذکر باندھا ہے)

نقشا ہے ان کی چشم میں لیلیٰ کی چشم کا مجنوں ہو شاد کیوں نہ غزالوں کو دیکھ کر
میں کھائیاں ہیں دل پہ دبستانِ عشق میں چھڑیاں ستم کی تازہ نہالوں کو دیکھ کر
کیا جانے رفتہ رفتہ تو کس کس کو دے فریب عقل اپنی دنگ ہے تری چالوں کو دیکھ کر
پہلے تو یاس محض تھی تسکین دل ہوئی پہلو میں تیرے تیروں کے بھالوں کو دیکھ کر
بانکوں نے بانکپن کو رکھا اپنے طاق پر اس عہد میں اکڑتے رذالوں کو دیکھ کر
نکلیں ہیں ڈھنگ ان میں تری چشمِ سرخ کے
کیوں مصحفی نہ شاد ہو لالوں کو دیکھ کر

192

ہوسِ روے بِنکو اے دلِ ناکام نہ کر عشق کا ننگ ہے تو عشق کو بدنام نہ کر
رعد ہو، برق ہو، سیماب ہو، شعلہ ہو، شرار گر تو عاشق ہے دِلا ایک دم آرام نہ کر
جا کے اے روح نہ آ قالب خاکی میں تو پھر ہو کے آزاد ہوائے قفس و دام نہ کر
گردش چشم سے تو خاک میں دے مجھ کو ملا انتظارِ ستمِ گردشِ ایام نہ کر
اشکِ خونیں سے بنا نامے کو اپنے رنگیں یار رنگیں کو سیاہی سے خط ارقام نہ کر
سفرِ مرگ کو اک مرکبِ تابوت ہے بس زاد گو پاس نہ ہو، فکرِ سر انجام نہ کر
مصحفی رام کیے سے نہیں ہوتے یہ شوخ
عمر ضائع[1] پئے طفلانِ گل اندام نہ کر

193

اپنے نیرنگ نہانے کو صنم عام نہ کر قفسِ مرغ کو طاؤسِ لبِ بام نہ کر
جس نے مجنوں کو سکھائی ہے بیاباں گردی وہی کہتا ہے کہیں ایک دم آرام نہ کر
عشق صادق میں بھی ہے جان کی جوکھوں اے دل شاد رہ ہجر میں اور وصل کا پیغام نہ کر

1۔ ل : زائع (نسخہ میں اس طرح کی غلطیاں بہت ہیں جنھیں قلم انداز کیا گیا)

قتلِ عاشق کو ترے چینِ جبیں کافی ہے لبِ نازک عبث آلودۂ دشنام نہ کر
آخر اے نرگسِ مکحول[1] تو قدر اپنی سمجھ ہوسِ ہمسریِ نرگسِ بادام نہ کر
صبر کہتا ہے رہِ عشق میں رہ پا بر جا شوق کہتا ہے کہیں ایک دم آرام نہ کر
مصحفی اپنی تو مقسوم پہ راضی رہ یار
شکر کی جا ہے، عبث شکوۂ قسّام نہ کر

194

دم بدم پردۂ رخ زلفِ سیہ فام نہ کر صبحِ امیدِ غریباں کے تئیں شام نہ کر
خالِ عارض پہ نہ رکھ، غارتِ اسلام نہ کر کافری زلف کے اب بس ہے تو یہ کام نہ کر
دلِ بیمار تو رکھ اپنے جگر پر دنداں سیبِ رخسارِ بتاں میں طمعِ خام نہ کر
کچھ تو اے شیخ تو رکھ خفیہ نویسوں کا بھی ڈر خفیہ ہر ایک سے یوں نامہ و پیغام نہ کر
دم بدم اس کی طرف اے دلِ بے صبر نہ جا آپ کو بہرِ خدا موردِ الزام نہ کر
مصحفی مرگ کا عاشق ہے تو جیتے جی بھی
خشتِ تربت کے سوا بالشِ آرام نہ کر

195

میں تم سے کیا کہوں کہ جگر میرا چاٹ کر جاتے رہے وہ گھر کو مرے لوٹ لاٹ کر
ازبسکہ اس کی اور ہوئی روشنی زیاد گل گیر منفعل ہے سرِ شمع کاٹ کر
عاشق کا پانو جس میں پھسل جائے اے فلک اتنا بھی اس گلی کا نہ رستہ سپاٹ کر
گھر جا کے زیرِ سنگِ الم دیر تک رہے جو سنگ سے گئے تھے میری قبر پاٹ کر
قاتل کو میں نے خطِ غلامی دیا ہے لکھ یعنی وہ لے گیا ہے مرا ہاتھ کاٹ کر
پڑتی نہیں ہے اس میں ترے نور کی چمک[2] اے ماہ رو نہ پردۂ در اپنا ٹاٹ کر

1۔ مکحول = سرمہ لگی آنکھ 2۔ ل : جھلک

سیرِ بروج سے مجھے کیا کام مصحفی
اس راہ میں نہ میرے تئیں بارہ[1] باٹ کر

196

کوچۂ یار سے آوارہ مری خاک نہ کر
یہ ستم مجھ پہ تو اے گردشِ افلاک نہ کر

موسمِ گل ہے ذرا کھیلنے ہنسنے دے انھیں
لالہ وگل کے گریباں کو صبا چاک نہ کر

دل دیوانہ، جنوں اور فزوں ہووے گا
باغ میں وقفہ بہ زیرِ شجرِ تاک نہ کر

وادیِ نجد کا میں بھی تو ہوں رہنے والا
اتنا رَم[2] مجھ سے تو اے آہوے چالاک نہ کر

اس کو رہنے دے پڑا یوں ہی غشی میں لیلیٰ
گردِ رخسارۂ مجنوں تو ابھی پاک نہ کر

تجھ سے چتون میں ترا کشتہ یہی کہتا ہے
یوں ہی رہنے دے مجھے بستۂ فتراک نہ کر

چشمِ مخمور پہ نرگس کے ترحّم ہے ضرور
غنچۂ لالہ نہاں اس سے تو تریاک نہ کر

جا نہ حمام میں اے شوخ نہانے کے لیے
ہے تو نازک ہوسِ کیسۂ دلّاک[3] نہ کر

مصحفی جامۂ عریاں بدنی میں خوش رہ
گر تو آزاد ہے تو خواہشِ پوشاک نہ کر

197

عرقِ چہرہ تمازت میں صنم پاک نہ کر
آتشِ رخ سے جلا کر تو ہمیں خاک نہ کر

سرِ مذبوح کو عاشق کے لٹکنے دے وہاں
تو بھی اے صیدِ حرم حسرتِ فتراک نہ کر

اس کے کوچے میں تو جا سیلِ خروشاں کی طرح
دے بہا سب کو خیالِ خس وخاشاک نہ کر

نمکِ سودہ سے بھر رکھ تو ہر اک زخم اس کا
اس سوا اور علاجِ دلِ غمناک نہ کر

کھینچ کے تیغ مرے سر پہ نہ جا جانبِ غیر
یہ ستم مجھ پہ تو اے دلبرِ سفّاک نہ کر

یاد وہ تجھ کو نہ ہووے گا مرا پھر بھی کبھی
پڑھ کے نامے کو مرے بہرِ خدا چاک نہ کر

1۔ آسمان کو بارہ برجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔　2۔ رَم کرنا = گریز کرنا　3۔ دلّاک = بدن ملنے والا

وادیِ نجد کی منزل بھی قریب آ پہنچی دل میں اندیشہ اب اے ناقۂ چالاک نہ کر
کُرتے بھیجے ہیں تجھے لیلیٰ نے سی کر مجنوں گردِ صحرا کے تئیں اپنی تو پوشاک نہ کر
دخترِ رز کا تجھے عشق ہے گر اے زاہد تاک کی چوب سوا اور مسواک نہ کر
مصحفی تیری تو چق چق نے جلا ڈالا جی
بیٹھ رہ بے، گلۂ گردشِ افلاک نہ کر

198

دیکھا میں رات جا کے تماشا چمن میں زور ہوتا تھا اختلاط گل و یاسمن میں زور
پایا ہے تو نے کچھ تو کہ آج اے بہار ناز ہے اک شگفتگی ترے کنجِ دہن میں زور
ہو کر اُڑے گا پیرہنِ صبر دھجیاں یوں ہی جنوں کرے گا جو دیوانہ پن میں زور
رویا میں نا امیدی پر اس کی کہ صبح دم پروانہ گر کے شمع سے تڑپا لگن میں زور
کوئی فتنہ سمجھے ہے کوئی عطرِ سہاگ اسے ہیں تیری بوے زلف کے چرچے ختن میں زور
آ کے ترے رقیب نے اٹھوا دیا ہمیں اپنا تو کچھ چلا نہ تری انجمن میں زور
رنگینیِ بدن کا کروں کیا بیاں کہ ہاے اک تہہ گلابی سی ہے ترے پیرہن میں زور
زخموں سے تیرے اٹھتی ہیں مرقد میں موجِ خوں وہ کشتے دیکھتے ہیں بہاریں کفن میں زور
غربت رکھے ہے ان کی مکافات میں اسیر ق چندے جو ہم نے عیش کیے تھے وطن میں زور
خارا تراشی اس کے تئیں سہل بات تھی رکھتا تھا جب تلک کہ وہ اپنے بدن میں زور
اے تیشہ کر مدد کہ رہائی ہو رنج سے بس اب رہا نہیں ہے تنِ کوہ کن میں زور
کیا مجھ سے ہاتھ اپنا ملاوے وہ مصحفی
اتنا کہاں ہے پنجۂ چرخِ کہن میں زور

199

ہمیں کھا گیا اک صنم کا غم آخر لبِ گور زندہ ہی پہنچے ہم آخر

نہ روزی ہوا بوسۂ گل بھی ہم کو — گرے خاکِ خواری پہ جوں شبنم آخر
ذرا اور عاشق کی بالیں سے مت جا — کوئی دم میں ہوتا ہے اس کا دم آخر
اکڑنے پہ سنبل کے کب ریجھتا ہوں — میں زلفوں کے دیکھے ہیں پیچ و خم آخر
مجھے خوب اس نے رجھایا خدایا — کسی طرح ہووے یہ روز غم آخر
مری قبر کو یوں نہ ٹھکرا کے چل تو — میں عزت طلب تھا بنی آدم آخر
کر اے آہ نالوں کو اپنے پریشاں — شبِ ہجر بھی ہے شبِ ماتم آخر
میں ہر دم جو دزدیدہ نظروں سے دیکھا — مزاجِ حیا ہو گیا برہم آخر
نہ آئینے کو بزم میں اپنی جا دے — یہ رسوائے عالم ہے نامحرم آخر
نہ چرچا کرو میرے دیوانہ پن کا — یہ عالم بھی رکھتا ہے اک عالم آخر

سبھی قدر کرتے ہیں یاں مصحفی کی
نہیں اس قدر بھی تو عزت کم آخر

200

کاکل وہاں کھلے جو سرِ بام دوش پر — یاں بندھ گیا سفر کا سرانجام دوش پر
میں ساتھ تھا جو جانبِ مکتب رواں ہوا — قرآن ورحل رکھ کے وہ گل اندام دوش پر
حوروں سے کیا کروں مے کوثر کی آرزو — دستِ فرشتگاں میں ہو جب جام دوش پر
تاروں سے طفلِ اشک فشاں ہے یہ آسماں — رکھتی ہے جس کو مادرِ ایام دوش پر
کیا پوچھتے ہو خانہ بدوشانِ عشق کی — جاویں جہاں، ہے ان کا در و بام دوش پر
ہے کس کا عزمِ قتل جو پھرتی ہے باغ میں — موجِ ہوا رکھے ہوئے صمصام دوش پر
رندوں نے شیخ جی کو چھکایا یہ راہ میں — جو لے گئے اٹھا انھیں خدام دوش پر
دی اس نے منھ پھرا کے جو گالی کبھی مجھے — بس جھٹ گئی فلک پہ وہ دشنام دوش پر
میں بدگماں ہوا وونہی جاتا تھا باغباں — پشتارۂ حنا کو رکھے شام دوش پر

پھیلا کے پانو سونے کی جا گہ کسے ملی جوں طفل میں کیا تو ٹک آرام دوش پر
مغرور دست برد ہے کیا ایک دن ترے باندھے گی ہاتھ گردشِ ایام دوش پر
مرغانِ باغ اڑ کے گریں اس چمن میں کیا ہر نخل کے کھنچا ہو جہاں دام دوش پر
ہووے نجات اس کی اگر دو قدم بھی یار لے لیوے نعش عاشقِ ناکام دوش پر
میں تیرہ بخت دیکھ سکوں کس طرح بھلا دستِ رقیب اس کے ہو ہر شام دوش پر
سمجھا[1] اساوری[2] میں، دیے جب کہ اس نے چھوڑ مارِ سیاہ زلفِ سیہ فام دوش پر
مجھ سے ہی اس کا بارِ محبت نہ اٹھ سکا کچھ سر پہ ہے گناہ، نہ الزام دوش پر
میں ہوں وہ کم نصیب جو گلشن سے وقتِ صبح لے جاوے باندھ کر ثمرِ خام دوش پر
عارض کو کیا میں دیکھوں، ہے رخ زلف کا ادھر اب آ رہی ہے رونقِ اسلام دوش پر
میں کیا جیوں کہ کاتب اعمال روز و شب دیتے ہیں موت کا مجھے پیغام دوش پر
ہو خفیہ[3] آئی کنگھی کی بُو لے گئی صبا کاکل کا اس کے یوں ہوا نیلام دوش پر
کُشتے کی تیرے نعش کو باہم فرشتگاں بہرِ ثواب لیتے ہیں ہر گام دوش پر

مت جی چرا تو بارِ امانت سے مصحفی
انسان ہے تو اس کو ذرا تھام دوش پر

201

گر اٹھ سکے نہ بارِ غمِ عام دوش پر دستِ فتادہ کو تو بھلا تھام دوش پر
ہوویں گے دل شکار کہ نکلا ہے سیر کو رکھ کر کماں وہ طفلِ گل اندام دوش پر
دیکھے جو خواب میں تری شمشیر آبدار ہووے گا اس کے سر کو نہ آرام دوش پر
ہوتا نہیں کوئی سفرِ مرگ کا رفیق کیوں جم لگا کے لے نہ گیا جام دوش پر
زلف سیاہ و بیض[4] بناگوش یار سے یکجا نظر پڑی سحر و شام دوش پر

1۔ ل سے اضافہ 2۔ اساوری = سواری 3۔ ل: موحضہ (مفہوم غیر واضح) 4۔ بیض = آویزہ؟

دکھلائے ہے وہ صبح بنا گوش، شام زلف　سنبل تلے شگوفۂ بادام دوش پر
اک دن رکھا تھا اس کو جو میں زیرِ بارِ عشق　روغن ملا کیے کئی حجام دوش پر
رہتے تھے اس کے آگے نہ مونڈھے چپے ہوئے　سب کسمسانے کا ہے یہ الزام دوش پر
اک روز بن سرا بھی بناوے گی یہ تجھے　کھولے گی ہاتھ غارتِ ایام دوش پر
کالے کے مَن کا نکلے ہے اس میں مگر فروغ　لہرائے ہے جو زلفِ سیہ فام دوش پر
نازاں نہ ہو عمارتِ تن پر کہ ہے مدام　بادِ فنا کے اس کا در و بام دوش پر

زلفِ سیاہ اس کی گرائے مصحفی ہے شام
جُھمکا ہے آفتابِ لبِ بام دوش پر

202

عاشق ہے اس کی زلفِ سیہ فام دوش پر　گر صبح دم ہے رخ پہ تو پھر شام دوش پر
مارِ سیاہ زلف سوے سینہ تھا رواں　شانے نے ہاتھ دے کے رکھا تھام دوش پر
پھڑکے ہے بازو کس کی تمنائے وصل میں　کرتا نہیں جو پیرہن آرام دوش پر
تاراج میکدہ یہ ہوا کل، کہ لے گئے　مٹکے اٹھا کے رندِ مے آشام دوش پر
پی ہے انھیں سے ہم نے زخود رفتگی کی مے　جھمکوں کے سرنگوں ہیں جو دو جام دوش پر
پہنچے سے تا بہ شانہ میں کھائے ہیں بسکہ گل　طاؤس کے پروں کا ہے یاں دام دوش پر
صیاد پیشہ ہیں یہ مرقّع لباس سب　رکھے پھریں ہیں مکر کا اک دام دوش پر
درہم ہوئی تھیں اس کی جو زلفیں نسیم سے　تھا حشر طرفہ صبح کے ہنگام دوش پر
رکھتے ہیں ڈال کعبہ نشینانِ کوے عشق　لنگی کی طرح جامۂ احرام دوش پر
دستِ تہی سے تھا یہ سکندر کے آشکار　توشہ کمر میں ہے نہ رہ انجام دوش پر

اُتنی ہی راہ کھوٹی ہوئی ہم سے مصحفی
جوں جوں کسا سفر کا سرانجام[1] دوش پر

1۔ سرانجام = اسباب

203

جز دل کے ہو نہ دُرِ ثمیں[1] اس سے خوب تر
آیا نہ دیکھنے میں نگیں اس سے خوب تر

مجھ کو تبسمِ لبِ معشوق کی قسم
دیکھا نہ خندۂ نمکیں اس سے خوب تر

طاعت ہو گر قبول تو عاشق ترا کرے
پیدا برائے سجدہ جبیں اس سے خوب تر

کہتا ہے ماہِ نو کہ اگر تو سوار ہو
لاؤں بنا میں خانۂ زیں اس سے خوب تر

آنسو کا میرے ہو نہ خریدار جوہری
موتی ملے گر اور کہیں اس سے خوب تر

صورت کو اپنی دیکھ بنائی نہیں کبھی
نقاش چیں نے صورت چیں اس سے خوب تر

صنعت گری پہ آوے اگر اضطرابِ عشق
بن جائے آسمان و زمیں اس سے خوب تر

دینِ محمدیؐ کا نہ منکر ہو مصحفی
فہم اپنے میں نہیں کوئی دیں اس سے خوب تر

204

یہ رنگینی نہیں دیکھی رخِ گل ہائے بستاں پر
کفِ پا کا مرے احسان ہے خارِ مغیلاں پر

دلِ مجنوں نہ کانپے کیونکہ پھر رہتا ہے اے لیلیٰ
گناہِ عشق کی نسبت سے رعشہ بیدِ لرزاں پر

نہ پایا بوسۂ لب اس کا ہم نے وصل کی شب بھی
رہے محروم ہی ہم تو پہنچ کر آبِ حیواں پر

برائے زلفِ لیلیٰ شانہ وہ ان کا ہی بنواتا
پہنچتا ہاتھ مجنوں کا اگر شاخِ غزالاں پر

شبِ مہتاب میں دیکھا جو میں تجھ کو نظر آئی
بہارِ برگ داوُدی ترے ماتھے کے افشاں پر

غم و رنج و بلا میری طرف آ کر جھکے آخر
کہ گاہک بیشتر ہوتے ہیں مائل جنسِ ارزاں پر

اسیروں کو نہیں از بسکہ سیرِ باغ کی رخصت
قفس صیاد نے رکھے ہیں دیوارِ گلستاں پر

شبِ ہجراں یہ آہ و نالہ نے مشقِ شدائد کی
کہ رکھنا ہو گیا مشکل مجھے دنداں کو دنداں پر

نہیں اس شعلۂ بے دود کو پروائے مشتاقاں
پتنگے جانفشانی کر رہے ہیں شمع سوزاں پر

1۔ دُرِ ثمیں = قیمتی موتی

دلِ بیمار میں طاقت نہیں ایذا اٹھانے کی
عبث چشمِ طمع سیتا ہے زخمِ دل نمکداں پر
غرض دار و رسن نے زلف کی اتنی تغافل کی
کہ پیاسے مار کر شانے موئے چاہِ زنخداں پر
شبِ ہجراں لکھے گردوں حسابِ وصل کی شب میں
تصور میں کسی کے گر رکھوں مژگاں کو مژگاں پر
رہیں کیوں داغ سینہ شعبدے سے تیرے اے نالے
اڑانا رال کا فائق ہو کیا نور چراغاں پر
اسے پاتا ہے وہ از بسکہ رنگ وَرد سے خالی
لبِ زخمِ جگر ہے خندہ زن چاک گریباں پر

غزل اک اور بھی اے مصحفی تو گرم سی لکھ جا
طبیعت اس گھڑی تیری ہے مثلِ اسپ[1] جولاں پر

205

نہ پہنچے بعد میرے صدمہ تا نخلِ گلستاں پر
خود اپنی فاتحہ دیتا ہوں میں گلہائے حرماں پر
کرے ہے نجد جاتے قطع رہ میں کو تہی ناقہ
کسیں گے محملِ لیلیٰ کو ہم پشتِ غزالاں پر
اگر عاشق کشی یہ ہے تو اک دن دست قاتل ہو
نظر آویں گی موجِ خوں کی تابیں تیغ عریاں پر
تبھی تو زحمتِ عریانی میں میری خوش گزرتی ہے
گوارا ہو گیا ہے بوجھ گردن کا گریباں پر
نہیں روشن ہوئی گر حسن کی اس مہ کے مہتابی
نظر آتی ہے کیوں زردی سی روئے ماہِ تاباں پر
حبابوں نے گر اس کا سینۂ برخاستہ دیکھا
تو پھر لاکھوں گھڑے پانی پڑیں گے جوشِ عماں پر
تبسم سے ترِے لب کی تسلی کیونکہ ہو اس کی
نہیں ہوتا ہے راضی زخمِ دل گردِ نمکداں پر
شبِ فرقت میں کب رونا مرا صنعت سے خالی ہے
کہ کارِ بندر رومی کر رہے ہیں اشک داماں پر
نکالا باغباں نے آخر اس کو باغ سے باہر
مرے نالے سے آفت آگئی مرغِ خوش الحاں پر
کبھی اس بت کو سجدہ کرتے سوئے کعبہ دیکھا تھا
نگاہ خشم گیں کی چل گئی شمشیر رہباں پر
تبسم دزدی اس کی رنگ بے صبری دکھاتی ہے
مگر یہ غنچہ ہنستا ہے کسی کے زخمِ پنہاں پر
گراں یوں حسنِ یوسف پر ہوا حسن اس پری رو کا
کوئی جس طرح سے رکھ دے کبھی قرآں کو قرآں پر
یہ مشتِ خاک قمری کیوں نہ اک ٹھوکر میں اڑ جاوے
بہارِ ناز کا عالم ہے اس سروِ خراماں پر

1۔ ل : مثلِ برق

یہ رتبہ اس کی عصمت کا ہے ان روزوں کہ ہوتی ہے نگاہِ چشمِ مریم بوسہ زن خالِ زنخداں پر

صفا[1] پر ریختہ کی فارسی کو نظم اگر کرتا
تو ہوتی مصحفی وہ طعنہ زن اہلِ صفاہاں پر

206

سلجھا جو ترا طرۂ طرار الجھ کر خوش ہو گیا جی اپنا بیک بار الجھ کر

دیوانہ تری زلف کا سودے کی لہر میں کیا کیا نہیں بکتا سر بازار الجھ کر

بلبل نے دمِ بوسۂ گل جان دی اپنی چھوٹی نہ رگِ گل سے جو منقار الجھ کر

مجلس سے جو آمد میں تری اٹھتے ہیں بعضے گر پڑتے ہیں دامن میں بیک بار الجھ کر

کس زلفِ پریشاں کا تصور ہے جو ہر دم گھبرائے ہے جی اپنا شب تار الجھ کر

لاچار ہو میں بیٹھ گیا دشتِ جنوں میں چھوٹا جو نہ دامن سے مرے خار الجھ کر

کیا جانیے کیا توڑیں ستم جان پہ میری موئے کمر و رشتۂ زنّار الجھ کر

کوچے میں ترے وہ جو ہیں سودائیِ گیسو رنت بخشیں ہیں با سایۂ دیوار الجھ کر

وہ رشتہ بپا مرغ ہوں جس مرغ کا رشتہ رہ جائے بہ خارِ سرِ دیوار الجھ کر

حسرت یہ رہی اس کو کہ صیاد نہ چھوٹا پھندے میں ترے مرغِ گرفتار الجھ کر

جب قتل کو کھینچے ہے مرے وہ بتِ نازک رہ جائے ہے ڈورے ہی میں تلوار الجھ کر

کاکل نہ دکھا مجھ کو کہ طولانیِ شب سے ہوجاوے ہے تھوڑا دلِ بیمار الجھ کر

ناصح میں گریباں کا تجھے حال دکھاؤں رہ جائے جو ناخن میں کوئی تار الجھ کر

اس[2] طرۂ پُر پیچ کی کچھ بات جو نکلی لڑ لڑ پڑے آپس میں کئی یار الجھ کر

سودے میں خمِ زلف کے گھُتِ جاتے ہیں کیسے آپس میں خریدار خریدار الجھ کر

ایسا نہ ہو زنجیر بنیں تیرے گلے کی پگڑی کے تری پیچ، جفاکار الجھ کر

1۔ ل : صفا پہ ریختہ کی فارسی میں 2۔ ل سے اضافہ

اے مصحفی وہ ہار ہوا میرے گلے کا
ٹوٹا شبِ وصل اس کا اگر ہار الجھ کر

207

دلِ رمیدہ جو کوٹا ہے جعدِ خوباں پر — اسے دھیان نہیں اپنے کیا گریباں پر

ہوئی نہ جب ترے دیدار سے اسے سیری — میں ہاتھ رکھ دیا آخر کو چشمِ گریاں پر

فلک کی چال سے مطلق نہیں[1] خبر رکھتا — رکھا ہے کب سے میں یہ شیشہ طاقِ نسیاں پر

یہ چاہتی ہے ترے لعلِ لب کی سرخیِ پاں — کہ سیلِ خون بہے آج کوہِ سیلاں پر

ہر ایک گوشے میں کیا کیا پری وشاں ہیں مقیم — کسے نظر ہے روایاے[2] بزمِ امکاں پر

خدا کو مان یہ بے صرفگی[3] ہے کیا اے چشم — کوئی تو قطرۂ خوں ٹھہرے نوکِ مژگاں پر

نہ اس سے وصل کی اے مصحفی تو رکھ امید
جسے کہ رحم نہ ہو کافر اور مسلماں پر

ز ☆

208

یا ہاتھ میں تھا دامنِ دلدار شب و روز — یا مٹھی میں ہے اب یہ دلِ زار شب و روز

ہرگز نہیں کام اپنے سے بیکار شب و روز — جوں دورِ فلک ہے مری رفتار شب و روز

خورشیدِ قیامت کا وہاں خاک ہو خطرہ — ہو سر پہ جہاں سایۂ دیوار شب و روز

کس طرح سے چھوڑوں میں خیال اس کی کمر کا — پیچیدہ جگر سے ہے یہ[4] زنّار شب و روز

1۔ ل : خبر نہیں رکھتا 2۔روایا ؟ 3۔بے صرفگی = زیاں

☆ ل: آغاز ردیف الزا کہ در ردیف ہذا چہار غزل است 4۔ اصل اور دیگر نسخوں میں ''نہ''

دریائے سرشک اپنے کے طوفاں سے فلک پر | جوں موجِ رواں چلتی ہے تلوار شب و روز
گر آنکھ مہ و مہر سے اس کی نہیں لڑتی | وا رہتے ہیں کیوں رخنۂ دیوار شب و روز
بازار ملاحت میں تو وہ جنس ہے لیلیٰ | بے چین رہے جس کا خریدار شب و روز
بوسہ تو رخِ گل کا کہاں لائقِ تحسیں | ہے زخمِ جگر پر میری منقار شب و روز
صحرائے محبت نے پھنسایا ہے بلا میں | دامن کے چنا کرتے ہیں ہم خار شب و روز
ہم تیشۂ فرہاد کو کیا جانیں کہ یاں تو | آہوں کے دھوئیں سہتے ہیں کہسار شب و روز

بے ہوشی کے صدقے میں کہ دولت سے جنوں کی
تم مصحفی ہوتے نہیں ہشیار شب و روز

209

وہاں تو آئینہ ہر دم دوچار ہے شب و روز | یہاں بہ پہلوئے دل نوکِ خار ہے شب و روز
موئے پہ بھی نہ گئی بے قراریِ عاشق | قیامت اک تہِ سنگِ مزار ہے شب و روز
فریب خوردہ ہے کس کی نگہ کا کیا جانے | دلِ ستم زدہ کیوں بے قرار ہے شب و روز
کہیں وہ غنچۂ مجبوب مجھ سے وا ہووے | اس آرزو میں نسیمِ بہار ہے شب و روز
سَرابِ عشق نے کی منفعت یہ آخرِ کار | کہ سرگرانی و رنج و خمار ہے شب و روز
مبادا دل کہیں سرچنگِ[1] ناز کھا بیٹھے | کہ درپئے کمرِ بہلہ[2] دار ہے شب و روز
مٹا دے صفحۂ عالم سے نقشِ ہستی کو | یہ خواہشِ مژۂ اشک بار ہے شب و روز
لحد میں بھی ہے وہی خواہشِ ہم آغوشی | اگرچہ حسرتِ دل ہم کنار ہے شب و روز

نہ پوچھ حالِ دلِ مصحفی کہ یہ مسکیں
ہلاکِ وعدۂ فردائے یار ہے شب و روز

1۔ سرچنگ = ضرب 2۔بہلہ = چمڑے کا دستانہ

210

کچھ سنتے ہی صیادِ جفاکار کی آواز کل بیٹھ گئی مرغ گرفتار کی آواز
قاتل کا سبک ہاتھ یہ پڑتا ہے کہ ہرگز لگتے میں نکلتی نہیں تلوار کی آواز
معشوق سے خالی نہیں عاشق کی کوئی بات ہے رنگِ شکستہ میں بھی اک پیار کی آواز
برسات یہ گریے سے ہوئی اپنے کہ آئی شب تا سحر افتادنِ دیوار کی آواز
ہوتا نہیں معلوم شبِ ہجر کا آنا جوں آتی نہیں پیل کی رفتار کی آواز
میں بلبلِ خاموشِ گلستانِ ادب ہوں محرم نہیں ہرگز مری منقار کی آواز
گو آبلے پانوؤں کے مرے سنگ تھے لیکن آئی نہ شکستِ سرِ یک خار کی آواز
ہم بندے ہیں ان لوگوں کے جو نے کی صدا سے جاتے ہیں سمجھ ووں ہی لب یار کی آواز
ماتم کدہ ہے دل کے لیے سینہ ہمارا جز نوحہ نہیں خانۂ بیمار کی آواز
ہونٹوں ہی میں رہ جائے ہے ہونٹوں سے نکل کر اللہ رے معشوقِ حیادار کی آواز

کل سیرِ چمن کو جو گیا مصحفی ووں ہی
ہر شاخ سے آنے لگی مزمار کی آواز

211

جب صانعِ عالم نے بنا تجھ کو کیا ناز ہم طرحِ نیازِ دلِ عشاق ہوا ناز
دیکھا نہیں کیا اس نے ترا روے شگفتہ اس باغ میں کرتی ہے جو پھولوں پہ صبا ناز
اچھا نہیں پردے میں رخِ خوب کا رہنا اتنا بھی نہ کر اے صنم ماہِ لقا ناز
کیا کیا گلِ اورنگ نہیں آگ میں جلتے جب کرتی ہے کلیوں پہ تری فندقِ پا ناز
عشاق کا دل خوں نہ کریں کیونکہ وہ کافر سکھلاوے ہے ہاتھوں کو تری رنگِ حنا ناز
چھریاں ہی مرے دل میں گڑوتی ہے ہزاروں وہ چشم کہ سو ناز سے کرتی ہے ادا ناز
آئینہ جو منھ دیکھ وونہی ہاتھ سے پٹکا آئی یہ صدا اس سے کہ اللہ رے ترا ناز

خواہش کی نظر گر میں کروں چہرے پہ اس کے　　تصویر بھی کرنے لگے[1] بس منہ کو پھرا ناز
گر ہے یہی اندازِ حیا اس کا تو اک دن　　لاوے گا مرے سر پہ تغافل کی بلا ناز
گر ایک بلا ہو تو کوئی جی کو بچاوے　　ہے عشوہ بلا، غمزہ بلا، تس پہ بلا ناز
ایسا ہے گرا خامۂ تقدیر سے نقشا　　کیوں کر نہ کرے حسن پہ یوسف کے خدا ناز
گر باغ میں جاتا ہے وہ گل گشتِ ہوا کو　　کرنے نہیں دیتا اُسے وا بندِ قبا ناز
ابرو کا کہ مژگاں کا کہ اس چشمِ سیہ کا　　کس کس کا اٹھاوے دلِ خوں گشتہ بھلا ناز

اے مصحفی ترجیح بھلا دیجیے کس کو
کرتا ہوں جہاں عشق جدا، حسن جدا ناز

س☆

212

افسوس کہ کھلتے ہی خزاں کر گئی نرگس　　منہ خجلتِ فرصت سے نہاں کر گئی نرگس
آئے لبِ خنداں جو ترے برسرِ گفتار　　غائب دہن اپنے میں زباں کر گئی نرگس
بس ہوتے ہی قد کش دلِ سبزانِ چمن کو　　تیرِ قلم اپنے کا نشاں کر گئی نرگس
پکھراج کا رکھ سیم کی تھالی پہ کٹورا　　بے چین دلِ بادہ کشاں کر گئی نرگس
کم فرصتیِ ہستیِ عالم پہ نظر کر　　چشمک طرفِ تاجوراں کر گئی نرگس
دو چار شب اس باغ کی مہمان رہی ہائے　　پھر کوچ سوے ملکِ خزاں کر گئی نرگس
بس موے سپید و رخِ زرد اپنا دکھا کر　　پیری میں بھی عاشق کو جواں کر گئی نرگس
آرام اسے سمجھو کہ تم رنجِ چمن میں　　بس بالشِ سر نوکِ سناں کر گئی نرگس

1۔ ل : بس کرنے لگے　☆ آغاز ردیف السین کہ در ردیف ہذا پنج غزل است

اس باغ میں راوت[1] دکنی کتنے بلا کر — غارت گری لالہ ستاں کر گئی نرگس
اب بو بھی نکلتی ہے گر اس سے تو بہ دقّت — غنچے کے تئیں تنگ دہاں کر گئی نرگس
مستی سے تری چشم کی کی سمکھ[2] ہو نہ جیتی — اس میں تو کچھ اپنا ہی زیاں کر گئی نرگس
ہم نے تو کنیز ایسی کوئی چور نہ دیکھی — سونے کے کٹورے کو نہاں کر گئی نرگس

اے مصحفی حیرت زدہ تھی حسن کی کس کے
جو چشمِ کواکب نگراں کر گئی نرگس

213

ہے جو داغوں کا دلِ اہلِ ہوس پر طاؤس — کلکِ صنعت نے بنایا ہے کلس پر طاؤس
بسکہ نیرنگ کا لیلیٰ کے بگولے میں ہے عکس — دشت ناچے ہے فریادِ جرس پر طاؤس
خالی از نالۂ عاشق[3] جو نہ تھی اس کی صدا — کر گیا رات غش آوازِ عسس[4] پر طاؤس
سر پہ کلغی ہے دھری رنگ میں ہے پھلواری — اپنا کرتا ہے گماں اس کی فرس پر طاؤس
اس کا نیرنگ جو نقطے میں دکھاوے وسعت — خامۂ صنع لکھے قرصِ عدس[5] پر طاؤس
حاملِ جلوۂ نیرنگ نہ ہو فہمِ سفیہ — کیونکہ نقّاش لکھے پرِ مگس پر طاؤس

مصحفی مار ہی ڈالے اسے راسو[6] کی طرح
سانپ کی طرح جو آجائے کنھس[7] پر طاؤس

214

میاں، صبر آزمائی ہوچکی بس — مِلو اب، بے وفائی ہوچکی بس
بہارِ خود نمائی ہوچکی بس — جہاں چھوٹی ہوائی ہوچکی بس
یہی ہے اس کی گر بیگانہ وضعی — تو ہم سے آشنائی ہوچکی بس

1۔ راوت = بہادر، سورما 2۔ سمکھ = مقابل 3۔ ل: خالی از نالۂ عشاق 4۔ عسس = کوتوال
5۔ عدس = مسور 6، 7۔ راسو، کنس: ہندستان کی قدیم تاریخ سے متعلق دو نام

بھروسا کیا ہمارا، اشک کی بوند جہاں مژگاں پر آئی ہوچکی بس
پھنسے صیاد کے پھندے میں بے طرح ہماری اب رہائی ہوچکی بس
نہ مل حجام رخسار اس کے ہر دم منڈایا خط، صفائی ہوچکی بس
ادا میں واں ادا نکلیں ہیں لاکھوں میں سمجھا بے ادائی ہوچکی بس
دِلا[1] مت دیدۂ خوں بار کو پونچھ ہر اک انگلی حنائی ہوچکی بس
یہی درباں پہ ہے قدغن تو یارو صبا کی واں رسائی ہوچکی بس
غزل اے مصحفی یہ میر کی ہے
تمھاری میرزائی ہوچکی بس

215

آہ نکلی نہ کبھی دیدۂ گریاں کی ہوس اشک کے دل میں رہی نت بُنِ مژگاں کی ہوس
ہم گرفتار ہوئے فصلِ گل آتے ہی دریغ رہ گئی دل میں تماشاے گلستاں کی ہوس
خط شمشیر نے قاتل کی نکالی وہ بھی تھی گلے کو جو مرے طوقِ گریباں کی ہوس
اے کماں دار شکار اپنے سے غافل نہ گزر اب تلک دل میں ہے اس کی سرِ پیکاں کی ہوس
باب کم قدر نہیں رتبۂ عالی جاہی مور کس منھ سے کرے ملکِ سلیماں کی ہوس
دیکھ لے پھر کے ذرا بہرِ خدا اے لیلیٰ گردشِ رو ہے فقط چشمِ غزالاں کی ہوس
بسترِ گل کا صبا مژدہ کسی اور کو دے لوٹوں کانٹوں پہ یہ ہے اس تنِ عریاں کی ہوس
ہے گلے پر ترے کشتے کی خطِ نیل ہنوز لے گیا دل ہی میں یہ خنجرِ براں کی ہوس
گر یہی شوق ہے تو سوجھے ہے اک دن مجھ کو لے ہی ڈوبے گی ترے چاہِ زنخداں کی ہوس
کام ہوتا ہے ترے نیم تبسم میں تمام تو جو چاہے تو نکل جائے ہر انساں کی ہوس
پھروں پروین کا ہی حیران مجھے رکھے ہے شبِ مہتاب میں اس ماتھے کی افشاں کی ہوس

1۔ ل سے اضافہ

آہ کاجل نے مقام اس کا لیا بے موجب دل میں سرمے کے رہی سایۂ مژگاں کی ہوس

مصحفی ایک غزل اور بھی تو ان کو سنا
نظم کم میں نہیں بجھتی[1] دلِ یاراں کی ہوس

216

مرد قانع نہ کرے مجلس شاہاں کی ہوس خوار رکھتی ہے بس انسان کو انساں کی ہوس

دردمندوں پہ ترے عشق کا یہ قدغن ہے جان دو اور نہ کرو راحت درماں کی ہوس

پیچھے ناقے کے دواں آبلہ پا ہے مجنوں آج نکلے گی ذرا خار مغیلاں کی ہوس

خوں میں لوٹے ہے تری تیغ تغافل کا شہید واہ کیا نکلی ہے اس کشتہ حرماں کی ہوس

رکھ گلا چوب قفس پر ہی تو اے مرغ چمن دل میں تیرے نہ رہے خنجراں براں کی ہوس

ہے دمِ نزع جو تکلیف کرو تم اتنی رہ گئی ہے مجھے اک جنبشِ مژگاں کی ہوس

ہوگیا ہے اسی اندوہ سے رنگ اس کا کبود ہے مِسی کو جو ترے گوہرِ دنداں کی ہوس

تو جو میلے میں دلیرانہ پڑا پھرتا ہے اپنا سر پیٹتی ہے گبر و مسلماں کی ہوس

ناز کہتا ہے اسے شرم تو بہتر ہے ولے اک ادا میں تو ادا ہوتی ہے درباں کی ہوس

ہوں وہ زندانیِ جاوید میں الفت کا تری موسمِ گل میں نہیں جس کو گلستاں کی ہوس

میں جو مر جاؤں تو قاتل سے مرے کہہ دیجو لے گیا دل میں کوئی تیغ و نمکداں کی ہوس

عشق نے غنچۂ تصویر بنایا ہے مجھے دل میں کیوں کر نہ رہے چاکِ گریباں کی ہوس

عاقبت خوشۂ شبنم نے یہ ساتھ اس کا دیا گل نے کی تھی ترے روے عرق افشاں کی ہوس

آستیں سے مرے آنسو تو نہ پوچھ اے ہمدم ٹک نکلنے دے کہیں دیدۂ گریاں کی ہوس

مصحفی یادِ خط و زلف میں گردی میں جان
ساتھ جاوے گی مرے سنبل و ریحاں کی ہوس

1۔ ل : مٹتی

ش ☆

217

مجتمع ہو کے نہاں تیروں کے پیکاں صد نیش　　دل پہ ماریں نہ مرے یار کی مژگاں صد نیش

تو ہی اے پنجۂ گل شانہ بن اس کا کیا لطف　　کھاوے شانے سے جو وہ زلفِ پریشاں صد نیش

دور رہ مجھ سے، میں اے بادِ صبا کہتا ہوں　　ہیں سراپا میں مرے مثلِ مغیلاں صد نیش

آنکھ ملتے ہیں زیارت کے دم اور کھاتے ہیں　　سبزۂ تربتِ مجنوں سے غزالاں صد نیش

اس کی مژگاں کا تصور جو کبھی کرتا ہوں　　بال تن پر مرے ہو جاتے ہیں یاراں صد نیش

طعنۂ مردمِ ہم سایۂ لیلیٰ سے ہنوز　　دل پہ کھاتا ہے یہ مجنونِ غزل خواں صد نیش

مار و عقرب نے کبھی اس کی طرف رُو نہ کیا　　بسکہ رکھتا تھا ترا دستۂ پیکاں صد نیش

جوششِ خوں کے دن آتے ہیں تو بن[1] جاتے ہیں　　سخت ہو کر یہ مرے تارِ گریباں صد نیش

تا گزند اس کی سے ایمن نہ رہے اک گلچیں　　اپنے پہلو میں رکھے ہے گلِ خنداں صد نیش

مصحفی دیکھیے طے کیونکہ ہو یہ منزلِ عشق
پاے پُر آبلہ و خارِ بیاباں صد نیش

218

ہے دل میں محبت تری اے ماہ جبیں نقش　　مٹ جائے مٹائے سے، یہ کاغذ کا نہیں نقش

سر اپنا پکڑ کر کے رہا سوچ میں تا دیر　　صورت کا تری دیکھ کے صورت گر چیں نقش

کس طرح نہ ہو سطحِ زمیں خاکِ مرقع　　کیا کیا نہ گئے منھ کو چھپا زیرِ زمیں نقش

☆ل: آغاز ردیف الشین کہ در ردیف ہذا سہ غزل است　　1۔ل: پر ہو جاتے ہیں

ہے ہستیِ موہوم کا اپنے بھی یہ عالم
مٹ جاوے ہے جوں موج کا بن کرکے وہیں نقش

کیوں قتلِ غریباں کی قسم کھاوے ہے صاحب[1]
رکھتا ہے لہو[2] کے تو ترا دامنِ زیں نقش

کیا کیا نہ مسلماں تری تسخیر کو کافر
پڑھتے ہیں عزیمت[3] کہیں بھرتے ہیں کہیں نقش

پہنے ہوئے آویزہ جو سو جاوے ہے وہ گل
رخسار پہ ہوجاتے ہیں سجادہ نشیں نقش

پڑتا ہے گماں مجھ کو نزاکت سے بدن کی
ہوجاوے کمر پر تو نہ دامان کی چیں نقش

مانی جو کوئی حسن کی تصویر لکھے ہے
رکھ لیوے ہے صورت کا تری اپنے قریں نقش

اے مصحفی تھیوے[4] میں کیوں اس کو کھداتا
ہوتا جو مرے نام کا شایانِ نگیں نقش

219

ہزار شور ہیں دل میں زباں ہے پر خاموش
نہ آدمی کو کرے شرم اس قدر خاموش

کہیں سنا ہے کہ ہو ایسا نوحہ گر خاموش
نہ مجھ سے بحث تو اے بلبلِ سحر، خاموش

یہ آئینے سے کھلا مجھ پہ اپنے گھر کے بیچ
رہیں ہیں اہلِ صفا بیٹھے بیشتر خاموش

نسیم جائے ترحّم ہے یہ خدا سے بھی ڈر
چراغِ گورِ غریباں تو تُو نہ کر خاموش

فروغِ ہستیِ وہمی پہ کیا گھمنڈ اتنا
یہ دم میں ہووے ہے جوں پرتوِ شرر خاموش

ہے ذی حیات کو کافی اجل کی اک سرچنگ
کرے چراغ پتنگے کا جیسے پر خاموش

فغاں کرے تھا ترا کشتہ بسکہ آنکھوں میں
تھے لب تو بند ولیکن نہ تھی نظر خاموش

ہر اک بشر میں ترا ضبط مصحفی کب ہے
وہ میں ہی ہوں جو رہے کھا کے نیشتر خاموش

1۔ ل: ظالم 2۔ل: لہو کا 3۔عزیمت = دعائے تسخیر 4۔تھیوا = انگوٹھی کا نگینہ

ص

220

خشتِ زیرِ سر میں ہے یاں بالشِ پر کا خواص
خار پہلو کے تلے رکھتے ہیں بستر کا خواص

معجزِ عیسیٰ کو کر دیتا ہے اک دم میں خلیل
ہم نے یہ دیکھا ترے لعل فسوں گر کا خواص

ہیں سر انگشتانِ مژگاں میں یہ آنسو آبلہ
لختِ دل میں ان دنوں پاتا ہوں اخگر کا خواص

قطرہ ہائے خوں بہے جاتے ہیں مثلِ اشکِ سرخ
ہے مرے ہر زخمِ تن میں دیدۂ تر کا خواص

جوششِ خوں میں ہمیں فصاد کی حاجت نہیں
خارِ صحرائے جنوں رکھتے ہیں نشتر کا خواص

گاہ میرے ہاتھ میں ہے گاہ تیرے ہاتھ میں
یعنی ہے دورِ فلک میں دورِ ساغر کا خواص

گر ملائم طبع کو تعلیمِ سختی دے فلک
موم بھی پیدا کرے فی الفور پتھر کا خواص

بات کہتے شیشۂ دل ٹوٹ جاتا ہے مرا
اس کے حرفِ سخت میں ہے بسکہ پتھر کا خواص

بے ثباتوں کو اگر دیوے خدا رنگ ثبات
آسماوے[1] آب میں ژالہ کے گوہر کا خواص

بن گیا ہے طاسک[2] فوارہ چھٹ کر دل مرا
آہ نے پیدا کیا ہے دودِ مجمر کا خواص

تاجداری سر کو کٹواتی ہے سلطاں[3] کی یہاں
ان کی کیا تقصیر اس میں ہے یہ افسر کا خواص

ہیں جہاں اس کے صفائے تن کے کشتوں کے مزار
خشتِ دل میں واں کرے ہے سنگ مرمر کا خواص

یار جب آیا مری تربت پہ اس کی دید کو
سنگِ تربت نے کیا پیدا مجمرؔ کا خواص

اب تو مارے ضعف کے چہرے سے اڑ سکتا نہیں
تھا کبھی رنگِ پریدہ میں کبوتر کا خواص

چھن چھن ہو کر اشک گرتے ہیں جو مژگاں سے مری
مصحفی پاتا ہوں ان میں آبِ چادر کا خواص

1۔ ل : آسماوے   2۔ طاسک = چھوٹا طشت   3۔ سلطانوں کی یاں

ض

221

سب کو پہنچے ہے تری زلفِ گرہ گیر سے فیض جیسے ہوتا ہے مریدوں کے تئیں پیر سے فیض
تلخیِ نزع نہ معلوم ہوئی کچھ اس میں یہ تو عاشق کو ہوا برّشِ شمشیر سے فیض
طرفہ بے لطف ہے صحبت ترے حیرانوں کی سچ ہے ہوتا نہیں تصویر کو تصویر سے فیض
اس نے تیروں پہ کیے نصب طلائی پیکاں تا اسی طرح ہو زخمی کو مرے تیر سے فیض
کام آتا ہے ہر اک بات کا انساں میں کمال ماہ کنعاں کو ملا خواب کی تعبیر سے فیض
اس نے تا صبح رکھا میرے تئیں شب بیدار پس یہ پایا رقمِ شوق کی تحریر سے فیض
شاق[1] مجنوں کو کیا گردن طاؤس کی شکل بارے اتنا تو ہوا آہن زنجیر سے فیض
صید عنقا کا عبث ہے دلِ ناداں کو خیال ایک پشہ[2] کا نہیں ناوکِ تقدیر سے فیض
دل گرفتار جنھوں کا ہے وہ لیتے ہیں مدام حلقہ ہائے پرِ طاؤس کی زنجیر سے فیض

اس کا دل موردِ فیضانِ الٰہی خود ہے
مصحفی کو نہیں کچھ مصحف و تفسیر سے فیض

222

کیا اٹھاوے گا عدو آہ کی تاثیر سے فیض گوشِ کر کو نہ ہوا نالۂ زنجیر سے فیض
منع ہے منع ملالت[3] میں سخن کی اصلاح کیا کسی کو ہو مری خاطرِ دلگیر سے فیض
خوں بھری تیغ جو قاتل نے زمیں پر پھینکی مورچوں تک تو ہوا جوہرِ شمشیر سے فیض
جس تونگر کے کبھی ہاتھ سے دانہ نہ گرے ق اس سے کفگیر بھلا، ہوتا ہے کفگیر سے فیض
ریختہ گوئی کی بنیاد ولی نے ڈالی بعد ازاں خلق کو مرزا سے ہے اور میر سے فیض

1۔ شاق (چاق) = مضبوط 2۔ پشہ = مچھر 3۔ ملالت = افسردگی

گرچہ زمرے میں یہ ان کے نہیں، پر لیتے ہیں　　کتنے مشاقِ سخن مصحفیِ پیر سے فیض

اور اردو کا جو واقف ہے تو اب پہنچے ہے
چند جا قاف بسر[1] شخص کی تقریر سے فیض

ط

223

ہوتی ہے جب ادھر کو رہِ دوستاں غلط　　کرتے ہیں میرے رخ کو یہ برگِ خزاں غلط

تا چند صبح اٹھ کے یہ آئینہ دیکھنا　　کوئی نگہ اِدھر بھی ہو اے کامِ جاں غلط

قسمت تو دیکھ غیر کا خط دیوے یار کو　　قاصد مرے ہی خط کو کرے درمیاں غلط

ازبسکہ میں نے خوب اسیری چمن میں کی　　ہونے لگا قفس سے مجھے آشیاں غلط

لے جائے کاش پیک صبا کوے یار میں　　کاغذ کے ساتھ کر کے مرے استخواں غلط

گو لاکھ چرخ دیوے مجھے آتشِ فراق　　ہوتا ہے رنگِ زر بھی دمِ امتحاں غلط

گو وہ صحیح اس کو کہے پر ترے حضور　　عاشق کی سرگزشت کی ہے داستاں غلط

کرتا رہے ہے بازیِ لیل و نہار کو　　اوراقِ گنجفہ کی طرح آسماں غلط

قاصد جوابِ خط اسے لا دے گا شاد شاد
سمجھا ہے کتنا مصحفیِ نیم جاں غلط

224

باتیں ہیں اختلاط[2] کی سب میری جاں غلط　　ہوتی ہے خوبرو کی سراسر زباں غلط

مہموز[3] اور صحیح میں جن کو نہ ہووے فرق　　یہ جان صرف پڑھتے ہیں وہ صرف[4] خواں غلط

1۔ مراد مرزا حاجی قمر (حاشیے پر)　2۔ ل: التفات (اختلاط = مراد وصال)　3۔ مہموز اور صحیح = عربی زبان میں صرفی قواعد کی اصطلاحات ہیں　4۔ ل: حرف خواں (حرف خواں بھی درست)

جاؤں[1] گا اس کے گھر جو کبھی، بے دماغ ہو پوچھے گا تو کہوں گا ''کیا میں مکاں غلط''
لکھتا تھا اس کو نقطۂ موہوم سے بھی کم چہرے میں چہرہ کش سے ہوا وہ دہاں غلط
محمل نشیں کے دل میں جو دھڑکا ہے صبح کا اس دشت میں قدم نہ رکھے سارباں غلط
آنے تو دے چمن میں ذرا اس کو اے نسیم ہے ایک دم میں رنگِ گل و گلستاں غلط
لیلیٰ تو رو براہ ہے پر کہہ رہی ہے شرم اے کاش راہِ نجد کرے سارباں غلط
آتے ہی شامِ وصل، لیا تو نے منھ پھرا اک چال بس یہی تو چلا آسماں غلط
مسجد کی سمت تشنۂ مے مجھ کو لے گیا مستی میں ہو گئی رہِ کوے مغاں غلط
ہے مصحفی کہیں کا کہیں فرد کی طرح
جب سے ہوا ہے دفترِ ہندستاں غلط

ظ ☆

225

ہے وضع میں جو وہ بتِ خونخوار بے لحاظ نازک کمر پہ باندھے ہے تلوار بے لحاظ
بے ہیچ برگِ گل سے الجھتی ہے ہر سحر مرغِ چمن کی کتنی ہے منقار بے لحاظ
مدفوں ہیں تیرے کوچے میں لاکھوں شہید ناز اس جا نہ چاہیے تجھے رفتار بے لحاظ
غنچے ہیں سر بہ بالشِ گل خواب ناز میں تو اے صبا نہ جا سوے گلزار بے لحاظ
حیرت زدہ رہی[2] رخِ گل دیکھ دیر تک کتنی ہے چشمِ نرگس بیمار بے لحاظ
لیتا ہے بوسۂ لب جاناں بہ زورِ مے مستی میں ہے یہ ساغرِ سرشار بے لحاظ
دامن کا پاس ہے نہ گریباں کا کچھ انھیں روتے ہیں کتنے دیدۂ خوں بار بے لحاظ

1۔ ل :جاوے گا ☆ ل :آغاز ردیف الظا کہ در ردیف ہذا سہ غزل است 2۔ ل :رہی ہے

اب نالہ اس کا جاوے ہے عرش بریں کے پار
اتنا تو نہ تھا مصحفیِ زار بے لحاظ

226

جہاں میں رہتے ہیں جس طرح اغنیا محظوظ　بحالِ فقر ہمیں رکھتی ہے غنا محظوظ
شرابِ حسن کی لذت سے ان کو کام نہیں　جو پاکباز ہیں رہتے ہیں وہ سدا محظوظ
وہ سوختہ میں نہیں آتشِ جدائی کا　کہ استخواں کو مرے کھا کے ہو ہما محظوظ
ضرور کیا ہے کہ ہاتھوں کو اس کے بوسہ دوں　کرے ہے دور سے خود نکہتِ حنا محظوظ
ہمارے دل میں رہی حسرتِ ہم آغوشی　ہوئی تو وصل سے اس کے ہوئی قبا محظوظ
ہمیشہ لپٹی ہی رہتی ہے گوش و گردن سے　نہ ہووے کیونکہ تری کاکلِ رسا محظوظ
گلوں کا ہے جو یہی اس پہ چہرہ کرنا لال　چمن میں جا کے بہت ہووے گی صبا محظوظ
جو خاکِ کشتۂ الفت پہ وہ قدم رکھے　تہِ مزار کرے اس کو نقشِ پا محظوظ
ہوس رہی نہیں اب دل میں آشنائی کی　کہ کر چکے ہیں مجھے میرے آشنا محظوظ
دعا لکھی تھی خطِ غیر میں مجھے اس نے　میں اپنے دل میں ہوا پا کے مدعا محظوظ

تو مصحفی ہے نبیؐ و علیؑ کا مدح سرا
تجھے رکھے دو جہاں میں ترا خدا محظوظ

ع

227

صحبت میں غیر جنس کے ہوتی ہے داغ شمع　کیوں چور[1] کے لگے سے نہ ہو بے دماغ شمع
بے وجہ اس کا چہرہ بر افروختہ نہیں　آتش کا داغ دل سے لیے ہے ایاغ شمع

1۔ شمع کے چور لگنا = شمع کی لو کا خراب ہونا

وہ آپ کر رہی ہے مدام اس کی جستجو شعلے کو اپنا گو نہیں دیتی سراغ شمع
عاشق کشی بھی فرض ہے خوباں کے کیش میں پروانے کو جلا کے نہ ہو باغ باغ شمع
شاید کہ کچھ کرشمہ ہوا مصحفی سے رات
جلتی تھی اس کی قبر پہ جائے چراغ شمع

228

طغیانِ بحر ہووے ہے طوفاں کی اصل وفرع سمجھا کوئی نہ حضرتِ انساں کی اصل وفرع
خیلے مزاج حسن کا ہے رازداں وہی شانے سے پوچھو زلف پریشاں کی اصل وفرع
ان ہندیوں نے حرف مغل سن لیا ہے ایک کیا جانتے ہیں اصل صفاہاں کی اصل وفرع
سو مدرسے پھرا ہوں و لیکن کھلی نہیں مجھ پر ہنوز عالم امکاں کی اصل و فرع
ملتا ہے دورِ دامنِ محشر سے اس کا چاک پوچھو نہ میرے چاک گریباں کی اصل وفرع
دریا میں اس کے دستِ حنائی کے رشک سے بہتی پھرے ہے پنجۂ مرجاں کی اصل وفرع
تیغِ ولایتی نے اس ابرو کی قطع اک وار ہی میں اہل خراساں کی اصل وفرع
شکوہ بجا ہے تیغِ جفائے سپہر کا کاٹی ہے جس نے گبرو مسلماں کی اصل وفرع
گر مصحفی دکھاؤں اسے اپنا داغ دل
جل جائے ووں ہی لالۂ نعماں کی اصل وفرع

غ

229

شب کور کھتا ہی نہیں کچھ حاجتِ روغن چراغ اپنی وادی میں ہے چشمِ غول کا روشن چراغ
روئے آتش ناک پر زلفوں کا چھٹنا ہے ضرور باد سے محفوظ رہتا ہے تہِ دامن چراغ

نورِ وحدت یوں ہے کثرت سے ستاروں کی عیاں
جوں رکھے کوئی میاں ظرفِ صد روزن چراغ

نام دولت مند کا ہوتا ہے روشن مال سے
تب جلا دیتے ہیں ہندو بر سرِ مخزن چراغ

کیا یہی تقدیر میں لکھا تھا ہوگا بعد مرگ
ہم سیہ روزوں کی تربت کا گلِ سوسن چراغ

ہم عزاداروں کی مجلس میں اگر روشن کریں
اٹھے شعلے سے فغاں کرنے لگے شیون چراغ

شمع کو کیا اس سے نسبت ہے فروغِ حسن میں
یعنی ہے وہ نور کا شعلہ سراپا تن چراغ

کر کے رخصت روح کو پہلے ہوا تن بے خبر
مردِ مفلس جوں بجھا دیوے دمِ خفتن چراغ

تیرگی سینے کی کھو دیتا ہے سوزِ داغِ دل
جس طرح تاریکیِ خانہ کا ہو دشمن چراغ

سینکڑوں گل جس نے کھائے تھے تمھارے عشق میں
اب نہیں جز داغِ دل اس کے سرِ مدفن چراغ

جب سے وہ گورِ غریباں میں ہوا ہے آ کے دفن
مصحفی کی قبر پر ہے یاس کا روشن چراغ

230

پوچھی کبھی کسی سے نہ میں نے دوائے داغ
پھاہا رکھا نہ داغ پر اپنے سوائے داغ

اب جوں سپند مصرفِ آتش ہوا ہے ہائے
وہ دل، لگی نہ تھی کبھی جس کو ہوائے داغ

احوالِ شمع پوچھے کوئی اس سے بزم میں
ہر استخواں ہو جس کا غذائے ہمائے داغ

ہو آسمان پر کلفِ ماہ منفعل
عاشق جو اپنی اس کو دکھاوے صفائے داغ

سینے میں بو گیا تھا کوئی تخم لالہ کیا
ہوتا ہے اپنے کھیت سے نشو و نمائے داغ

آوارگی میں لالے کی پتی کا داغ نے
دامن نہ چھوڑا ہاتھ سے بل بے وفائے داغ

کس کو بنائے قصر و محل کا خیال ہے
ہر لحظہ داغِ تازہ پہ ہے یاں بنائے داغ

مانند شمع صبح تلک بزمِ دہر میں
پھر ہم کہاں رہے جو یہی ہے جفائے داغ

چھلّے کا گل جو یار نے کھایا ستم کیا
ہرگز نہ تھا وہ ساعدِ نازک سزائے[1] داغ

جلتے میں اہلِ درد کی انگشت کی طرح
جب لطف ہے کہ سینے سے نکلے صدائے داغ

1۔ سزائے داغ = داغ کھانے کے لائق

پاوے وہ سوزِ عشق کا کب رتبہ مصحفی
زیبِ تنِ پلنگ ہوئی گو قبائے داغ

231

فلک کو کیوں کہ رکھے آہِ آتشیں بے داغ
جہاں سے نکلے ہے یہ وہ بھی تو نہیں بے داغ

ہجومِ غم کا نشاں کیوں نہ دل پہ رہ جاوے
کہ قافلے کی تو ہوتی نہیں زمیں بے داغ

غضب کیا ہے ترے لعلِ لب کے شعلے نے
جو ایک لالے کی پتی رکھی نہیں بے داغ

جلا رکھیں گے ترے دل کو خوفِ دوزخ سے
غرض کہ تجھ کو نہ چھوڑیں گے اہلِ دیں بے داغ

چنے تھے پھول شرارے سے اس نے حیرت ہے
کہ کیونکہ رہ گئی انگشتِ لالہ چیں بے داغ

شہیدِ تیغِ تبسم[1] مگر نمازی تھے
جو ایک کشتے کی دیکھی نہ میں جبیں بے داغ

جگر جلے ہے تب آواز منہ سے نکلے ہے
بہ رنگِ نے نہیں یہ نالۂ حزیں بے داغ

نہ مصحفی طلبِ یارِ سادہ رو کر تو
سنا ہے تو نے بھلا سیب بھی کہیں بے داغ

ف

232

ایک ہم تھے کہ ملے گوہرِ جاں رکھ بر کف
ورنہ آگے نہ کھلے اس کے کبھی دستِ صدف

دہر وہ آخور[2] سنگیں ہے کہ جس میں ہرگز
خرِ عیسیٰ کو میسر نہ ہوا آب و علف

قصۂ قاتل و مقتول کا کیا ذکر کروں
نہ ہوا شیث[3] سوا دودۂ[4] آدم میں خلف

قدر ہووے کبھی اشعارِ مصفّا کی مرے
تو نے دیکھے ہوں اگر دفترِ منظومِ سلف

رفتگی اس کو جو صانع سے ہوئی ہے پیدا
آہ جاتی ہے مری تا بہ مقامِ رفرف[5]

1۔ل: تیغِ تغافل 2۔آخور = اصطبل 3۔شیث = نام ایک پیغمبر کا 4۔ دودہ = خاندان 5۔رفرف = براق

پھیر ہولی کی رت آئی ہے مگر گردوں پر — آتشیں رنگ شفق سن کے ہے جو مہر کا دف
ظلم میں اپنی جو دکھلاوے ہے نازک کاری — تیغ مژگاں سے وہ کھینچے ہے رگِ گل پہ الف [1]
اس کے کوچے میں جو رویا تو مرے قطرۂ اشک — کچھ بنے لعل سپید اور ہوئے کچھ دُرِ نجف
مصحفی روز جزا ہوگا سبھوں کے پیچھے
جب گنہگار کھڑے ہوویں گے واں باندھ کے صف

233

بختِ سیہ گیا ہے شبِ تار کی طرف — جاوے کہیں نہ کوچۂ دلدار کی طرف
ضعفِ قدم نے میرے مجھے کوے یار میں — جانے دیا نہ سایۂ دیوار کی طرف
اب کے قفس سے چھوٹ کے گر باغ میں گئے — گھوریں گے خوب ہم گل و گلزار کی طرف
دامن کا پاٹ ایک نہ باقی رہا مجھے — وحشت جو لے گئی چمن خار کی طرف
آئینہ لے کے ہاتھ میں دیکھے ہے وہ پری — گل کی طرف کبھی کبھی رخسار کی طرف
کافر یہ عشق وہ ہے کہ موے کمر دکھا — مومن کو کھینچ لاوے ہے زنار کی طرف
تو یہ ستم نہ سر پہ خموشی کے کیجیو — اے نالہ دیکھیو مری منقار کی طرف
آتا ہے بہرِ بیع جو یوسف کے سامنے — وہ دیکھتا ہے ہنس کے خریدار کی طرف
تو اک غزل تو اور بھی اے مصحفی سنا
کھنچتا ہے جی مرا ترے اشعار کی طرف

234

مقتل میں تھی نگاہ مری یار کی طرف — دیکھا نہ ہاتھ اور نہ تلوار کی طرف
کیا اس چمن میں جا کے مسافر کرے، جہاں — گل چیں کبھی نہ دیکھ سکے خار کی طرف
اس غم سے میں مروں ہوں کہ کیوں چشمِ آفتاب — تکتی ہے اس کے رخنۂ دیوار کی طرف

1۔ الف ہونا، الف کھنچنا = گھوڑے کا پچھلے دو پیروں پر کھڑا ہونا تا کہ سوار دشمن پر حملہ کر سکے

کچھ تو مزا ہے مے میں کہ راتوں کو پارسا
جاتے ہیں چھپ کے خانۂ خمار کی طرف

نظارہ وہ بلا ہے کہ خود گود میں چڑھا
لے جاوے طفلِ خورد کو بازار کی طرف

اللہ رے ادب کہ دمِ ذبح رہ گیا
کچھ اٹھ کے ہاتھ دامنِ خونخواری کی طرف

وہ نغمہ سنج ہوں میں کہ دیکھیں ہیں شام و صبح
مرغانِ باغ میری ہی منقار کی طرف

ایسے مریض سے ہے طبیبوں کو احتراز
جاتا ہے کون عشق کے بیمار کی طرف

اے مصحفی نہ ڈر تو کہ مارے گا روز حشر
دریائے عفو موج، گنہگار کی طرف

235

نہ ترے ساتھ میسر ہوئی یکجائی حیف
ایک شب وصل کی صورت نہ نظر آئی حیف

آخرِ عمر گلا آ کے اجل نے گھونٹا
اب زباں تجھ سے گئی قوتِ گویائی حیف

اک دن تجھ سے بھی کر دے گا زمانہ تنہا
تو بھی رہنے کی نہیں اے شبِ تنہائی حیف

چاک کرتا ہے ابھی جامۂ عریانی کو
یار کو خوش نہیں آتی مری رسوائی حیف

مطلع صبح قیامت نظر آتا اس کو
اس کے رخ پر نہ پڑی چشم تماشائی حیف

منزل عشق تو کچھ دور نہیں اتنی ہمیں
ضعف کرنے نہیں دیتا ہے سبک پائی حیف

مہ و خورشید نت اس در کو کریں ہیں سجدہ
اک ہمیں کو ہی نہیں حکم جبیں سائی حیف

کاش میں آنکھ رخ اس کے پہ نہ کھولی ہوتی
اک نظر کر گئی تاراج شکیبائی[1] حیف

خال پر چاہ زنخداں کے مجھے آئے ہے رحم
جان دیتا ہے عبث اتنی یہ سودائی حیف

آہ اس چہرۂ گل رنگ سے اٹھتے ہی نقاب
مل گئی خاک میں اے گل تری رعنائی حیف

مصحفی یار کو آنے نہ دیا بالیں پر
جان زار اور بھی ہونٹوں پہ نہ ٹھہرائی حیف

1۔ ل : شکیبائی (سبک پائی= تیز قدمی)

ق

236

میری گردن[1] میں ہیں یوں زلفِ گرہ گیر کے طوق جس طرح حلقے کمندوں کے ہوں نخچیر کے طوق
تو نے جس وقت کہ پہنے نظر آئے مجھ کو چھلّے پوروں کے ترے غنچۂ تصویر کے طوق
چاند سورج کو محرم میں بہت رکھتے ہیں اس گلے میں یہ جو وابستہ ہیں زنجیر کے طوق
قلزمِ حسن کے گرداب بنے سر تا سر تھے جو منّت کے گلوے بتِ بے پیر کے طوق
میں اسیری میں گنہگار بڑا ہوں صیاد حلقۂ دام ہیں سارے مرے تعزیر کے طوق
بعدِ کشتن بھی نہیں عفو ہوا جرمِ نگاہ خون نے پہنے مرے جوہرِ شمشیر کے طوق
میں وہ مجرم ہوں کہ بن بن کے بگڑ جاتے ہیں نوکِ پرکارِ ازل سے مری تقدیر کے طوق
مصحفی جب وہ مرے خوں سے گرفتار ہوا
جتنے چھلّے تھے جڑت کے وہ بنے تیر کے طوق

237

ہیں گلے میں ترے اے بت جو کسی پیر کے طوق بے تکلف یہی عاشق کی ہیں تسخیر کے طوق
رشک کیوں موے کمر کو نہ ہو عارض پہ ترے بال خم کھا کے ہوں جب زلف گرہ گیر کے طوق
تیغ کھا کر نہ ہلا اپنی جگہ سے وہ ذرا ہو گئے زخمِ ہلالی ترے نخچیر کے طوق
اپنے زرگر کو وہ تا ایسی بناوے رنگیں خود وہ دیتے ہیں کتر کاغذِ تصویر کے طوق
قتل پر یار اسیری کو جو راجح[2] سمجھا توڑ شمشیر گئی آہنِ شمشیر کے طوق
حلقۂ ہفت فلک سے ہے رہائی کس کو لوگ مجرم ہیں تو ان کے ہیں یہ تعذیر کے طوق
کہہ دو رانجھا سے کہ اس شادی میں وہ بھی آوے آج کہتے ہیں بڑھائے گئے ہیں ہیر کے طوق

1۔ ل : گردن پہ 2۔ راجح = قابلِ ترجیح

خاک کو بھی ترے کشتے کی رہائی نہ ملی　　کاوے[1] گھوڑوں کے پنھائے رہے تزویر[2] کے طوق

مصحفی زور دکھاتی ہے جو تقدیر اپنا
ٹوٹ جاتے ہیں بس اک آن میں تدبیر کے طوق

238

ہے خالِ رخ اس طرۂ طرّار کا مشتاق　　جوں دزد کہ ہوتا ہے شبِ تار کا مشتاق

جاتا ہے جو دوڑا ہوا پیکاں سے سری تک　　کیا خونِ جگر ہے لبِ سوفار کا مشتاق

کیا میرے تنِ زار کو عشق اس کا جلاوے　　شعلے کو سنا ہے کہ وہ ہو خار کا مشتاق

آنکھیں جو کھلی رہ گئیں عاشق کی پس از مرگ　　سمجھا میں کہ یہ تھا ترے دیدار کا مشتاق

کچھ لب[3] ہی نہیں بوسے کے طالب کہ صنم ہے　　رخسار بھی تیرا ترے رخسار کا مشتاق

مت اس کی بلندی پہ تو مغرور ہو منعم　　نت سیلِ فنا ہے بنِ دیوار کا مشتاق

اس چشم سے الفت ہے دلِ زار کو میرے　　یہ طرفہ کہ بیمار ہے بیمار کا مشتاق

برّش کا مزا جب سے اٹھایا ہے گلے نے　　ہر عضو ہے اپنا تری تلوار کا مشتاق

اک دن مرے لاشے کو تو ٹھکرا کے گیا تھا　　اب تک وہ پڑا ہے اسی رفتار کا مشتاق

گرداب بناتا ہے جو آغوش کی صورت　　دریا بھی ہے شاید کمرِ یار کا مشتاق

دم لینے نہیں پاتا جو صیاد کے ڈر سے　　نت نالہ رہے ہے مری منقار کا مشتاق

سیری نہیں ہوتی ہے مجھے حسنِ بتاں سے　　گلزار میں رہتا ہوں میں گلزار کا مشتاق

کیا مصحفی سے ہووے عبادت کہ نہ دیکھا
مسجد میں رہے خانۂ خمار کا مشتاق

239

جب تلک تعمیر ویرانی کرے معمارِ عشق　　رکھیو میرے سر پہ یا رب سایۂ دیوارِ عشق

1۔ کاوے دینا = گھوڑے کو اس طرح گھمانا کہ اس کے نعلوں سے زمین پر دائرہ بن جائے　2۔ تزویر = فریب

جب محرّف دوش پر لگ کر وہ کوٹھے تک گیا	یار کا زخم حمائل سمجھے ہم زنّارِ عشق
کچھ نہ مجنوں کی طرح سمجھے الف با کیا ہے چیز	حسن کے مکتب میں ہم کرتے رہے تکرارِ عشق
چشمۂ حیواں کے ان نے متصل جاں اپنی دی	کب یہ طاقت تھی کہ پانی مانگتا بیمارِ عشق
تو بھی میں دامن نہ پکڑا تیغ قاتل کا کبھو	بارہا سینے سے گزرا زخم دامن دارِ عشق
فائدہ کیا ہے جو تصویریں دکھاتے ہیں مجھے	کم کسی صورت سے ہونے کا نہیں آزارِ عشق
درد کیوں سینے میں ہوتا ہے مرے آٹھوں پہر	عشق ہے پر مجھ پہ کچھ کھلتا نہیں اسرارِ عشق
اب کہاں لڑکوں کے پتھرے اور گلیوں کی یہ دھوم	ہو چکی بس چند روزے گرمیِ بازارِ عشق

مصحفی لکھ دیجے اپنا اس میں گر رنگیں کلام
کیجیے گلزارِ ابراہیم کو گلزارِ عشق

240

نہ کر سکا پسِ مردن میں دل کے پنہاں چاک	اُگے ہے لالہ مری خاک سے گریباں چاک
نہ اس ادا پہ کرے کیونکہ گل گریباں چاک	کہ آستینوں میں رکھتے ہیں نازنیناں چاک
کبھی جو دستِ جنوں آ گیا ہے شوخی پر	گیا ہے جیب صبوری کا تا بداماں چاک
ہر ایک غنچے کی چولی ہے سو جگہ سے چسی[1]	ہوئے ہیں اب کے برس یہ چمن میں ارزاں چاک
الف یہ کھینچی تھی تیغِ فراق لیلیٰ نے	کہ سو جگہ سے تھا[2] مجنوں کا جسمِ عریاں چاک
نہ چاکِ جیب سے مجنوں کی ہو سکا ہمسر	اگرچہ جادہ[3] سے تھا دامنِ بیاباں چاک
درازدستیِ عفوِ خدا سے کیا ہے بعید	جو ہووے نامۂ اعمالِ اہلِ عصیاں چاک
تبسمِ لبِ یاقوت رنگ اگر دیکھے	تو ووں ہی کان کا سینہ کرے بدخشاں چاک

1۔ چسنا = پھٹنا، چاک ہونا	2۔ل: ہے مجنوں	3۔جادہ = راستہ، ڈگر

ہر ایک چاک کو چاکِ دگر سے ہے پیوند — بہ رنگ غنچہ ہیں دل کے مرے یہ چسپاں چاک
ہوا یہ سرد ہے اب کے کہ ہو نہیں سکتیں — فغانِ گرم سے منقارِ عندلیباں چاک
بکھر گئی کبھی رخ پر جو اس کے زلفِ سیاہ — بہ روے صبح ہوا جیبِ شب کا خنداں چاک
سیا کبھی جو گریبان میرا ناصح نے
میں اس کی ضد سے کیا مصحفی دو چنداں چاک

241

زلفِ سیہ بہارِ گلستاں ہے زیرِ تاک — یا عکسِ پیکرِ شبِ ہجراں ہے زیرِ تاک
از بسکہ دار بست سے چھنتا ہے نورِ مہر — دیکھے کوئی جو دن کو چراغاں ہے زیرِ تاک
ہے جام و شیشہ حاضر و ساقی و نے نواز — گویا نشاطِ عید کا ساماں ہے زیرِ تاک
جاتا ہے پار گنبدِ خضرا کو چیر کر — از بس بلند نعرۂ مستاں ہے زیرِ تاک
پاے صبا میں غنچوں نے باندھے ہیں گھونگھرو — ہیں برگ دست زن تو وہ رقصاں ہے زیرِ تاک
ساماں کیا ہے ابر نے یہ جس کے واسطے — میکش کوئی تو باغ میں مہماں ہے زیرِ تاک
لالے کی پتی فرش پہ ہے یہ کھنڈی[1] ہوئی — یا لختِ لختِ خونِ شہیداں ہے زیرِ تاک
ہنستا ہے بے ثباتیِ رنگِ نشاط پر — گر جامِ مے تو شیشہ بھی گریاں ہے زیرِ خاک
پھر مصحفی بیادِ خمِ گیسوے بتاں
شوقِ وصال سلسلہ جنباں ہے زیرِ تاک

242

عالم ہے تیرے ہاتھ سے اے نازنیں ہلاک — کیا کیا کیے ہیں تو نے بہ شمشیرِ کیں ہلاک
خوش ہوں کہ دیر کھنچتی نہیں اس کی زندگی — جلد آپ کو کرے ہے ترا ہم نشیں ہلاک
شمشیر کھینچنے کی تجھے کیا ہے احتیاج — کرتی ہے ہم کو خود تری چینِ جبیں ہلاک

1۔ کھنڈنا = ٹوٹنا، بکھرنا

آفت ہے جب ملا لبِ شیریں سے حرفِ تلخ　　زہر آشنا ہوئے پہ کرے انگبیں ہلاک
زنّارِ زلف و روے کتابی کو تیرے دیکھ　　کچھ اہلِ کفر ہو گئے، کچھ اہلِ دیں ہلاک
ہم کو خدا کے واسطے ترچھی نظر نہ[1] دیکھ　　اتنا بھی کر نہ اے نگہ شرمگیں ہلاک
ہیبت سی آئے ہے ترے کوچے کی خاک سے　　جوں کربلا کرے نہ کہیں یہ زمیں ہلاک

اے مصحفی نہ پوچھ کچھ احوالِ خسرواں
لاکھوں ہوئے بہ خواہشِ تاج و نگیں ہلاک

243

ہے خجل جس سے چوبِ تر کی لچک　　بل بے کافر تری کمر کی لچک
یاد شاخِ سمن سے دیتی ہے　　ساعدِ دستِ سیم بر کی لچک
ہے تواضع دلیلِ باروری　　جیسے میوے سے ہو شجر کی لچک
سیبِ غبغب سے اس کے قد میں ہے　　ہر قدم نخلِ بارور کی لچک

مصحفی بارِ حسن ہے جو گراں
حامل اس کی نہیں کمر کی لچک

244

کیونکہ ہمسایہ تمھارا ہو مغاں زاہدِ خشک　　مے انگور کہاں اور کہاں زاہدِ خشک
بزمِ رنداں میں مچا چاہتی ہے پچ[2] تو بھلا　　بیشتر اس سے جو ہو جاوے رواں زاہدِ خشک
جب کہ خشکی سے بنے صورت چوبیں بہرام　　کیوں نہ ہو تیر ملامت کا نشاں زاہدِ خشک
مگر اس مرغ مصلّی کی اجل ہے نزدیک　　جو پہر رات سے دیتا ہے اذاں زاہدِ خشک
خشک نے جوں کبھی نالے میں ہوا سے آوے　　جنبشِ باد سے کرتا ہے فغاں زاہدِ خشک
ایک دن منھ تو لگا دیکھ تو اس کے منھ سے　　دخترِ رز تجھے کر دے گی جواں زاہدِ خشک

1۔ ل : تو کر　　2۔ پچ = تکرار

مصحفی کیوں کہ تر و تازہ کرے اس کو کوئی
موسمِ گل میں ہو جب برگِ خزاں زاہدِ خشک

245

نہ ہوں میں موسمِ گل کیوں کہ اے عزیزاں تنگ　　کہ آہ مجھ پہ قفس سے بھی ہے گلستاں تنگ
گرفتہ خاطری کا اپنی کیا بیاں کیجے　　کہ مجھ پہ وسعتِ عالم ہے مثلِ زنداں تنگ
بھلا کیا کہ [1] یہ سیرِ فضائے نجد گئی　　فراقِ قیس سے لیلیٰ پہ تھا دبستاں تنگ
شگفتگی کی بھلا اس میں کیا سمائی ہو　　ہے اپنا غنچۂ دل جوں دہانِ خوباں تنگ
رہے ہے زلف سے یوں انقباض عارض کو　　کہ جیسے صحبتِ ہندو سے ہو مسلماں تنگ
فضائے عالمِ امکاں نہیں نشاط کی جا　　نت آکے ہووے ہے اس گھر کے بیچ مہماں تنگ
یہاں تلک ہوئی مجنوں کو دشت سے نفرت　　کہ [2] جی کو کرنے لگا سایۂ مغیلاں تنگ
قیامت آوے ہے درزی کے سر پہ دوخت [3] کے بیچ　　ذرا بھی ہووے ہے اس گل کا گر گریباں تنگ

غزل اک اور بھی لکھ مصحفی یہ جولانی
نہیں ہے زخشِ قلم پر سخن کا میداں تنگ

246

پھرا نہ واں سے میں کچھ ہو کے اے عزیزاں تنگ　　ہجومِ شوق نے کی راہِ کوے جاناں تنگ
کرے ہے جامۂ عریاں تنی بھی مجھ کو خفا　　اگرچہ اس کا نہیں اس قدر گریباں تنگ
دل اس میں گر کے نہ کیوں کر اجل کا طعمہ ہو　　دہانِ مور سے ہے وہ چہِ زنخداں تنگ
خدنگ کا بھی ترے گر ادھر گزر ہوتا　　نہ تھا یہ کوچۂ زخمِ جگر تو چنداں تنگ

1۔ ل : جو یہ　　2۔ ل : کہ اس کو　　3۔ دوخت = سلائی

فضائے باغ کی اب یاد بھول جاؤ کہیں نہ ہووے تاکہ قفس تم پہ اے اسیراں تنگ
بہ رنگِ جامۂ گل دوش دل پہ چاک ہوا لباسِ صبر کہ تھا جوں قبائے طفلاں تنگ
شبِ فراق گلے پر میں رکھ دیا خنجر نہ ہووے زیست سے اتنا بھی سچ ہے انساں تنگ
کسی کی سانس کے رکنے کی اس کو کیا ہے خبر ہے اپنی جان سے آپھی غریب درباں تنگ
کلی نے کھلنے میں جب یہ ادا نہ پائی ہو گلوں کو کیوں نہ کرے وہ دہانِ خنداں تنگ
ہوا یہ جوشِ خریدار مصحفی اس سال
کہ ہوگئی رہِ بازارِ گل فروشاں تنگ

247

دکھا نہ مسّی لگا کر مجھے زباں کا رنگ کرے ہے قتل صنم خود لب و دہاں کا رنگ
ہوا مسّی سے کبودی لبِ بتاں کا رنگ دکھائے کیا ہمیں اب دیکھیں آسماں کا رنگ
شبِ سیہ ہے کبھی اور کبھی ہے روز سپید نت ایک رنگ پہ رہتا نہیں جہاں کا رنگ
ہوا تھا چور جو زخموں سے تیرے اے قاتل نظر پڑا نہ سپید اس کے استخواں کا رنگ
جو خونِ بے گنہاں یوں ہی وہ رہی ملتی[1] چمک رہے گا تری تیغِ امتحاں کا رنگ
ہوئی نہ خونِ تنِ کشتگاں میں وہ سر ڈوب نہیں تو اور چمکتا تری سناں کا رنگ
ضعیف اتنا ہوا وہ غمِ جدائی میں کہ رخ سے اڑ نہ سکا تیرے ناتواں کا رنگ
ہم اپنا چہرۂ زرد اس سے نت رگڑتے ہیں طلائی کیوں نہ ہو اس سنگِ آستاں کا رنگ
چمن میں کھولے تو گر چشمِ عاقبت بینی بہار میں نظر آوے تجھے خزاں کا رنگ
زبانِ[2] غیر جو صد سال خوں میں غرق رہے کبھی نہ پاوے مرے جوہرِ بیاں کا رنگ
غزل اک اور میں لکھتا ہوں مصحفی کہ تجھے
نظر پڑے مرے[3] کلکِ گہرفشاں کا رنگ

1۔ ل: تپتی 2۔ل سے اضافہ 3۔ل: ترے

248

بہ خندہ فاش ہوا غنچۂ دہاں کا رنگ　نہ چھپ سکا لبِ پاں خوردۂ بتاں کا رنگ
میانِ باغ و چمن لالہ ہو نکل آیا　چھپا سکی نہ زمیں خونِ کشتگاں کا رنگ
جلا کے برق نے بھسمنت[1] کردیا اس کو　ہوا یہ موسمِ گل اپنے آشیاں کا رنگ
مگر بہار کے دن پھر قریب آ پہنچے　شگفتگی پہ ہے مرغانِ بوستاں کا رنگ
دل اس کے کشتے کا چپکا تھا یہ کہ بعد از مرگ　دھوئے سے بھی نہ چھٹا تیغِ خوں چکاں کا رنگ
شگفتہ روئی گل دل میں کر رہی ہے ہجوم　ہے میرے رخ سے عیاں گرچہ زعفراں کا رنگ
ذرا ذرا کبھی اخگر سے جیسے دود اٹھے　لبوں پہ ہے یہ مری آہِ ناتواں کا رنگ
ہمارے گریے نے برسات جو[2] لگا دی ہے　ہوا ہے بیر بہٹی سا اس جواں کا رنگ
ہوں کشتہ نرگسِ سادہ کا اس کے، دور نہیں　جو بعدِ مرگ پیازی ہو استخواں کا رنگ

بچے گی جان مری اس سے مصحفی کیوں کر
اگر یہی ہے شبِ ہجراں جاں ستاں کا رنگ

249

نہ کیونکہ پھول کی پتی سا ہو نقاب کا رنگ　کہ اس کے حسن میں ہے تختۂ گلاب کا رنگ
بیانِ ہستیِ فانی جو میں لگا کرنے　تو اس کے سنتے ہی بس اڑ گیا حباب کا رنگ
اثر نہ ہووے جو روشن دلوں کی صحبت میں　تو سرخ آگ پہ ہو جاوے کیوں کباب کا رنگ
کہیں جو شب لبِ نوشیں کا اس کی آیا ذکر　تو سرخ و زرد ہوا بزم میں شراب کا رنگ
کیا ہے ذبح کسی نوجواں[3] کو کیا قاتل　حنا میں ہے ترے ہاتھوں کی جو شہاب کا رنگ
میں تشنہ کام جو دریا کے متصل جاؤں　تو موج آب بھی پیدا کرے سراب کا رنگ

1۔ بھسمنت کردینا = خاک کردینا　2۔ل : ہی　3۔ل : ناتواں

یہ ضعف بشرے میں آیا ہے ان دنوں اس کے کہ ریشِ شیخ پہ کھلتا نہیں خضاب کا رنگ
پڑا ہے اس میں ترے حسنِ نیم رنگ کا عکس اسی سبب تو گلابی ہے آفتاب کا رنگ
خمار میں بھی ہے کافر کے زور کیفیت کسے دکھاؤں تری چشم نیم خواب کا رنگ
بنا ہے جا کے جو وہ اوجِ آسماں پہ شفق اڑا ہے کس کے دلِ خانماں خراب کا رنگ
میں سال خوردہ ہوں ہے تب تو مصحفی ہر دم
نظر میں میری زمانے کے انقلاب کا رنگ

250

ان دنوں نکھرا ہے جو اس گل کی رعنائی کا رنگ حسن دکھلاتا ہے کیا کیا اپنی رسوائی کا رنگ
دن بہ دن ہوتا ہے افزوں واں خود آرائی کا رنگ یاں اڑا جاتا ہے رخسارِ شکیبائی کا رنگ
سانولا پن دیکھ کر مجنوں کا، لیلیٰ نے کہا ہو گیا کیسا سیہ اس مردِ سودائی کا رنگ
مجھ کو اتنا بے نمک بھی حسن بھاتا ہی نہیں کیا کہوں پھیکا ہے کیسا قومِ عیسائی کا رنگ
اپنے داغِ سجدہ پر نازاں ہے تو کیا زاہدا تجھ کو دکھلا دیں گے ہم اک دن جبیں سائی کا رنگ
عشق کی چوسر میں ہرگز کام کچھ جگ کا نہیں نردیاں رکھتی ہیں اپنے منہ پہ تنہائی کا رنگ
آئنے کی مبتذل[1] کیوں کر نہ ہو جاوے صفا حسن پر رہتا نہیں معشوق ہرجائی کا رنگ
کیا عجب ہے گر ترے حسنِ سپید و سرخ سے ہو گلابی پردۂ چشمِ تماشائی کا رنگ
مرگِ لیلیٰ کی خبر جب اس کو پہنچی نجد میں سنتے ہی فق ہو گیا مجنونِ صحرائی کا رنگ
پنجۂ مرجاں انھیں کرتا رہے ہر دم سلام یار افزوں ہو ترے ہاتھوں کی زیبائی کا رنگ
شیشے بدمستی میں توڑے شب جو میں نے مصحفی
اڑ گیا ہیبت سے میری چرخِ مینائی کا رنگ

1۔ مبتذل = بے آب

ل☆

251

جان کی بازی ہے یاں مردِ دلآور کا کھیل　　معرکۂ عشق میں چاہیے خنجر کا کھیل
رنگِ پریدہ مرا کھاوے ہے تاوے[1] ہزار　　یاد ہے اس کے تئیں خوب کبوتر کا کھیل
ششدرۂ دہر میں عقل ہے میری بندھی　　کیونکہ نہ حیراں کرے مجھ کو یہ ششدر کا کھیل
جامِ بلوریں کے ساتھ چاہیے بوتل ہمیں　　خطرے سے خالی نہیں شیشہ و ساغر کا کھیل
ہم نے جوانی میں لاکھ شعبدے دیکھے پر اب　　دیکھیں دکھاتا ہے کیا بازیِ اختر کا کھیل
واں ہیں میری فصد کی فکر میں مژگانِ یار　　آبلے پانو کے یاں کھیلیں ہیں نشتر کا کھیل
بنتے بگڑتے رہے خاک کے پُتلے مدام　　لیک نہ آخر ہوا چرخ کی چوسر کا کھیل
جائے ہے دل کے تئیں سانپ کی مانند ڈس　　جان کا لینا تو ہے زلف معنبر کا کھیل
کیوں نہ نظر سے نہاں ہووے کہ طفلی میں بھی　　آنکھ مچول ہی[2] تھا اس مہِ انور کا کھیل
جیسے پتنگ آخرش رنگ میرا اڑ گیا　　بسکہ اڑانا پتنگ تھا مرے دلبر کا کھیل
بازی ہی بازی دلا خاک میں دی ہے ملا　　عشق نہ سمجھے کوئی ایسے ستمگر کا کھیل
افعی کاکل سے وہ آپ کو رکھے بچا؟　　یاد ہو جس کے تئیں[3] سانپ کے منتر کا کھیل
ہوتے ہیں معشوق سب لالچی اس عہد میں　　عشق کی بازی میں ہے آٹھ پہر زر کا کھیل

مصحفی پیری میں ہم خاک برابر ہوئے
ہم کو نہ معلوم تھا اپنے مقدّر کا کھیل

☆ ل: آغاز ردیف اللام کہ در ردیف ہذا دوازدہ غزل است　　1۔ تاوے کھانا = کبوتروں کی ٹکڑی کا چکر لگانا
2۔ آنکھ مچول = آنکھ مچولی　　3۔ ل: نہیں (''نہیں'' سے بھی مطلب نکلتا ہے۔ اس صورت میں پہلے مصرع کو استفہامیہ انداز سے نہیں پڑھا جائے گا)

252

حور کا منھ ہے ملا دے تری تمثال سے گال؟ 　اس کے ہر چند ہوئے سادہ خط و خال سے گال

حسنِ بے ساختہ کو کچھ نہیں زینت درکار 　مہر کا ہووے مزیّب نہ کبھی خال سے گال

خط کا آنا ترے عاشق پہ قیامت لایا 　ہو گئے بسکہ سیہ نامۂ اعمال سے گال

بوسۂ تنگ دہاناں جو خوش آیا ہے اسے 　پہروں رہتا ہے لگا حقّے کے منہنال[1] سے گال

حسن کی تیرے تگ و دو[2] میں ہوا گرد آلود 　جھاڑے ہے، مہرِ فلک صبح کے رومال سے گال

سبزۂ خط کو مری جان منڈایا تو نے 　شکر صد شکر کہ نکلے ترے جنجال سے گال

ناتوانوں میں ترے پوست رہا ہے باقی 　ڈھونکیں ہیں وقت تنفس کے وہ اب کھال سے گال

گر ترے حسن کی گرمی میں گزر ہو اس کا 　لیوے خورشید کی مریخ چھپا ڈھال سے گال

مگر استاد نے مارے ہیں طمانچے اے گل 　آج مجھ کو نظر آتے ہیں ترے لال سے گال

مصحفی اب وہ غزل حسن کی لکھ جا دلچسپ
جس کی تصویر پری کے دے ملا گال سے گال

253

جب تک امرد کے رہیں سادہ خط و خال سے گال 　چاہیے روز وہ پونچھا کرے رومال سے گال

حسن کا اس کے یہ عالم ہے کہ چاہے ہے یہ جور 　بدلے ٹھوری سے تری ٹھوری تو پھر گال سے گال

روز وہ ڈاڑھ کے دکھنے کا بہانہ کر کے 　باندھ رکھتا ہے کڑھانے کو مرے شال سے گال

شب کو سووے جو انھیں رکھ کے وہ گل تکیوں پر 　صد خط نیل تو پیدا نہ کریں بال سے گال

اس کے عارض پہ جو بوسے کا تصور کیجے 　وہ ادا فہم لگے پونچھنے رومال سے گال

شعلۂ آہ نکلتے ہیں مرے یوں منھ سے 　تو کہے دیکھ جنھیں تھے یہ بھرے رال سے گال

پے بہ پے لیویں جو عاشق ترے جب تب[3] بوسے 　کیونکہ افسردہ نہ ہوں روز کے دھمال[4] سے گال

1۔ منہنال (فارسی: مہنال) وہ نلی جو حقّے کی نے پر لگاتے ہیں　2۔ ل: تگ و تاز میں ہو گرد آلود

3۔ ل: جب جب　4۔ دھمال = دھما چوکڑی، اچھل کود

کیجیے بہرِ خدا گرم خرامی موقوف کیونکہ ہوتے ہیں برافروختہ اس چال سے گال
قہر ہے اس کی عماری کا گھٹا ٹوپ نسیم جس سمن برکے عرق کرتے ہوں سکھپال[1] سے گال

مصحفی شوق تو تھا ہم کو بھی تمباکو کا
لیکن آیا نہیں مصرف میں کئی سال سے گال

254

جاکے میں عیسیٰ سے کیا پوچھوں دوائے دردِ دل کاش وہ بے درد ہووے آشنائے دردِ دل
جنس یہ بازار میں لگتی نہیں ہرگز بھی ہاتھ جان بھی دیجے تو کمتر ہے بہائے دردِ دل
کس کے کوچے کی طرف لے جانے کا ہے اس کے قصد کیوں مجھے ہر دم اٹھاتا ہے عصائے دردِ دل
آہ کو[2] سینے سے باہر جانے کی رخصت نہ دی آفریں ہمت کو تیری اے حیائے دردِ دل
حشر کے دن خاک سے جب ہم کو پھر پیدا کیا ہم لحد سے مانگتے اٹھے دعائے دردِ دل
آخرِ شب آنکھ کھل جاتی ہے جب میری مجھے نالۂ بلبل سے آتی ہے صدائے دردِ دل
بے شعوری دیکھیے جو مطلقاً واقف نہیں اس سے ہم کہنے لگیں ہیں ماجرائے دردِ دل
دیکھتے ہم کیونکہ پھر کھلتا وہ غنچے کی طرح گر ترے دل کو صنم لگتی ہوائے دردِ دل

کتنے ناداں ہیں کہ شہرِ عاقلاں میں مصحفی
ہم درِ دار الشفا پر ہیں گدائے دردِ دل

255

آہ بھاتا نہیں دل کو ترا جانا شبِ وصل منھ دکھا کر نہ مجھے پیٹھ دکھانا شبِ وصل
دیکھ کر تجھ کو مری جان جو ہو شادیِ مرگ کام رکھتا ہے ذرا اس کا جلانا شبِ وصل
پھر یہ ایّام کب آویں گے خدا سے تو ڈر تجھ کو ایّام کا ناحق ہے بہانا شبِ وصل
ان کی حسرت نگہی عیش کو کر دیتی ہے تلخ اے فلک چشم کو اک کب کو سلانا شبِ وصل

1۔ سکھپال = زنانہ پالکی، ڈولا 2۔ ل سے اضافہ

غسل کر، آگ پہ تم بالوں کو کیوں سینکتے ہو
کچھ بھلا بھی نہیں سنبل کا جلانا شبِ وصل

ہم سے وعدہ تو کرو، غم نہیں، ہم نے مانا
آپ آتے ہی ہمیں زہر پلانا شبِ وصل

دیکھ کر اس سے ہم آغوش مجھے بولا غیر
رشک اس شخص پہ کھاتا ہے زمانہ شبِ وصل

پیشتر یار کے جانے سے مرے لیجیو جان
منھ مجھے صبح کا یا رب نہ دکھانا شبِ وصل

عفو تقصیرِ محبت تُو کرے یا نہ کرے
تیرے قدموں سے ہمیں سر نہ اُٹھانا شبِ وصل

کون جانے ہے کہ تاریکیِ شب میں کیوں کر
دولتِ حسن کا لٹتا ہے خزانہ شبِ وصل

مصحفی اب کے وہ آوے[1] تو مقرر تو بھی
پاسباں در پہ کوئی اپنے بٹھانا شبِ وصل

256

کرنا ہمسائے میں شادی کا بہانا شبِ وصل
اس کو گر وعدے پہ آنا و نہی جانا شبِ وصل

لے گیا اس کو اٹھا گھر سے مرے غیر کے گھر
کر گیا یہ ستمِ تازہ زمانہ شبِ وصل

اک طرف یار کہ ہم کو تو میسر نہ ہوا
اٹھ کے سو بار چراغ اس کو جلانا شبِ وصل

وزدیِ بوسہ کے خطرے سے یہ کہتا ہے وہ شوخ
کر تو پانو کی طرف اپنا سرہانا شبِ وصل

ہے مسیحائی یک جنبش لب پر موقوف
خواہش مردۂ عاشق کو جلانا شبِ وصل

یار کو سوتے سے سو بار جگایا لیکن
بختِ خوابیدہ کو آیا نہ جگانا شبِ وصل

تیرہ روزی[2] سے، جو نکلا میں بیٹھے بیٹھے
یاد آیا اسے کاجل کا لگانا شبِ وصل

بوسہ میں اس سے جو مانگا تو وہ ہنس کر بولا
کوئی دیتا نہیں برباد خزانا شبِ وصل

پستیِ بخت سے سو رہتے ہیں ہم زیرِ پلنگ
اس کی خلوت میں یہ ہے اپنا ٹھکانا شبِ وصل

کرنا پرہیز میاں مصحفیِ حیراں سے
منھ کا ہے صورتِ دنیا سے چھپانا شبِ وصل

1۔ ل : روکے 2۔ل سے اضافہ

257

سمجھو ہو، ظلم، ہے عاشق کا ستانا شبِ وصل
غیر کو ساتھ مری جان نہ لانا شبِ وصل

دل میں حسرت تو نہ رہ جائے ہم آغوشی کی
موت سے میری ذرا پیشتر آنا شبِ وصل

حالِ دل اس سے میں کہتا تو ہوں پر یہ ڈر ہے
صبح کر دیوے نہ باتوں میں زمانا شبِ وصل

اپنے آنے سے پشیماں جو ہوا ہے وہ شریر
دم بدم ڈھونڈے ہے اٹھنے کا بہانا شبِ وصل

ہوگئی صبح سپیدی سے عیاں دانتوں کی
راس آیا نہ ہمیں اس کا ہنسانا شبِ وصل

اس نے ہونٹوں پہ دھواں دھار جڑی ہے مسّی
اے اجل اس کے تو مت سامنے آنا شبِ وصل

نذر کیا آتشِ بے دود کی کرتا میں فقیر
بوریا بھی تو نہ تھا گھر میں پرانا شبِ وصل

پنکھڑی جس میں گڑیں اس تنِ نازک کے تلے
ظلم ہے چادرِ گل کا بھی بچھانا شبِ وصل

چشمِ بد کے لیے تا نقطے سپند اس پر ہوں
خط منگا طاق سے عاشق کے جلانا شبِ وصل

خشک کر دے مرا آنسو تو عجب اس کا نہیں
تجھ کو آتا ہے سمندر کا سُکھانا شبِ وصل

خون پر اپنے کمر باندھنی ہے آپ میاں
مصحفی اس کے تئیں پان کھلانا شبِ وصل

258

فہمید ہے جو تجھ کو تو فہمید سے نکل
اور دید کا جو شوق ہے تو[1] دید سے نکل

زندانِ ہجر میں ہمیں سونپا تھا عشق نے
آئے ہیں ہم نصیبوں کی تائید سے نکل

قالب میں میرے یارو بھلا! کیا سماوے دم
جب جان کو کہے کوئی تاکید سے نکل

تشبیب میں بھی لطف ہے اک اے قصیدہ گو
اتنا شتاب بھی تو نہ تمہید سے نکل

مصرع کو پہنچے مصرعِ ثانی برا ہے کیا
کر لے نکاح[2]، عالمِ تجرید سے نکل

کر تو عیوبِ نظم سے پرہیز اے فلاں
شاعر ہے تو تنافر و تعقید سے نکل

1۔ ل : چل 2۔ ل : نگاہ

ہیں یاد کب اسے مری وحشت کے رنگ ڈھنگ مجنوں گیا ہے دشت کو تقلید سے نکل
وہ مست میں نہیں ہوں کہ مستوں کی کھا کے ڈھول جاؤں شراب خانۂ توحید سے نکل
ہو مصحفی تو علم الٰہی کا آشنا
قید عناصر اور موالید [1] سے نکل

259

کر صبر کوئی ساعت، فریاد و زاریِ دل لینے دے چین اک دم اے بیقراریِ دل
مضبوط دوستی میں تم ہو تو ہم بھی ہوویں دونوں طرف سے لازم ہے استواریِ دل
ہر لحظہ یہ تو اس سے حاضر رہا و لے واں آئی پسند کس دن خدمت گزاریِ دل
صد کوہِ غم بھی تجھ پر ٹوٹے پہ دم نہ مارا صدقے گیا میں تیرے اے بردباریِ دل
واں سیر سے چمن کی اور خندۂ رقیباں یاں سودۂ نمک ہے اور زخم کاریِ دل
یہ درد تو نہ کیجو یا رب نصیبِ دشمن ہوتی ہے کیا بری شے بے اختیاریِ دل
گر ہجر میں بتاں کے اے عشق یہ مزا ہے نومیدیوں کے صدقے امیدواریِ دل
اے مصحفی جہاں میں طوفان آ چکا تھا
آنکھوں سے تھم نہ جاتی گر اشک باریِ دل

260

روز دیکھے ہے اس کو خواب میں دل پھنس گیا آہ کس عذاب میں دل
گر تو عاشق جلا بھنا ہے تو یار دے پرو سیخ پر کباب میں دل
مرغ سدرہ کباب کو تیرے بھون رکھتا ہے آفتاب میں دل
یوں ہے یادِ رخِ مخطّطِ یار جیسے ملّا کا ہو کتاب میں دل
حبِّ افیوں سمجھ کے گھول دیا میں نے کل ساغرِ شراب میں دل

1۔ موالید (مولود کی جمع) لڑکے، بچے

اینٹھنا دیکھ اس کی زلفوں کا سخت رہتا ہے پیچ و تاب میں دل
عشق کھاتا ہے گردۂ[1] گرداں
مصحفی کا ہے کس حساب میں دل

261

کیا مصور سے کھنچے زلفِ کج یار کی شکل ہاتھ میں لیتے قلم آئی نظر یار کی شکل
دیکھ سکتا نہیں یہ بھی فلکِ تفرقہ ساز ایک جا ہوویں مرقع میں جو دو چار کی شکل
پاسبانی ہی شبِ وصل کے تاروں کی[2] نہ کر ان سے ہوتی ہے عیاں دیدۂ بیدار کی شکل
آہ کس نرگسِ بیمار کا غم اس کو لگا زرد اتنی تو نہ تھی نرگسِ بیمار کی شکل
یار ہم خانہ ہے پر مجھ کو خوشی کیا اس کی شرم کا پردہ تو ہے بیچ میں دیوار کی شکل
غنچۂ گل کی مصور جو تو کھینچے ہے شبیہ اس کے نزدیک ہو بلبل کے بھی منقار کی شکل
ماہِ کنعاں کو اگر اس کا دکھاؤں نقشا غش کرے دیکھتے ہی میرے طرح دار کی شکل
کمرِ یار اسے دیکھ کے یوں بل کھاوے مُو سے باریک ہو جب اپنے تنِ زار کی شکل
عشق کر دیتا ہے شیروں کو سکھا کر لقات[3] رفتہ رفتہ یہی ہوتی ہے اس آزار کی شکل
یہ نئی رسم ہے یاں کی کہ خفا ہوتے ہیں خود فروشانِ جہاں دیکھ خریدار کی شکل
گھر میں بیٹھے ہی بتاں کرتے ہیں خوبی کا گھمنڈ ابھی اس جنس نے دیکھی نہیں بازار کی شکل
اپنی خاطر سے بنا حشر کے ہنگامے کی کہ نہ پہچانے کوئی اپنے خریدار کی شکل
دیکھتا ہوں مہِ کامل کو تو یہ کہتا ہوں کتنی اس سادہ سے ملتی ہے مرے یار کی شکل
تیرے مقتولوں کا ہوتا ہے مرقع[4] تیار چاہیے اس میں نہ ہووے سرِ دستار کی شکل
بند کرتا نہیں نالے سے زباں مرغِ اسیر گرچہ ہے چوبِ قفس سامنے تلوار کی شکل
برق کی طرح ٹھہرتی نہیں آنکھوں میں ذرا کتنی چالاک ہے اس دلبرِ عیار کی شکل

1۔ گردہ = چکر (گردہ گرداں) سے بھی مطلب نکلتا ہے 2۔ ل : کو

3۔ لقات = (فارسی: نکات) کمزور، ناتواں 4۔ ل : مرقہ

ہم ہیں پابند چمن، یہ نہیں معلوم مجھے　　دام میں کیا ہوئی مرغانِ گرفتار کی شکل

مصحفی جب میں پڑھوں اس غزلِ رنگیں کو
کیوں نہ سو رنگ دکھاوے مرے ہمکار کی شکل

262

گر پیے اک دن تو اے دل[1] ہاتھ سے کامل کے مُل　　ساغرِ وحدت نظر آویں تجھے سب گل کے گُل

ایک دن وہ تھا کہ ہم تم پی رہے تھے مل کے مُل　　یا یہ اک دن ہے کہ ہم پر خندہ زن ہیں کھل کے گُل

خوں گرفتہ گر نہیں مریخ تو کس واسطے　　سامنے آتا ہے وہ ہر دم مرے قاتل کے تُل

باغ میں جا کر اگر نالہ کرے مجھ سا اسیر　　کھل پڑے یکبارگی صد قمری شاغل کے غُل

مجلسِ اہلِ عزا ہے خیمۂ چرخ کبود　　بعد نوحہ یاں پڑھے جاتے ہیں ہر عاقل کے قُل

مرگ کا عقدہ نہ ہرگز فلسفی سے حل[2] ہوا　　گرچہ ناخن ریز تھے اس عقدۂ مشکل کے کُل

مصحفی یہ وہ زمیں سودا کی ہے جو کہہ گیا
آبِ چشمِ عاشقاں دے توڑ پل میں پُل کے پُل

م ☆

263

بعدِ رخصت نہ اُٹھے اپنے تو زنہار قدم　　رہ گئے چل کے ترے کوچے سے دو چار قدم

کس طرف جاتے ہیں مجھ کو بھی یہ معلوم نہیں　　کون سی راہ کے جویاں ہیں شب تار قدم

میں تو کیا چیز ہوں رستے کا بھی اس کوچے میں　　نہیں پڑتا طرفِ سایۂ دیوار قدم

طے نہ ہو تو بھی راہِ آبلہ فرسائے جنوں　　آہنی ہوں جو مرے صورتِ پرکار قدم

1۔ ل : اے دل تو اک دن　2۔ل : وا ہوا　☆ ل : آغاز ردیف میم کہ در ردیف ہذا چہاردہ غزل است

اس کے کوچے کی طرف جاتے خدا خیر کرے آج کرتے ہیں گرانی دمِ رفتار قدم
خواہش نعل پری تھی جو مجھے رکھ دیے رات میری چھاتی پہ ترے رخش نے یکبار قدم
اس کو تکلیف نہ دے سیرِ گلستاں کی نسیم حلقۂ دام میں ہوں جس کے گرفتار قدم
دستِ گستاخ کی جو یاد ہے دامن گیری نہیں رکھتا مری تربت پہ وہ عیار قدم
روز مقتل کی طرف سوتے میں آتے ہیں[1] چلے تھے کب اس خاک پریشاں کے سزاوار قدم
راہ ہاتھوں سے مجھے چلنی پڑی ہے کہ مرے ہو گئے تھک کے رہِ عشق میں بیکار قدم
مصحفی اتنی بری بھی تو نہیں ہے یہ زمیں
گر رکھے اس میں ترا خامہ بہ تکرار قدم

264

منزلِ ملکِ فنا جب رہی دو چار قدم اس میں بسمل ترے جاویں گے دونہی مار قدم
پچھلے پانو ترے کوچے سے نہ پھرتے تو ہمیں کر چکے تھے شبِ یلدا میں گنہگار قدم
کاش پانو سے مرے باندھ دے وہ سل کوئی سنگ کے چاہتے ہیں[2] یہ رہِ پُرخار قدم
خط پسینے سے ترا باعثِ بیم جاں ہے سبزہ آب پہ رکھتا نہیں ہشیار قدم
یا الٰہی نہ رہِ تفرقہ پیش آئے انھیں ہوں نہ آپس سے جدا صورتِ پرکار قدم
ان کو معلوم نہ تھا پست و بلندِ عالم ڈھونڈتے آئے ہیں کس جا، رہِ ہموار قدم
میں ترے کوچے سے آتا ہوں تو وہ کعبہ سے کیوں نہ آنکھوں سے لگاویں مرے زوّار قدم
مثلِ تصویر وہ حیرت زدہ ہوں میں جس کے کبھی فرضاً[3] نہ ہوئے قابلِ رفتار قدم
صفحۂ دہر میں جوں خامہ رہے اپنے دریغ تیرہ بختی کے سلاسل میں گرفتار قدم
آفریں بازوے فرہاد کے تھے مدت سے تیشۂ قطعِ تعلق کے طلبگار قدم
مصحفی گر ہے سہ غزلے کا تجھے[4] شوق میاں
اب کے اس کوچے میں ٹک اور بھی تو مار قدم

1۔ ل، ب: جاتے 2۔ مراد چاہتی ہے 3۔ فرضاً = فرضی طور پر بھی؟ 4۔ ل: مجھے

265

بوریا سے مرے اٹھتے نہیں زنہار قدم
منزل فقر میں ہو جاتے ہیں بیکار قدم

ان کے ہاتھوں سے ستم مجھ پہ ہے، اچھا ہوتا
بھول جاتے جو رہِ خانۂ خمار قدم

دامنِ دشت پُر از لالہ و گل ہے سارا
بسکہ کانٹوں نے کیے ہیں مرے افگار قدم

اس نوازش میں گیا جی ہی مرا شب در تک
وقت رخصت جو وہ ساتھ آئے تھے دو چار قدم

وادیٔ عشق وہ منزل ہے ادب کی جس میں
جلد اٹھانے سے بھی ہوتے ہیں گنہگار قدم

آنکھ للچائی ہے اس پردہ نشیں پر میری
جس کی جوتی نے نہ رکھا سر بازار قدم

فرشِ گل سے وہ کفِ پا کرے کیوں رنجیدہ
جس کے سمجھے ہوں رگِ گل کے تئیں خار قدم

جی نکلنے کو گلی سے تری چاہے گا مرا
کاش یاں خوابِ ابد کے ہوں سرافراز[1] قدم

یہ بھی انداز خرام اس نے نکالا ہے نیا
دیکھتا جائے ہے پھر پھر دمِ رفتار قدم

لڑکھڑاتا ہوا جاتا ہے جو زخمی تیرا
اس کے گنتے ہیں کھڑے مردمِ بازار قدم

فخر کچھ اس میں نہیں مصحفی اپنے نزدیک
رخشِ معنی کے ہیں یہ چار غزل چار قدم

266

جب میں رکھا بہ رہِ وادیٔ پُر خار قدم
خضر بھی چل نہ سکا ساتھ مرے چار قدم

آہ کس غرفۂ نشیں کا نظر آیا جلوہ
چلتے چلتے جو مرے ہوگئے دیوار قدم

گر یوں ہی بیچ میں رکھیں گے صنم کی زلفیں
رکھ چکے کعبے میں وابستۂ زنار قدم

تو ہے وہ جنسِ گراں مایہ کہ دکاں سے تیری
پیشتر رکھ نہیں سکتا ہے خریدار قدم

بے خبر میں تو سرِ راہ پڑا تھا اے وائے
ایک ٹھوکر میں مجھے کر گئے مسمار قدم

بختِ خفتہ کو جگاؤں کہ پڑا کیا ہے تو اٹھ
گر رکھے گھر میں مرے دولت بیدار قدم

1۔ ل : سزاوار

کیونکہ میں حلقۂ زنجیر سے باہر جاؤں
اور جو جاؤں ابھی ہوویں گنہگار قدم

سرقہ[1] والوں کو مرے سامنے مشکل ہے ثبات
چور کے سچ ہے ٹھہرتے نہیں زنہار قدم

چرخ یوں رکھے ہے گردش میں مجھے لیل و نہار
گاوِ عصّار[2] کے جس طرح ہوں پرکار قدم

میری ہستی ہے گراں اسفل اعضا پہ مرے
سر پہ ناحق یہ لیے پھرتے ہیں بیکار قدم

خانۂ بازیِ طفلاں تھے مگر ہم جو ہمیں
ایک ٹھوکر میں ترے کر گئے مسمار قدم

نہیں بے فائدہ ہم صحبتیِ اہلِ کمال
پاے چوبیں کو کرے صاحبِ رفتار قدم

یہی خوں ریزی کا عالم ہے تو کُشتوں کے ترے
عَلم آویں گے نظر صورتِ اشجار قدم

سحر کیا ہے تری رفتار میں جس کے آگے
کبک و طاؤس کے اٹھتے نہیں زنہار قدم

مصحفی کیونکہ سفر کا میں کروں واں سے قصد
جس گلی سے ہو اُٹھانا مجھے دشوار قدم

267

دیوانہ وش ہمیشہ پھرتے رہے وہیں ہم
ہر دم گلی کی اس کی ناپا کیے زمیں ہم

ہونٹوں پہ جان آئی اور منھ سے کچھ نہ نکلا
ضبطِ نفس پر اپنی کرتے ہیں آفریں ہم

دنیا کا ناگوارا، ہے ہم کو سب گوارا
حنظل کے طعم کو بھی سمجھے ہیں انگبیں ہم

پڑھتی نہیں ہے تو تو ہرگز ہمارے خط کو
مارے ہوئے ہیں تیرے اے چشمِ سرگیں ہم

دو پیسے کا ہے تھیوا از بہرِ مُہر کافی
نام آوری کی خاطر کھدواویں کیا نگیں ہم

شرمِ نگہ سے ایسی گردن ہماری خم ہے
پہنے ہوئے ہیں گویا اک طوق آہنیں ہم

چھوٹی سی جاہی جو ہی پیاری لگے ہے ہم کو
اے باغباں نہ لیں گے گلہاے یاسمیں ہم

بالیں تلک ہماری آنا تھا فرض اس کو
قاصد سے دل کی کہتے شاید دمِ پسیں ہم

گہ سبزہ اور گہے گل اپنا رہا نشیمن
جوں شبنم اس چمن میں یعنی ہیں خوش نشیں ہم

نازک لب اپنے وہ گل رکھے گلاس پر کب
گیلاس کا بنا دیں جب تک نہ ساتگیں[3] ہم

1۔ ل سے اضافہ 2۔ گاو عصّار = مراد کولھو کا بیل 3۔ ساتگیں = شراب کا پیالہ

مقتل میں عاشقوں کے پہنچا جو دل تو بولا
تو ہم رہاں سدھارو اب تو رہے یہیں ہم
دن رات کا تو مرنا پورا بلائے جاں ہے
جھگڑا چکے سدا کا مر بھی چکیں کہیں ہم
اے مصحفی لطافت اس میں کمال دیکھی
ہے جی میں پھر کریں ٹک سرسبز یہ زمیں ہم

268

ہر دم فراشِ[1] غم سے ہیں نالہ آفریں ہم
کچھ کام کر رہیں گے جا کر تہِ زمیں ہم
یہ پھول ڈھڈ ہے سب[2] لیتا ہے چن چمن سے
اک دن قلم کریں گے انگشت لالہ چیں ہم
ٹک سیر کر چمن میں آ کر کہ تیری خاطر
سنبل سے لڑ رہے ہیں اے زلف عنبریں ہم
حسرت پہ ٹک ہماری کیجو نظر خدا را
فصل بہار میں ہیں مرغ قفس نشیں ہم
مثل چراغ مفلس جاتے ہیں خود بخود بجھ
اس امر میں نہیں کچھ محتاج آستیں ہم
جل جل گئی ہیں پوریں ازبسکہ اس چمن میں
چنتے رہے ہیں اکثر گلہائے آتشیں ہم
رشتہ نفس کا اپنے باعث حیات کا ہے
یعنی ہیں گل کی پتی قائم بہ خود نہیں ہم
دیر و حرم میں ہم نے اس سے کیے ہیں سجدے
تیرے لیے کہاں سے لاویں نئی جبیں ہم
پوچھا جو میں کوئی ہے اس شہر میں پری وش
بالاضطراب بولا وہ شوخ نازنیں: ''ہم''
عکس اس کا نت رقابت کرتا رہا ہماری
مانند آئینہ تھے ہر چند پاک بیں ہم
آتے ہو تم کہیں سے خفت اٹھائے صاحب
پہچانتے نہیں ہیں کیا چشم شرگیں ہم
آتش اسے جلاوے، پانی اسے گلاوے
کس کس سے پھر بچاویں یہ جسم کاغذیں ہم
اے مصحفی ہمارا عالم ہی کچھ جدا ہے
صنعت میں ریختہ کے سودا ہیں نے یقیں ہم

1۔ ل : تراش 2۔ ل : ہی

269

ہے جو خوباں کے تئیں ظلم کی تحریر سے کام
روز لیتے ہیں قلم کا یہ نئے تیر سے کام

خواہ ویرانے میں رکھ خواہ تو آبادی میں
تیرے مجنوں کو ہے خانۂ زنجیر سے کام

شام ہجراں ہی میں دم بند ہوا عاشق کا
نہ رہا کچھ بھی اسے نالۂ شب گیر سے کام

آہ کیوں اس کے بنانے میں اٹھایا یہ رنج
کلک صانع کو نہ تھا گر تری تصویر سے کام

سختیِ ہجر بھی ہرگز نہ ہوئی کچھ معلوم
ہم کو ازبس کہ رہا وصل کی تدبیر سے کام

پیش قبض اب تو نزاکت سے گراں ہے اس پر
کمر اس بت کی رکھے تھی کبھی شمشیر سے کام

ہیں بتاں خانہ خرابی کے ہماری در پے
ہے انھیں آٹھ پہر ظلم کی تدبیر سے کام

مصحفی پیش گئی اپنی نہ تدبیر کبھی
یاں بگڑتے ہی رہے بازیِ تقدیر سے کام

270

ہے کس کا قلق سلسلہ جنبانِ تلاطم[1]
پاتا ہوں یمِ گریہ میں طوفانِ تلاطم

تھا شب جو یمِ گریہ سے پیمانِ تلاطم
قطرہ مرے ہر اشک کا تھا جانِ تلاطم

ٹھہرے ہیں جو ٹکڑے کئی مژگاں پہ جگر کے
گویا کہ وہ بیچارے ہیں مہمانِ تلاطم

گر ہووے مسیحا مری کشتی کا معلّم[2]
اس سے بھی کبھی ہووے نہ درمانِ تلاطم

جب جوش پر آیا تھا مرے اشک کا قلزم
ہر قطرے میں تھی وسعتِ دامانِ تلاطم

کچھ رحم بھی کرتے ہیں کسی خاک نشیں پر
اے گریہ یہ ہوتا نہیں عنوانِ تلاطم

کشتی مری جوں برگِ خزاں اے یمِ گریہ
لطمے کے ہی قابل ہے نہ شایانِ تلاطم

ڈرتا ہوں کہ بہتی نہ پھرے زورق گرداں
ہے رو بہ ہوا طرّۂ پیچانِ تلاطم

دریا کی تو ہمت سے بہت دور ہے یہ بات
تنکے کے لیے کیجیے سامانِ تلاطم

1۔ ل : طلاطم (پوری غزل میں) 2۔ معلم = ملاح

دل ڈوب گیا، ٹوٹ گیا صبر کا لنگر　ہو کشتیِ تن کیوں نہ پریشانِ تلاطم
یہ جوش ہے قلزم کا تو اغلب کہ نکل جائے　سورج کے بھی پنجے سے گریبانِ تلاطم
لنگر مری کشتی سے جدا ہو نہیں سکتے　ہیں بیمِ تلاطم سے بہ زندانِ تلاطم
کیا اشک کے دریا سے سمندر ہو مقابل　ہر موج ہے یاں سلسلہ جنبانِ تلاطم
پہنچا ہے جہاز اپنا سیاہی سے بھی کچھ دور　ساکن نہ ہوں کیوں اس کے پریشانِ تلاطم
پیچھے رہی وہ جا بھی جہاں ہووے تھی گاہے　سورج کی کرن شمعِ شبستانِ تلاطم
اے مصحفی اس بحر میں ہے پھر بھی قلم کی
یہ تازہ زمیں سلسلہ جنبانِ تلاطم

271

کس کس سے پھریں پوچھتے درمانِ تلاطم　اب کشتیِ تن اپنی ہے خواہانِ تلاطم
میں اشک کا قطرہ ہوں مرا جوش میں آنا　ہے درّ گردِ جنبشِ مژگانِ تلاطم
کشتی مری لنگر کی تو زحمت سے نکل جائے　ہو کاش ہوا سلسلہ جنبانِ تلاطم
مرکب ہو مرا خس بھی تو پھر نوح کی کشتی　منھ اپنا چھپاوے تہِ دامانِ تلاطم
اک اشک کے قطرے میں تنِ زار ہمارا　مثلِ خسِ دریا ہے پریشانِ تلاطم
اے مصحفی گریے کا مرے جوش ہے کچھ اور
یاں غوطہ ہی کھاتا ہے سلیمانِ تلاطم

272

یادگارِ گزشتگاں ہیں ہم　خوب دیکھا تو پھر کہاں ہیں ہم
شمع کی طرح بزمِ گیتی میں　داغ بیٹھے ہیں اور رواں ہیں ہم
رہے جاتے ہیں پیچھے یاروں سے　گردِ دنبالِ کارواں ہیں ہم
رکھ نہ خنجر کو ہاتھ سے قاتل　تیرے کُشتوں میں نیم جاں ہیں ہم

آبیارِ سخن ہے اپنی زباں لفظ و معنی کے باغباں ہیں ہم
تُو ہی تُو ہے جو خوب غور کریں ایک دھوکا سا درمیاں ہیں ہم
دعوتِ تیغ کے تو قابل ہیں گو کہ یک مشتِ استخواں ہیں ہم
رنگِ رخ پر ہمارے، زردی سی نظر آتی ہے، کیا خزاں ہیں ہم
گو کیا ہم کو سرد پیری نے پر ابھی طبع میں جواں ہیں ہم
اور بھی ہم کو رہنے دے چندے گو تری طبع پرُ گراں ہیں ہم
باغباں اب چمن سے جاویں کہاں بلبلِ کہنہ آشیاں ہیں ہم
مصحفی شاعری رہی ہے کہاں
اب تو مجلس کے روضہ خواں ہیں ہم

273

آلودگیِ تن سے اگر پاک ہوئے ہم تو دیکھیو خود شعلۂ ادراک ہوئے ہم
کچھ بوسہ نہ لینا تھا ہمیں رنگ کفک کا کیا جانیے کیوں بستۂ فتراک ہوئے ہم
جس باغ میں دیکھا گلِ نو رستہ شگفتہ اس باغ کے خاروخس وخاشاک ہوئے ہم
لیتے لبِ معشوق نمازی کا تو بوسہ افسوس نہ ریشم کی بھی مسواک ہوئے ہم
اس[1] باغ میں آئے تو ولے دست صبا سے پیراہنِ گل کی ہی طرح چاک ہوئے ہم
مے نوشی کی اس باغ میں آ غنچۂ گل نے خمیازہ کشی کو شجرِ تاک ہوئے ہم
قاصد کی خبر آنے کی تھی اور وہ نہ آیا افسوس کہ شب شادی میں غمناک ہوئے ہم
ہر چند کہ ہو لولیِ[2] دنیا متجلّی کب معتقدِ زیور و پوشاک ہوئے ہم
سمجھیں گے کہ اب رتبۂ اقبال کو پہنچے جس روز ترے بستۂ فتراک ہوئے ہم
اے مصحفی جتنے کہ چبھے پانو میں کانٹے
اتنے ہی رہِ عشق میں چالاک ہوئے ہم

1۔ ل سے اضافہ 2۔لولی = قحبہ

274

دیکھ لے نیک و بدِ عالمِ امکاں کوئی دم
خانۂ تن میں دلا جان ہے مہماں کوئی دم

کافری مجھ سے تری چشم نے کیا کیا کی ہے
بیٹھ کر کاش کہ منصف ہوں مسلماں کوئی دم

کیا قیامت ہے کہ بیتابیِ دل سے شب ہجر
رکھنے پاتا نہیں مژگاں پہ میں مژگاں کوئی دم

خواب کس طرح سے آوے کہ مری آنکھوں کو
چین دیتا ہی نہیں اشک کا طوفاں کوئی دم

باغ ہستی سے سفر اپنا بہت جلد ہوا
چننے پائے نہ گل حسرت و حرماں کوئی دم

یہ توقع ہے کہاں جامۂ عریانی سے
کہ میں آنکھوں پہ رکھوں گوشۂ داماں کوئی دم

باغباں موسم گلگشت ہے در بند نہ کر
ہم بھی کر لیویں بھلا سیر گلستاں کوئی دم

بے قراری نے تری سخت مجھے گھیر[1] لیا
یہ بھی کیا خو ہے کہ ٹھہرائے دل ناداں کوئی دم

طرفہ عالم نظر آیا تری زلفوں کا مجھے
کوئی دم جمع اگر ہیں تو پریشاں کوئی دم

نالۂ قیس پہ ناقے کو ذرا ناچنے دے
وادیِ نجد ہے چپ رہ تو حدی خواں کوئی دم

روز محشر اسی باعث سے خجالت کھینچی
دل لگا کر نہ ہوئے ہم جو پشیماں کوئی دم

گر کہ ہوں دُور، تصور میں مزے لوٹوں ہوں
نہیں وہ چہرہ مری چشم سے پنہاں کوئی دم

مصحفی یار کو نامہ تو رقم کر لوں میں
ٹھہرے گریہ سے اگر دیدۂ گریاں کوئی دم

275

آئینہ جس کا ہو نہ کبھی آشنائے چشم
دیکھوں میں کیونکہ غیر سے وہ یوں لڑائے چشم

بندوں کا تیرے جامے کے ہووے نہ گر خیال
اتنے تو لمبے لمبے نہ آنسو بہائے چشم

ٹپکا کریں جو یاد میں فندق کے اشکِ سرخ
کیوں تہ بہ تہ نہ ہوں شفقی پردہ ہائے چشم

آخر معاش دیکھیے عاشق کی کیونکہ ہو
شوخی سے آشنا نہیں اب تک حیائے چشم

1۔ ل : گھبرایا

نکلے ہے جب کبھی صفِ مژگاں سے وہ نگاہ رجعت کے وقت ہوتی ہے آپھی فدائے چشم

عینک کا مجھ کو کچھ نہ محتاج دیکھیو پیری میں ساتھ دیجو مرا اے وفائے چشم

چشمک زنی میں مجلسِ خوباں کی گھر کے رات ق ناحق میں ہو گیا تھا اسیرِ بلائے چشم

اتنے میں شب جو ہو چکی آخر ہوئی یہ[1] خیر زنجیر خواب پڑ گئی سب کے بہ پائے چشم

بینش زیادہ ہوتی ہے نت مجھ کو مصحفی

گویا سوادِ شب ہے مرا توتیائے[2] چشم

276

یاد کر اپنی گرفتاری کے ایّام کو ہم زیرِ خنجر بھی تو دیتے ہیں دعا دام کو ہم

سنتے ہی یار کے آنے کی ہوئے شادی مرگ روک سکتے تھے اجل کے کوئی پیغام کو ہم

اے شبِ گور کہیں تو نہ چرانا پہلو خوب ترسے ہیں شبِ وصل کے آرام کو ہم

اتنے محکومِ بتاں ہیں، جو یہ کافر چاہیں پہنیں زنّار ابھی چھوڑ دیں اسلام کو ہم

مصلحت ہووے ابھی شدتِ بیتابیِ دل چندے موقوف کریں نامہ و پیغام کو ہم

بختِ خوابیدۂ پروانہ جگائے اس نے آفریں کیوں نہ کہیں تیرگیِ شام کو ہم

اے اجل اتنی تو مہلت دے کہ چلتے چلتے دیکھ لیں عمر کے خورشیدِ لبِ بام کو ہم

تیری[3] آنکھوں سے اسے دعویِ ہم چشمی ہے ایک دن مینو چبا جاویں گے بادام کو ہم

اور رستے سے نکالیں گے جنازہ اپنا دیکھ سکتے ہیں گلی میں تری کہرام کو ہم

نہ سکندر سے ہمیں کام ہے نے کچھ جم سے شوق آئینہ کو کہتے ہیں دعا جام کو ہم

کاش کہ خواب سے اِک پل نہ کھلی ہوتی آنکھ بوسہ دیتے تھے ترے عارضِ گلفام کو ہم

بہ بدی یاد کسی کو نہیں کرتے پیچھے روزِ اول سے برا سمجھیں ہیں اس کام کو ہم

دوستی سے جو کہو کچھ تو جواب اس کا نہیں ورنہ کھاویں نہ فلاطوں سے بھی الزام کو ہم

1۔ ل : ہوئی خبر 2۔ توتیا = وہ پتھر جس سے سرمہ بناتے ہیں۔ مراد سرمہ 3۔ ل سے اضافہ

مصحفی کامِ دل اپنا نہ بر آیا آخر
لے گئے ساتھ جہاں سے دلِ ناکام کو ہم

ن ☆

277

عکس فگن ہو جو وہ ماہِ فرنگ آب میں　　مردمِ آبی کریں رشک سے جنگ آب میں
بر لبِ دریا یہ کیوں آیا تھا ورزش کو جو　　لہریں گئی ہیں اڑا طرزِ شلنگ آب میں
کشتۂ نیرنگ کا کس کے ملا اس میں خوں　　ابر کے مانند ہیں سیکڑوں رنگ آب میں
گریہ میرے اشکِ گرم بحر کے اندر گریں　　ہوویں گے پشتِ پلنگ پشتِ نہنگ آب میں
وسعتِ [1] دریا کا تو اس میں نہیں کچھ گناہ　　ظرفِ تنک سے حباب اپنے ہے تنگ آب میں
رات مجھے کر کے قتل لاشے کو میرے وہ شوخ　　پھینک گیا جان کر آگ کا ننگ آب میں
اپنے جگر گوشے سے فائدہ ظالم کو کیا　　سبز نہ [2] پیکاں کے ہوں چوب خدنگ آب میں
جب وہ نہانے لگا گورا بدن اس کا دیکھ　　غرفے کے دل سے اٹھیں لاکھ امنگ آب میں
خط سے صفا یوں گئی اس رخِ پُر نور کی　　آئینے کے لاوے نقص جیسے کہ زنگ آب میں
ہو کے سبک کیوں مُوا کشتہ تیرا اس لیے　　اس کو ڈبوتے ہیں آپ باندھ کے سنگ آب میں
رو بہ ہوا ہے مدام طفلِ گلِ نیلوفر　　کس نے اسے لا دیا ڈور و پتنگ آب میں

اور بھی اک مصحفی لکھ غزلِ آبدار
تُو تو ہے آتش زباں کر نہ درنگ آب میں

☆ ل: آغاز ردیف حرف النون کہ در ردیف ہذا پنجاہ و نہ غزل است　　1۔ ل سے اضافہ

2۔ ل: سبزہ نہ بیکاں کے ہو

278

گریۂ خونیں سے ہے اور ہی رنگ آب میں　　کیوں نہ ہو سرخاب اسے دیکھ کے دنگ آب میں
لیلیٰ کا محمل سمجھ بُلبلے کو روحِ قیس　　جسم گو[1] ضفدع[2] میں ہے گرم شلنگ آب میں
نرم بدن ایسے کو کب ہے نہانا روا　　کھاوے حبابوں سے جو سینے پہ سنگ آب میں
چشمۂ شیریں جہاں ہو مرے گریے سے تلخ　　منھ کو نہ ڈالیں وہاں شیر و پلنگ آب میں
گھرے[3] میں ناداں نہ جا، مان کہا لطف کیا　　ناف سے گرداب پر عرصہ ہو تنگ آب میں
دشمنیِ بزم سے سخت ہوں مغلوب تر　　دیکھ لے کھا جاوے ہے لوہے کو زنگ آب میں
تیغِ تغافل کیا تو نے یہ کیسا سلوک　　ہے مرے مردے سے بھی ماہی کو ننگ آب میں
گر دلِ سوزاں کی شمع اس کے مقابل کروں　　جی کو چھپانے لگے گر کے پتنگ آب میں
عکس سے اس شوخ کے کہتا ہے یوں عکسِ ماہ　　جان میری آئی ہے تجھ سے بتنگ آب میں

لکھ کے غزل اور بھی مصحفی اک دل کشا
اہلِ قلم کو دکھا صنعِ فرنگ آب میں

279

لعلِ لبِ یار کا دیکھ کے رنگ آب میں　　موج کو پیدا ہوئی اور امنگ آب میں
اشکوں نے کس کے کیا کارِ خدنگ آب میں　　باندھے سپر کو کشف ہے جو بہ تنگ آب میں
کٹنے سے ساحل کے ہے اہلِ خرد پر عیاں　　موج چٹاتی ہے یاں تیغ کو سنگ آب میں
سردیِ ایام ہے اہلِ صفا کی عدو　　برف سے آجاتی ہے سختیِ سنگ آب میں
گیسوئے پُر پیچ نے اس کے بہ ہنگامِ غسل　　کھلتے ہی پیدا کیے لہروں کے ڈھنگ آب میں
قیس کہے تھا حباب اتنے نہ تھے خوش نما　　محملِ لیلیٰ کی کیا کھل پڑی زنگ[4] آب میں

1۔ ل :جسم میں　2۔ ل: ضفدع = مینڈک۔ ضغطہ = سختی۔ زیادہ قرین قیاس اسی طرح :جسم میں ضفدع کے ہے...... 3۔ ل سے اضافہ　4۔ زنگ = گھنٹی

ساعتِ مریخ واں ڈوبی تھی کشتی مری کیونکہ نہ گھڑیال پہ عرصہ ہو تنگ آب میں
یہ مژۂ خوں چکاں پنجۂ مرجاں کے ساتھ چاہیں تو جاویں ابھی کرنے کو جنگ آب میں
گریۂ عشاق ہے خصمِ تنِ کاغذیں کیونکہ سلامت رہے گر کے پتنگ آب میں
چشم کے بجرے میں جو بیٹھے وہ بت مصحفی
گریہ دکھاوے اسے سیرِ فرنگ آب میں

280

تماشے کی شکلیں عیاں[1] ہو گئی ہیں بہاریں بہت یاں خزاں ہو گئی ہیں
خبر پس رووں سے تم ان کی نہ پوچھو جو روحیں عدم کو رواں ہو گئی ہیں
نکالی ہیں جو ہم نے اوجِ سخن سے زمینیں وہ سب آسماں ہو گئی ہیں
انھیں فرض ہے تیر کا کس کے سجدہ جو میوے کی شاخیں کماں ہو گئی ہیں
وہ بت قطع کرتا ہے زلفوں کو شاید نزاکت پر اس کی گراں ہو گئی ہیں
تک اے باغباں رحم کر بلبلوں پر خزاں میں یہ بے آشیاں ہو گئی ہیں
میں رویا ہوں یاں تک جدائی میں تیری کہ آنکھیں مری ناوداں[2] ہو گئی ہیں
جدائی میں اس زلف کی مثلِ شانہ مری انگلیاں استخواں ہو گئی ہیں
رخ اس کا میں اے مصحفی کیوں کہ دیکھوں
نگاہیں مری بدگماں ہو گئی ہیں

281

پُتاوٹ واں ہیں چکن پر ہزاروں لگے ہیں زخم یاں تن پر ہزاروں
جگر سے قطرۂ خوں آ کے جم گئے مری پتلی کے روزن پر ہزاروں
لبِ شمشیرِ قاتل نے ہماری دیے ہیں بوسے گردن پر ہزاروں

1۔ ل : نہاں 2۔ ل : نابداں (نابداں = پرنالہ)

کبودی سے یہ کس لب کی ہے روکش — جو گل ہنستے ہیں سوسن پر ہزاروں
مگر چہلم ہے جو آئی ہیں حوریں — ترے کشتے کے مدفن پر ہزاروں
کسی نے اس کا منہ دیکھا نہیں صاف — لڑے مرتے ہیں چلمن پر ہزاروں
بہار آئی، اسیروں کے دھرے ہیں — قفس دیوارِ گلشن پر ہزاروں
ترے در پر بنے بیٹھے ہیں جوگی — بھبھوت اپنے ملے تن پر ہزاروں
معاذ اللہ صفِ مژگاں سے اس کی — چلے ہیں تیر ارجن پر ہزاروں
نہ سرفتراک سے باندھ اس کا بوسے — جو دیوے زیں کے دامن پر ہزاروں
مری خاطر کیے ہیں دوستوں نے — فسوں اس جی کے دشمن پر ہزاروں

غزل لکھ مصحفی اب وہ کہ ہوں محو
تری طرزِ نوشتن پر ہزاروں

282

موے اُس چمپئی تن[1] پر ہزاروں — لڑے سونے کے معدن پر ہزاروں
تمنا کشتۂ ہر ہر قدم ہیں — ترے ہمراہ رفتن پر ہزاروں
حسد سے نشترِ مژگاں کی تیرے — جگر ہیں نوک سوزن پر ہزاروں
کہیں[2] ہیں پھبتیاں اس گل نے جا کر — کلیسا میں برہمن پر ہزاروں
ستارے ٹکٹکی باندھے ہوئے ہیں — ترے غرفے کے روزن پر ہزاروں
عجب کیا گر بہ شوقِ تیغ قاتل — اُگیں سر میری گردن پر ہزاروں
دیے ہیں خامشی نے اپنی بخیے — لبِ فریاد و شیون پر ہزاروں
نگاہوں سے کسے مارا پڑی[3] ہیں — لہو کی دھاریں چلمن پر ہزاروں
حجابِ عشق سے آخر کیے چاک — میں خط لکھ لکھ کے دامن پر ہزاروں

1۔ ل : چنپہ تن 2۔ل : کہے ہیں 3۔ل،ب : پڑیں ہیں

کب آئے ہاتھ گو دل لوٹتے ہیں ترے موتی کے سمرن پر ہزاروں
ہوائی چھٹتیاں ہیں تیرے آگے رخِ مہتابِ روشن پر ہزاروں
مرے یہ دوست نے تیغیں لگائیں کہ آئے حرف دشمن پر ہزاروں
کوئی اے مصحفی ہوتے ہیں فیروز
کریں حملے تہمتن پر ہزاروں

283

اگر ہوں سر مرے تن پر ہزاروں میں کھاؤں زخم گردن پر ہزاروں
گئے جی اس کی چلمن پر ہزاروں موئے در پردہ دیدن پر ہزاروں
پسے دل اس کی چندن پر ہزاروں موئے رشکِ برہمن پر ہزاروں
ہوا یہ باغ کی بگڑی کہ صدمے ہوئے مرغانِ گلشن پر ہزاروں
بس اپنا آستیں منھ لے کے رہ گئی گرے جب اشک دامن پر ہزاروں
ہمارے چاک سینے کے بھی احساں رہے ہیں نوکِ سوزن پر ہزاروں
چڑھاتی ہے صبا نرگس کے دستے حیا کشتے کے مدفن پر ہزاروں
چمک پائی نہ عارض کی ترے گو گل آئے رنگ و روغن پر ہزاروں
ترحّم نے ترے طعنے کیے ہیں خصومت ہائے دشمن پر ہزاروں
سیہ بختی کے مضموں مصحفی میں
لکھے اوراقِ سوسن پر ہزاروں

284

تشنۂ شربتِ آبِ دمِ شمشیر ہوں میں خاطر آزردہ تر از نالۂ زنجیر ہوں میں
صفحہ کم صحن گلشن سے بھی تو میرا نہ سمجھ یعنی پروانۂ بیتاب کی تصویر ہوں میں
اہلِ ہیبت پہ ہے قوسین سے میرے پیدا دائرہ ہوں پہ دو جانب سے دو[1] شمشیر ہوں میں

1۔ ل : وہ شمشیر

دیر رہنے کا بھروسا نہیں اس کو میں مجھے صورتِ نقشِ قدم گرچہ زمیں گیر ہوں میں
یہ گنہ کم ہے کہ فرقت میں رہا ہوں جیتا کوئی منصف ہو تو ہاں قابلِ تعزیر ہوں میں
ہندسوں میں اسے لکھتا ہوں اگر خط گاہے نامہ کہتا ہے مرا روکشِ تحریر ہوں میں
کب بچا شاخِ درختاں سے کہ اس باغ کے بیچ جس طرف جاؤں ادھر صیدِ سرِ تیر ہوں میں
تا مرا سلسلہ مجنوں کے نسب کو پہنچے کاش کہ الفتِ خوباں میں جواں میر ہوں میں
دل جلاتا ہے مرا ضبط پری زادوں کا آہ کس تیرِ نگہِ ناز کا نخچیر ہوں میں
ذرۂ خاکِ درِ پیرِ مغاں بس ہے مجھے بوتۂ مہر سے کیا طالبِ اکسیر ہوں میں
مجھ سے تُو شعر جوانانہ کی درخواست نہ کر
مصحفی عہدِ جوانی گیا اب پیر ہوں میں

285

سودائے آرزوئے خط و خال کچھ نہیں دل سے لگائے رکھنا یہ جنجال کچھ نہیں
نظروں میں کھب رہا ہے جہاں چہرۂ عدم آئینۂ وجود کی تمثال کچھ نہیں
کہتا ہے کبک دیکھ تری شوخیِ خرام مجھ ناتواں کے ساتھ تو یہ چال کچھ نہیں
پڑھتا نہیں تو کھول کے کیوں اس کو میری جاں عاشق کا خط ہے نامۂ اعمال کچھ نہیں
اب ماجرا نہ گفتہ ہی بہتر ہے مصحفی
میں تجھ سے کیا کہوں کہ مرا حال کچھ نہیں

286

کیوں گریبانِ اجل اس غم سے پھٹ جاتا نہیں منہ مرا یارب کفن میں کیوں لپٹ جاتا نہیں
تیز کیوں ہوتی نہیں تیغِ جفائے روزگار کیوں سرِ شوریدہ بے تقصیر کٹ جاتا نہیں
طوق اور زنجیر کیوں ہے صورتِ گرداب و موج پھیل کر غصے کا دریا کیا سمٹ جاتا نہیں
بخت کی برگشتگی دیکھی ہے اکثر ہم نے لیک مردِ عاجز سے زمانہ یوں الٹ جاتا نہیں

داغ ہے اس کی درازی سے جگر مانندِ شمع کیوں یہ رشتہ عمر کا جل جل کے گھٹ جاتا نہیں

مصحفی تو مو سے لاغر تر نظر آیا مجھے
آدمی اتنا بھی مارے غم کے لٹ[1] جاتا نہیں

287

نہ نوحہ لکھوں نہ کوئی[2] مرثیہ کا بند کہوں دلِ ستم زدہ ہوں کیا میں دردمند کہوں

جب اس کے وصف میں اک مطلعِ بلند کہوں میں خالِ ابروے جاناں کو تب سپند کہوں

نہ پوچھ مجھ سے تو رہواریِ زمانِ وصال بجا ہے اس کو اگر عمر کا سمند کہوں

خدا مجھے عوض اس کے میں دے جو ہشت بہشت تو کیا مضائقہ اک میں بھی ہفت بند کہوں

خرابیاں مری چالوں سے مجھ پر آئیں آہ گلہ میں کس سے کروں کس کو دکھ دہند کہوں

وہ رخ[3] پہ لے کے جو جلباب[4] ایک دن سووے چھپا ہے ماہ تہِ نیلگوں پرند کہوں

شراب پیتے میں اے مصحفی جو وہ ہنس دے
تو کیوں نہ خندہ کو اس کے میں نوشِ خند کہوں

288

کیوں کر نہ مجھ کو چن دیں معمار تا بہ گردن عاشق کا خوش نما ہے مینار تا بہ گردن

محرومِ وصل ظاہر گو ہم رہے پر اپنا دستِ خیال پہنچا سو بار تا بہ گردن

جوں شمع پھر جلانا اس کے تئیں روا ہے جس سر بریدہ کا ہو زنار تا بہ گردن

ہم سایہ ہوں میں[5] اس کا یہ آرزو ہے میری ہو کاش درمیاں کے دیوار تا بہ گردن

گریے سے جو ہمارے پردے زمیں کے گل ہیں دلدل میں ہم پھنسے ہیں ناچار تا بہ گردن

جوں شمع وہ جو کانٹا پانو میں ممیں چھپایا[6] رہ طے ہوئی تو پہنچا وہ خار تا بہ گردن

1۔ لٹ جانا = کمزور ہو جانا، لاغر ہو جانا 2۔ بروزن فع 3۔ل سے اضافہ

4۔ جلباب = چادر 5۔ل : جو 6۔ل : پانو اپنے میں چھپایا

تلواریں اوچھیاں جو اس طفل کی لگی ہیں　　ہے عضو عضو اپنا خط دار تا بہ گردن
مشاطہ نے بنائی چوٹی تو وہ نہ پہنچی　　دندانِ شانہ لے کر زنہار تا بہ گردن
قاتل کی ہم جفا کا بے سر لکھیں گے نامہ　　باقی رہے گی اپنی رفتار تا بہ گردن
جب ننگ ذبح ہوں میں قاتل کی میرے کیوں کر　　آ آ کے پھر نہ جاوے تلوار تا بہ گردن
شورِ جنوں نہ ہووے جس سر میں اس کا خاکہ
ہے مصحفی بنے پر بیکار تا بہ گردن

289

صبا سے نکہتِ زلفِ پریشاں مول لیتے ہیں　　دلِ بیمار کا ہم اپنے درماں مول لیتے ہیں
خردمندی تو کرتے ہیں پریشاں[1] ہوویں گے آخر　　ترے ہمسائے گھر جو خانہ ویراں مول لیتے ہیں
مدد کرتی ہے گر قسمت جہاں سودائے یوسف ہے　　اسی بازار میں اک ہم بھی دوکاں مول لیتے ہیں
ہمیں ممنون ہو کر زیست کرنا خوش نہیں آتا　　جو بیچے خضر اس سے آبِ حیواں مول لیتے ہیں
زبس طالب ہیں نت[2] جنسِ نفیس بے نصیبی کے　　جہاں بکتی نظر آتی ہے حرماں مول لیتے ہیں
اگر دستِ جنوں کو ضعف ہوتا ہے کبھو لاحق　　قبائے گل سے ہم چاکِ گریباں مول لیتے ہیں
بہ سرعت اس قدر جانا کہاں منظور ہے ہم کو　　جواب ہم، کعبِ[3] گرگ پائے پیکاں مول لیتے ہیں
رہیں ہیں جن کے دیہے[4] گرم خاکستر سے گلخن کی　　قبا و شال کب فصلِ زمستاں مول لیتے ہیں
قبائے غنچہ نیم اندام تو ہے پر جو تو پہنے　　تری خاطر ہم اے سروِ خراماں مول لیتے ہیں
خموشی میں ہماری صرفۂ صیاد ہے، سچ ہے　　کہ اس کشور میں کم مرغ خوش الحاں مول لیتے ہیں
گئے ہیں بھول آزادی میں سب لذت اسیری کی　　جو تم بیچو تو ہم اے اہلِ زنداں مول لیتے ہیں
ہمیں ہے پاس کتنا ناقۂ لیلیٰ کی خاطر کا　　کہ کعبے جا کے صحرائے مغیلاں مول لیتے ہیں
ہواداری[5] ہمیں زخموں کی اپنے خوب آتی ہے　　ہوا سے سودۂ الماس پیکاں مول لیتے ہیں

1۔ ل : پشیماں ہوویں گے　　2۔ نت = ہمیشہ　　3۔ کعب = ٹخنہ　　4۔ دیہہ: بدن
5۔ چار شعر نسخہ لکھنؤ میں ندارد، پانچواں شعر آگے ہے۔

یہی ہے شوق سرمے کا ان آنکھوں کو تو اب ہم بھی — صفاہاں جا کے بازارِ صفاہاں مول لیتے ہیں
مجھے یہ جامۂ عریاں تنی بس ہے پس از مردن — کفن ناحق مری خاطر عزیزاں مول لیتے ہیں
وفورِ نغمہ سنجاں اس برس ہے بسکہ گلشن میں — قفس بھر بھر کے ہم مرغ خوش الحاں مول لیتے ہیں
ترے گیسو کا حلقہ ہاتھ میں تیرے مزیب[1] ہے — عبث ہم خاتمِ ملکِ سلیماں مول لیتے ہیں

غزل اک اور بھی لکھ مصحفی منظوم کو تیرے
سمجھ کر سلکِ گوہر سب سخنداں[2] مول لیتے ہیں

290

بہار آئی ہے اور گل، گل فروشاں مول لیتے ہیں — گلوں سے ان کے ہم چاکِ گریباں مول لیتے ہیں
ادا ہنسنے کی اس کے جن میں ہے گر باغباں بیچے — ہم اے یارو وہی گلہائے خنداں مول لیتے ہیں
کوئی بیع و شرائے عاشق و معشوق کیا سمجھے — نگاہِ شرم کو ہم جی میں پنہاں مول لیتے ہیں
مسلماں کو خدا کوچے میں خوباں کے نہ لے جاوے — کہ بے دام و درم یہ لوگ ایماں مول لیتے ہیں
سرابِ خشک میں کشتی ہماری جب نہیں چلتی — غبارِ دشت سے ناچار طوفاں مول لیتے ہیں
خراشِ نوکِ خامہ نے دیا ہے یہ مزہ دل کو — کہ ہر نقطے سے اس کے ہم نمکداں مول لیتے ہیں
عجب نافہم ہیں یہ ساکنانِ کشورِ ہستی — برائے یک دو دم جو قصر و ایواں مول لیتے ہیں

سنایا مصحفی نے مطلعِ ثانی[3] تو صاحبِ دل
لگے کہنے کہ ہم صاحب کا دیواں مول لیتے ہیں

291

لباسِ زیست کب تیرے شہیداں مول لیتے ہیں — کفن کو بیچ کر ہر جسمِ عریاں مول لیتے ہیں
حنائی پانو، اس کافر کا جس پتھر پہ پڑتا ہے — اسی پتھر سے ہم لعلِ بدخشاں مول لیتے ہیں
رخِ صبحِ وطن اک دن یہی ہم کو دکھاوے گی — سیہ بختی سے ہم شامِ غریباں مول لیتے ہیں

1۔ مزیب ہے = زیب دیتا ہے 2۔ل : بخنداں 3۔ل : مطلع ثالث (یہی درست)

نہیں برباد جاتی محنتِ دستِ جنوں ہر دم
ہمارے ہاتھ سے تارِ گریباں مول لیتے ہیں

ہوس رونے کی اپنے چشمِ گریاں کو نہیں ہوتی
جو سنگ بہہ کہیں مل جائے ارزاں مول لیتے ہیں

سرِ بازی ہے ہم کو اس گلِ اندام سیمیں سے
جو بیچے تو، یہ چوپڑا ے گلستاں مول لیتے ہیں

فضا کو اپنی آنکھیں سالہا ترسی ہیں اب ہم بھی
کئی بیگھے زمیں باغِ دبستاں مول لیتے ہیں

نہ ہووے روزِ محشر تا کہ بیمِ خوں بہا خوباں
بہ تیغِ سہل خونِ بے گناہاں مول لیتے ہیں

گہے گل توڑتے ہیں گہ ثمر ہم باغبانوں کے
ٹکے دو چار دے کر کیا گلستاں مول لیتے ہیں

بجائے اشک مژگاں پر انھوں نے دیکھے ہیں موتی
دیارِ عشق سے جو چشمِ گریاں مول لیتے ہیں

قیامت ہم بھی کتنے ہیں کہ بازارِ صباحت میں
متاعِ حسن جب ہوتی ہے ارزاں مول لیتے ہیں

درختِ گل کی جن شاخوں پہ تھیں امید کی کلیاں
انھیں شاخوں سے ہم گلہائے حرماں مول لیتے ہیں

جنھوں کے چت چڑھا ہے مصحفی نقشِ خیال اس کا
کوئی وہ کاغذِ تصویرِ خوباں مول لیتے ہیں

292

کس نے شب کھولے تھے موئے عنبر افشاں باغ میں
صبح تک تھی خاطرِ سنبل پریشاں باغ میں

دیکھ کر پھولوں میں باہم عالمِ صبحِ وداع
بن گیا سارا چمن یک چشمِ گریاں باغ میں

تو نہ آیا سیر کو اے شمعِ بزمِ حسن رات
عکسِ گل سے تھا لبِ جو پر چراغاں باغ میں

تجھ بن اپنی چشم میں تارے نہ تھے واں جلوہ گر
زخمِ گل[1] پرواں نگوں تھا اک نمکداں باغ میں

واشدِ خاطر نسیمِ وصل بن ممکن نہیں
دل گرفتہ کو ہے ہر ہر گام زنداں باغ میں

مجلس آرائے چمن تھا شب مگر وہ نازنیں[2]
صبح دم نم دیکھی ہیں سبزے کی مژگاں باغ میں

جب تو بہرِ سیر آتا ہے، ترا رخسار دیکھ
باغباں کو گل سے ہو جاتی ہے نسیاں باغ میں

سرو مائل ہی نہیں پا بوس کا مائل کہ ہے
بید تک پانو پہ اس کے جبہ سایاں باغ میں

1۔ ل : زخمِ ہر گل پر نگوں تھا 2۔ل : تازہ گل

تو نے کیا دستِ جنوں کی کی ہے شاگردی صبا　　ایک غنچہ کا نہیں ثابت گریباں باغ میں
مجھ کو صحرا ہی خوش آتا ہے سرک اے بوئے گل　　کیا کرے گا جا کے اب یہ خانہ ویراں باغ میں
میری کیا طاقت ہے جو نزدیک گلبن جا سکوں　　مجھ کو تو ہر شاخ گل ہے چوبِ درباں باغ میں
جب جدائی میں تری ہر غنچہ خوں پینے لگا　　گل نے شبنم سے جگر پر رکھے دنداں باغ میں
مصحفی آخر اسی سے، جا لڑی چشمِ سہیل
سیب تھا جو صورتِ سیبِ زنخداں باغ میں

293

ہنسا[1] میں خوب جا کر خندۂ گل پر گلستاں میں　　کہ چاکِ سینہ سے گل تھا مرے چاک گریباں میں
کوئی جرمِ قمر کو کاش بھوڈل کی طرح پیسے　　کہ اس کی آرزو ہے صرف ہو اس رخ کی افشاں میں
ملا نظروں میں دل یادِ ہجومِ چشمِ خوباں نے　　صبا کیوں لے گئی تھی مجھ کو کشتِ نرگستاں میں
مگر صرف تماشا ہو گئی ہے تیرے عارض کی　　نہیں ہے مردمک جو دیدۂ خورشیدِ تاباں میں
رفیقوں نے مرے مجھ ساتھ کیا اچھی رفاقت کی　　کہ ننگے پانو چھوڑا مجھ کو صحرائے مغیلاں میں
کمر باندھی ہے سوزِ دل نے یہ حبِّ رطوبت پر　　کہ آنسو آتے آتے جذب ہو جاتے ہیں مژگاں میں
جلے ہے دل کہ کاجل پائے یہ رتبہ، جو میں ہوتا　　سویدا دل کے کرتا صرف سب خالِ زنخداں میں
گئے آئے صبا کی طرح ہم سو بار گلشن سے　　کہاں کا گل کہ اک کانٹا نہ الجھا اپنے داماں میں
وہ صحرا طے کریں ہیں تیرے عاشق اپنے گھر بیٹھے　　کہ رستم پانو رکھ سکتا نہیں ہے جس کے میداں میں
خدا جانے ترے تیروں سے اس نے کیا مزہ پایا　　نگاہِ صید وقتِ ذبح بھی تھی آبِ پیکاں میں
نسیم صبح بارے اس طرف بھی ہوتی جاتا تو　　کہ مہمانِ اجل ہیں بے گنہ یاں کتنے زنداں میں
تصور سے نگاہِ قیس کیوں اعراض کرتی ہے　　فریبِ چشمِ لیلیٰ گر نہ تھا چشمِ غزالاں میں
صبا کس باغ میں لائی مجھے یہ کیا تلطف ہے　　جو بوئے امید کی آنے لگی گلہائے حرماں میں
جب آئی نوبتِ الطاف مجھ ناچیز زخمی پر　　نہ تھی اس وقت ہر گز گرد بھی باقی نمکداں میں

1۔ ل سے اضافہ

جو ہم بحرِ گماں سے بچ رہے تو دور کچھ جا کر　　گئی یہ عمر کی کشتی ہماری آبِ پیکاں میں
کوئی پروانہ شاید مر گیا فانوس سے باہر　　جو انگشتِ تأسف شمع کی اب تک ہے دنداں میں
سیہ بختی سے شاکی ہوں کہ اک شب خواب کا سرمہ　　دیا ہرگز نہ اس کافر نے جا کر چشمِ درباں میں
غزل یہ مصحفی ایسی کہی تو نے کہ پھبتا تھا
اگر تو اس کو پڑھتا جا کے خوبانِ صفاہاں میں

294

معشوق اس روش کے بہت کم جہاں میں ہیں　　شکوے ہزار تم سے دلِ بدگماں میں ہیں
نورِ چراغ گل سے نہ کیوں خوش ہو عندلیب　　خطِ شعاع خار و خس آشیاں میں ہیں
جس دم بنے گا کنجِ لحد اپنا خواب گاہ　　معلوم تب کریں گے ہم کس مکاں میں ہیں
مالک تو مانے تب کہ مرقعے کو کھولیے　　یوسف سے نقش سیکڑوں اپنی دوکاں میں ہیں
کھل جاویں تب وہ ہو جو ترے لب سے آشنا　　خونخواریاں ہزار نہاں برگِ پاں میں ہیں
واں غیر سے تُو بسترِ گل پر ہے ہم کنار　　اور یاں تپِ فراق سے کانٹے زباں میں ہیں
اے ہمرہانِ پیش قدم صبر کیجیو　　یعنی کئی ضعیف بھی اس کارواں میں ہیں
دیتے ہیں اک نگاہ میں مردے کو عمرِ خضر　　ایسے بھی لوگ کشورِ ہندستاں میں ہیں
زانو پہ سر دھرے ہوئے بیٹھے ہیں واہ واہ　　وارفتگانِ عشق بھی کیا گلستاں میں ہیں
تو بھاگتا پھرے گا کہاں اے ہمائے وصل　　صیّاد پیشہ فکرِ کمین و کماں میں ہیں
سامع کو دردِ سر جو نہ ہووے تو مصحفی
مضمون اور بھی کئی طبع رواں میں ہیں

295

محو آنکھیں حسنِ روئے خطِ مہ وشاں میں ہیں　　جلوے ہزار طرح کے یار و دخاں میں ہیں
آئی مگر بہار جو مرغانِ دانہ چیں　　مصروف فکرِ ساختنِ آشیاں میں ہیں

عاشق کا رنگ زرد جو دیکھے تو غور سے　یاں سیکڑوں بہار کے عالم خزاں میں ہیں
اغلب کہ حشر کو بھی نہ اٹھیں گے خواب سے　وہ کشتگانِ یاس کہ خوابِ گراں میں ہیں
ہوتا ہے مہ کو دیکھ کے کیوں چاک خود بخود　داخل یہ کس کے تار گریباں کتاں میں ہیں
غربال ہو گیا ہے مرا مغزِ استخواں　کیا کاوشیں رسا تری نوکِ سناں میں ہیں
حاصل ہوا ہے یہ تری مژگاں کے عشق سے　صد سوزنِ الم مرے ہر استخواں میں ہیں
جاتا ہے بامِ چرخ سے باہر تڑپ کے دل　یہ طاقتیں کسی کے بھی وہم و گماں میں ہیں
ہستی کے بیچ کس کو ملا حادثے سے چین　خوش ہیں وہ نیستی کے جو دارالاماں میں ہیں
تجھ سے ہی دل لگا ہو تو میں اس کو کیا کروں　گل گرچہ لاکھ رنگ کے اس گلستاں میں ہیں
اب بھی تصور اس کا نہ گر سرکشی کرے　بوسے کئی گرہ مرے کنجِ دہاں میں ہیں

دیکھے جو کوئی چشمِ حقیقت سے مصحفی
نقطہ ہمیں تو دائرہ آسماں میں ہیں

296

رکھتا ہے چرخ ہم کو جو مردودِ دوستاں　یوں ہی سہی ہے اس میں اگر سودِ دوستاں
پاتے نہ میری آتشِ بے غش میں تیرگی　ہوتا نہ اس میں گر اثرِ دودِ دوستاں
آتش کا کیا گناہ ہے ہنگامِ سوختن　خامی خروشِ شعلہ ہو جب عود دوستاں
یاران و صاحبان و عزیزانِ نکتہ سنج　نفریں ہے ہر محبت معہودِ[1] دوستاں
افسوس کی جگہ ہے کہ اس اعتقاد پر　کاہش جو میرے قدر کی مقصودِ دوستاں

دیکھو دمِ شنیدنِ اشعارِ مصحفی
تحسین خندۂ حسد آلودِ دوستاں

297

نالہ تو لب پہ رکھتے ہیں لیکن اثر کہاں　پتھر کو آب کر دے سو وہ چشمِ تر کہاں

1۔ معہود = عہد کیا گیا

کیا عمرِ بازگشت نے اس کی وفا نہ کی — نامے کو میرے لے کے گیا نامہ بر کہاں
مغرب میں اس کو جنگ ہے کیا جانے کس کے ساتھ — سورج چلا ہے باندھ کے تیغ و سپر کہاں
گل تکیے اس کے عارضِ رنگیں[1] کے بن سکیں — گو دور ہیں پہ رتبۂ شمس و قمر کہاں
یک بار برگِ گل کا جو منھ ہو گیا سپید — آنکھوں سے گر پڑے مرے لختِ جگر کہاں
کشتی مری سبک ہے بہت مثلِ برگِ گل — ہے اس کو تابِ لطمۂ[2] موجِ خطر کہاں
کچھ بامِ عرش دور رہا تھا کہ جھڑ پڑے — مجھ سے جدا ہوئے ہیں مرے بال و پر کہاں
ہر چند اُس کی ذات سے اِس کی نمود ہے — پاوے عروجِ شعلہ فروغِ شرر کہاں
دامن کی چین اس کے ہمیں ایک ایک کی جدا — اس پر ملی نہ مجھ کو، گئی وہ کمر کہاں
نرگس کو تیری چشم سے تشبیہ کیونکہ دوں — صورت تو چشم کی ہے و لیکن نظر کہاں
جکڑا میں کس لیے اسے زنجیرِ آہ میں — رکھا مری فغاں نے قدم عرش پر کہاں
ہر قطرے میں پڑے ہوں مرے جب ہزار عرش — وسعت کو پا سکے مری پھر بحر و بر کہاں
نے لختِ دل گرے کبھی مژگاں سے اور نہ اشک — اے نخلِ آہ تیرے کٹے برگ و بر کہاں
کہتے ہیں کچھ مکاں ہی نہیں عرش سے پرے — پیکِ خیال رکھے قدم پیشتر کہاں
میں نخل ہوں کنیر[3] کا باغِ زمانہ میں — گل مجھ سے سیکڑوں ہیں و لیکن ثمر کہاں

شیریں ہے گرچہ اس کی شمائل بھی مصحفی
شیریں کی لیک گات کو پاوے شکر کہاں

298

مرغ کباب دار رہی آگ پر کہاں — تو عندلیب بیضا[4] ہوئی سیخ پر کہاں
رگ رگ سے خوں رواں ہے مری اس سوا کچھ اور — کھلتا نہیں کسی پہ لگا نیشتر کہاں
پیری میں جان کیونکہ بچاؤں اجل سے میں — بچتا[5] ہے آستیں سے چراغِ سحر کہاں

1۔ ل : عارضِ نازک 2۔ لطمہ = تھپیڑا 3۔ کنیر = ایک پودا 4۔ بیضا = روشن
5۔ ل : بجھتا

نامے تو میں خیال میں لاکھوں رقم کیے
بر کس کے ہاتھ بھیجوں انھیں، نامہ بر کہاں

تکلیف دے سفر کی نہ تو ہم کو اے اجل
ہم اپنے پاس رکھتے ہیں زادِ سفر کہاں

ہر شاخ میری تیغ ہے ہر برگ ہے تبر
نشوونما کو پہنچے ہیں تیغ و تبر کہاں

اسلوب رکھ سکے ترے ابرو کی تیغ کا
لوہے میں ہے یہ قدرت شمشیر گر کہاں

ماتم ہے اور وضع کا نوحے میں ہجر کے
پہنچا یہ نوحہ تا بہ لبِ نوحہ گر کہاں

نسبت تو دیجیے رگِ گل سے ولے ہنوز
خوندار، بلبلاں کے[1] وہ موے کمر کہاں

اے باغباں نہ سبزۂ شبنم زدہ کو چھیڑ
لے جاوے اس چمن سے وہ مژگانِ تر کہاں

اڑتے ہوا میں، تیر لگا عندلیب کے
بیٹھی تھی بے نصیب ابھی شاخ پر کہاں

نکلا نہ بت کدے سے یہ بھولے بھی حیف ہے
کی مصحفی نے عمرِ گرامی بسر کہاں

299

اُس کو اِن روزوں گلستاں کی ہوا ساز نہیں
پر یہ مرغِ قفسی[2] قابلِ پرواز نہیں

کر نہ ان کو تو نگاہِ غلط انداز سے ذبح
قتل کرنے کا غریبوں کے یہ انداز نہیں

آشیانے سے جو نکلا وہ ہوا صیدِ[3] ستم
عرصۂ باغ بجز عرصۂ شہباز نہیں

تیرے پانو کے تلے پس گئے ہیں کیا کیا پھول
تجھ کو اتنی خبر اے سروِ سرافراز نہیں

حرف ہے واں کی پذیرائی پہ ورنہ یاں تو
جان و دل کون سی شب پیش کشِ ناز نہیں

دل پہ گزرے جو کچھ اپنے نہ کسی سے کہیے
قابل اس بات کے ہرگز کوئی ہم راز نہیں

آشیاں یاں سے اٹھالیویں گے اپنا کہ نسیم
یہ چمن مسکنِ مرغانِ خوش آواز نہیں

باغ میں خوں مری منقار سے ٹپکے ہے ہنوز
مجھ سا ہر مرغِ چمن زمزمہ پرواز نہیں

مصحفی آگے نہ تھی اتنی شبِ ہجر دراز
وہی یلدا[4] ہے ابھی صبح کا آغاز نہیں

1۔ ل :بلبلاں کے 2۔ل : پر مرغ قفسی 3۔ل : صیدِ نسیم 4۔ یلدا = تاریکی

300

صبح روشن ہو تو پھر شام غریباں مانگوں
ناؤ شُرطے[1] سے لگے چلنے تو طوفاں مانگوں

طلبِ کاوشِ ہر لحظہ ہے زخمِ دل کو
آشنا کون ہے کس سے[2] میں نمک داں مانگوں

فرصتِ عمر ہے کم وقفہ تر از خندۂ برق
اتنی وسعت پہ میں کیا ملکِ سلیماں مانگوں

سامنے میرے ہے وہ تنگ تر از دیدۂ مور
آہ اس زیست پہ پھر کیا سر و ساماں مانگوں

راحت و رنج کا گر مرتبہ سمجھوں تو مدام
طول عمر شب ظلماتی ہجراں مانگوں

گھپ اندھیرے میں رہوں وام[3] نہ ہم سائے سے
روغن از بحرِ چراغِ شبِ ہجراں مانگوں

آسماں وہ بھی نہ دے مجھ کو حسد سے میں اگر
خطِ شمشیر سے گردن پہ گریباں مانگوں

آشیاں دار جگہ مجھ کو بھی دو گلشن میں
اور کیا تم سے میں اے زمزمہ سنجاں مانگوں

رو بہ رو زاہد و عابد کے تو شرم آتی ہے
دل سے گر رخصتِ نظارۂ خوباں مانگوں

کام ہو جاوے مرا حسرت و حرماں میں اگر
پھر بھی مانگوں تو یہی حسرت و حرماں مانگوں

بخل ہے میری طرف سے یہ مزاج اس کے میں
آسماں دے نہ اگر مرگ کا ساماں مانگوں

وہ نہیں میں کہ جو تنگی سے مرا جی گھبرائے
واشدِ قفلِ درِ خانۂ زنداں مانگوں

مصحفی اتنا ہوں نظارۂ خوباں کا حریص
باغباں گل مجھے دیوے تو گلستاں مانگوں

301

وہ نہیں میں کہ گل و لالہ و ریحاں مانگوں
باغباں دیوے تو بستر کو مغیلاں مانگوں

مجھ سے عریاں تنِ مبہوت کو وہ بھی نہ ملے
سر پہ گر سایۂ دیوار سے داماں مانگوں

زخمِ شمشیر تغافل کی رہے عمر دراز
منھ نہ پھیرے وہ گر اس سے لبِ خنداں مانگوں

میں ہوں وہ نخل کہ گر ہو ہوسِ نشو مجھے
آبیاری کے لیے خنجر و پیکاں مانگوں

1۔ شرطہ = بادِ موافق 2۔ل : یاں کس سے 3۔ وام = قرض

مقتضی تنگِ طلب کی نہیں ہمت میری
تجھ سے عمرِ خضر اے چشمۂ حیواں مانگوں

ساتھ تلخی کے جواب اہلِ حسد دیں مجھ کو
زہر بھی ان سے اگر میں شبِ ہجراں مانگوں

تُو تو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے پھر میں کب تک
تیرے گھٹنے کی دعائیں شبِ ہجراں مانگوں

لب گزیدن کا بھی افسوس نہ مقدور رہا
عہدِ پیری میں بھلا کس سے میں دنداں مانگوں

اک عطا بوسے کی مل جائے تو پھر بعد اس کے
تجھ سے کیا کیا نہ میں اے خسروِ خوباں مانگوں

تم سے جو آبلے پانو کے مرے ٹوٹے ہیں
دے سکو گے میں اگر خارِ مغیلاں مانگوں

فکر سے کام ہے کیا مجھ کو میں ہوں سودائی
شبِ فرقت میں نہ زانو پہ زنخداں مانگوں

یار کے صدقے تو ہو لینے مجھے دیجیو تو
اتنی فرصت اگر اے گردشِ دوراں مانگوں

فارسی ہے یہ نہیں ریختہ نزدیک ہو گر
تم سے دادِ سخن اے اہلِ صفاہاں مانگوں

مصحفی دیدۂ آئینہ بنایا ہے مجھے
مجھ[1] کو حیرت نے، میں کس کام کو مژگاں مانگوں

302

کس کے ہاتھوں کی میں دیکھی ہے حنا عید کے دن
سیلِ خوں جو مری آنکھوں سے بہا عید کے دن

آج کچھ خوب نہیں دل میں کدورت رکھنی
سال کے روٹھوں میں ہو صلح و صفا عید کے دن

وصل ہوتے ہی جو دو چار گرے قطرۂ اشک
غسلِ صحت مری آنکھوں نے کیا عید کے دن

کاش وہ کھول کے زلفوں کو نہ نکلے ہوتے
ہو گیا میں تو گرفتارِ بلا عید کے دن

لب و دنداں سے جو اس شوخ کے پایا بوسہ
شیر و خرما[2] سے میں افطار کیا عید کے دن

شربتِ وصل کی تبرید مسیحا نے لکھی
کی یہ بیمارِ محبت کی دوا عید کے دن

ایک تجھ بن نہ گیا عاشقِ ناشاد کا غم
گرچہ ہر شاہ و گدا شاد ہوا عید کے دن

سوئے زندانِ اسیراں بھی تجھے آنا تھا
بخل کرنا تھا نہ اتنا بھی صبا عید کے دن

جامہ عریانی کا یاں بس[3] ہے اسیروں کے تئیں
چاہیے عید کا سامان نیا عید کے دن

1۔ل : میری حیرت نے 2۔ل : خرماں 3۔ل : بس یاں

استنے ہم تنگِ ملاقات عزیزاں تھے کہ آہ　اس کا خنجر بھی گلے سے نہ ملا عید کے دن
عید ذی الحجہ نہ تھی کیا غلط اس سے یہ ہوا　ہم کو مقتل میں جو لے آئی قضا عید کے دن
دوڑ کر ووں ہی گلے اس کو لگا لینا تھا　تم کو کرنی نہ تھی عاشق سے حیا عید کے دن
تو بھی اے شکوہ نہ رہ دل میں کہ کہتے ہیں یہ لوگ　درِ زندانِ اسیراں بھی کھلا عید کے دن
خار ہو کر یہ رطب تیرے نہ تالو میں چبھے　استخوانوں کو مرے کھا، نہ ہما عید کے دن
صبر کر تو بھی ٹک اے دل کہ شگونِ بد جان　مرضیٰ[1] کرتے ہیں موقوف دوا عید کے دن
روز عشرت اسے کہتے ہیں کہ ہر اک گھر سے　چنگ و مزمار کی آتی ہے صدا عید کے دن
وہ بھی موقوف کیا اب کے امیروں نے تو ہاے　گندمِ فطرہ کا معمول جو تھا عید کے دن
مثلِ گندم نہ ہو[2] کیوں سینۂ درویشاں چاک[3]　آویں جب گھر کو وہ بے برگ و نوا عید کے دن

مصحفی تھی مجھے ازبسکہ دُوئی سے نفرت
عید کا بھی نہ میں دوگانہ پڑھا عید کے دن

303

اک برگ گل بھی جس کی ہو منقار پر گراں　وہ بلبلِ سبک نہ ہو گلزار پر گراں
اللہ رے نازکی کہ بہ ایں قوّت و جلال　زلفوں کا سایہ ہے ترے رخسار پر گراں
نازک بدن ہے اتنا تو لڑکے کہ ہے مدام　طرّہ مقیش کا تری دستار پر گراں
کوچے میں اس کے جاکے گروں گا[4] میں تنگ خلق　سایہ ہے میرا سایۂ دیوار پر گراں
رفتار ہی گراں نہیں کچھ میرے پانو پر　ہیں پانو بھی مرے مری رفتار پر گراں
اٹھ جا کے کر لے اپنا ٹھکانا کہیں تو اور　اے نازکی نہ ہو کمرِ یار پر گراں
تو ہی خدا سے مانگ ٹک اس کی دعاے مرگ　جانِ نزار ہے ترے بیمار پر گراں
نازک کمر سے اپنی میاں تیغ کیں نہ باندھ　یعنی یہ بال ہے تری تلوار پر گراں

1۔ ل : مرض کی۔ (مرضی = مریض)　2۔ ل : ہوں　3۔ ل : بخاک　4۔ل :کروں کیا

ان منعموں سے مانگتے کچھ ہم، پہ کیا کریں   حرفِ سوال ہے لبِ اظہار پر گراں
صحرائے نیشتر سے میں خوش خوش چلا گیا   اک آبلے نے سر نہ کیا خار پر گراں
مجھ کو بنا کے صانعِ عالم ہوا خفیف   یہ وہ بنا ہے ہووے جو معمار پر گراں
بادِ صبا نہ پھول چڑھا اس کی خاک پر
اک برگِ گل ہے مصحفیِ زار پر گراں

304

کل تو تھیں نو آب[1] سے نکلیں یہ خس کی ٹٹیاں   آج کیوں کر ہوگئیں انجھا[2] برس کی ٹٹیاں
بندھ سکے یہ قافیہ کس طرح اہلِ بزم سے   بولتا ہے کون اردو میں مگس کی ٹٹیاں
جس نے باندھا وہ بھی ہے مشفق علیٰ ہٰذ القیاس   دوسرا ہے قافیہ بیت العنس[3] کی ٹٹیاں
واقعی دو تین ہیں ٹٹی جو ہیں بندش میں خوب   یک بیک مہندی کی اور ابرق کی خس کی ٹٹیاں
اور چراغاں کی جوانسے[4] کے بھی ہیں اسلوب دار   گر کوئی ان کو بنا دے پیش و پس کی ٹٹیاں
ہو سکے ہے ان سوا لائے ہیں ذو[5] صاحب جو باندھ   ہم پہ کچھ کھلتی نہیں جیسے قفس کی ٹٹیاں
شاعری یہ ہی ہے تو جی جس کا جو چاہے کہے   رنگ اس کے بوقبس[6] کی خاک پس[7] کی ٹٹیاں
یہ تو احوالِ زمانہ مصحفی تو نے کہا
اس میں با معنی تو کہہ جیسے کہ خس کی ٹٹیاں[8]

305

وہ جو گرما میں چھڑکواتے[9] ہیں خس کی ٹٹیاں   ہیں[10] وہ دھوکے کی سی ان اہلِ ہوس کی ٹٹیاں
نکلے پھر کس راہ سے بلبل کا یہ دودِ جگر   ٹٹیاں ابرق کی جب ہوویں قفس کی ٹٹیاں
بھیڑ کیوں مجرائیوں کی اس کے در پر ہے، مجھے   خوش نہیں آتی ہیں[11] اہلِ ملتمس کی ٹٹیاں

1۔ نواب/تواب؟   2۔انجھا = وقفہ؟ آبرو اور دیگر شعرا نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے مگر مطلب غیر واضح
2۔ل :خرم   3۔بیت العنس = لکڑی کا گھر   4۔جوانسا: ایک خودرو گھاس   5۔ل: در
6۔بوقبس = ایک پہاڑ   7۔ل : بھس   8۔ل: اس میں با معنی تو کچھ کہہ جیسے خس کی ٹٹیاں
9۔ ل : چھڑکواتے تھے   10۔ ل : تھیں   11۔ل : نہیں آتیں یہ

کیا مرے اشکوں نے ہی فالیز بوئی اب کے سال بن گئیں مژگاں جو یوں رودِ عرس[1] کی ٹٹیاں
ہم سے شیروں نے ڈڈو کا گر کبھی آ طیش میں جا لے مکڑی کے ہیں پھر یہ پیش و پس کی ٹٹیاں
اس مسی آلودہ لب کے غم میں ہم کرتے ہیں آہ کیوں بنفشے کی نہ ہوں دودِ نفس کی ٹٹیاں
چار دیوارِ عناصر ہے عفونت کی جگہ جوں کھڑی کی ہوویں کناسِ[2] اخس[3] کی ٹٹیاں

استعارہ کیجیے تو وہ بھی شیرینی کے ساتھ
مصحفی ہیں بے مزہ ورنہ مگس کی ٹٹیاں

306

تو دیکھ تو زمیں ہے کدھر، آسماں کہاں میں تیری جستجو میں پھرا ہوں کہاں کہاں
اتنے تو روزن اس میں نہ تھے پیش ازیں کبھو کیا جانے یہ فلک کے لگیں برچھیاں کہاں
تقدیر سے لڑوں ہوں، نہ تھے قابلِ ہما[4] ضائع کیے ہیں اس نے مرے استخواں کہاں
مت تیغ سخت تر کو میاں لے تو ہاتھ میں کاٹے گا خاک؟ تن میں مرے استخواں کہاں
میں اس چمن میں طائرِ رنگِ پریدہ ہوں پوچھے ہے کیا نشاں تو مرا آسماں کہاں
ملکِ عدم میں بھی نہ ملے مجھ کو رفتگاں کیا جانیے کہ ان کا گیا کارواں کہاں
یاران و دوستان و رفیقانِ نکتہ سنج سب مجھ سے خوش سخن ہیں ولے یہ زباں کہاں
کھلتے ہیں زیرِ بال میں بلبل کے صد چمن پاتی ہے اس بہار کو بادِ خزاں کہاں
جز ایک تن کے جا نہیں کنجِ مزار میں عصیاں کا لے چلا ہوں میں کوہِ گراں کہاں
یک شب جو عرش سے بھی میں آگے نکل گیا ق اس جستجو میں دیکھوں تو ہے لامکاں کہاں
ناگہ سروشِ غیب نے یہ دی مجھے ندا[5] آتا ہے یاں بھٹکتا[6] ہوا اے جواں کہاں
میں نے کہا میں خانۂ صانعِ خلق کو دنیا میں ڈھونڈتا نہ پھرا تھا کہاں کہاں
آخر پتا ملا تھا مجھے بر فرازِ عرش پر دل کہے تھا مجھ سے تو پہنچا وہاں کہاں

1۔ عرس = شیر مدہوش 2۔ کناس = خاکروب۔ 3۔ اخس = بے حد خسیس 4۔ ل : ہماں
5۔ ل : یہ مجھ کو دی ندا 6۔ ل : آتا ہے تو بھٹکتے یہاں

ہمت دلیل بن کے لے آئی تو ہے اگر — بتلا دے تو یہ بات ہے اس کا نشاں کہاں
جھنجھلا کے تب یہ اس نے کہا مجھ سے بے شعور — کیا لامکاں کو ڈھونڈے ہے، ہے لامکاں کہاں
جا ملکِ تن کی عالمِ ہستی میں سیر کر — تجھ کو وہیں ملے گا نشاں، یاں نشاں کہاں
میں نغمہ سنجِ شاخِ گلِ نو رسیدہ ہوں — مرغِ اسیر پاوے مری داستاں کہاں

موجِ نسیم نے اسے زنجیر کر لیا
اب یاں سے جائے مصحفیِ ناتواں کہاں

307

یوں ہوں میں تنگ گیریِ دستِ زمانے میں — جیسے رہے ہے ٹوٹ کوئی بال شانے میں
کس کو برا لگے ہے چمن آہ کیا کروں — رہنے نہ دے جو مالکِ باغ آشیانے میں
ہم بچ رہے مدد سے ستارے کی ورنہ رات — بھجوا چکی تھی زلف تری جیل خانے میں
عیسیٰ کی طرح اس کو نہیں احتیاجِ قُم — چاہے تو لاکھ مُردے جلا دے بہانے میں
مرغانِ باغ زمزمہ سنجِ کہن ہیں لیک — مرغِ قفس بھی سحر[1] کرے ہے ترانے میں
سرخی ہے میرے چشم کے آنسو سے یوں عیاں — جوں رنگِ گل جھلکتا ہے شبنم کے دانے میں
گل گوش بن رہے ہیں سب اے بلبلِ چمن — کیا جانے کیا فسوں ہے یہ تیرے فسانے میں

تھا خاک تودہ کس کے یہ تیروں کا مصحفی
سوراخ ہیں ہزاروں فلک کے نشانے میں

308

رہتے نہیں وہ مثلِ ہما آشیانے میں — جن کا مکاں ہے اوجِ فلک[2] پر زمانے میں
حور و قصور تم کو مبارک ہو شیخ جی — مردوں کو سخت تنگ رہے ہے[3] زمانے میں
ہے دل کا حرز[4] خطِ چلیپاے زلفِ یار — مارے نہ کوئی نرد کو چیرے کے خانے میں

1۔ اصل: سیر 2۔ل :اوج ہوا 3۔ل : ہے رہتا 4۔ حرز = تعویذ

موذی کے گھر میں رکھ نہ سکے پانو[1] بوالہوس ہووے گزر مگس کا نہ زنبور خانے میں
آخر وہ زلف ہووے گی زنجیرِ پائے دل یہ شانہ بیں کو کیا نظر آیا نہ شانے میں
پھر مجھ پہ آئی سوے فلک جا کے میری آہ رجعت کا تیر جوں نہیں لگتا نشانے میں
اپنے خدا سے مانگ تو جو چاہے مصحفی
نادان کیا کمی ہے فلک کے خزانے میں

309

خود پھنسے جا اس کی مژگانِ سراسر ناز میں آشیاں ہم نے بنایا چنگلِ شہباز میں
زخمِ دل کو دیکھ کر میرے یہ بھاگا وہ کہ پھر حقۂ مرہم نہ دیکھا دستِ مرہم ساز میں
گر یہی ہے اس لبِ شیریں کی جاں بخشی مسیح فرق کیا باقی رہا پھر سحر اور اعجاز میں
دیر مانی نے لگائی اس لیے یعنی ہنوز سوچ ہے اس کو تری تصویر کی پرواز میں
وصل کی شب سنتے ہی ہم بسکہ بسمل[2] ہو گئے فعلِ خنجر تھا خروسِ صبح کی آواز میں
کوتہی پر چرخِ گرداں کی تامل کیجیو سیخ پر رکھا ہے ہم کو موسمِ پرواز میں
حسن نے اس کے نہ چھوڑا زندہ اک صاحب نظر کچھ موے انجام میں کچھ کھپ گئے آغاز میں
مصحفی تو جاں بلب ہے کچھ تو کہہ اے بے شعور[3]
اس قدر رکھنا مناسب کیا ہے ضبطِ راز میں

310

شوخیاں انداز میں، محبوبیاں ہیں ناز میں حشر اک برپا ہے اس کے ناز اور انداز میں
عکس کو اپنے رجھایا ایک ہی دو ناز میں ہیں غضب جادو بھرے اس چشمِ سحر انداز میں
نامہ اس کو کس طرح پہنچے کبوتر اک طرف کاغذِ بادی بھی واں آتا نہیں پرواز میں
دیکھیے انجام میں کوئی بچے گا یا نہیں ناگنی سیلی کی سو دل ڈس گئی آغاز میں

1۔ ل : رکھ سکے کب پانو 2۔ ل : نیم بسمل 3۔ل : اب تو کچھ کہہ بے شعور

یہ بلا سر پہ مرے لائی تری زلفِ سیاہ — دل پھنسانا کس کو یوں آیا کمندِ ناز میں
بھینا بھینا رنگ اس کا اور وہ مکھڑا دلفریب — ہائے یہ عالم ہے کس تصویر کے انداز[1] میں
مرغ گرتے ہیں ہوا سے کیا بیاں اس کا کروں — آہ جو چھل بل ہیں اُس تُرکِ شکار انداز میں

عمر نے فرصت اگر دی مصحفی تو یہ غزل
قبرِ سعدی پر پڑھوں گا جا کے میں شیراز میں

311

گو نہ ہو مہر کی جا تیرے دلِ کافر میں — عشق وہ شے ہے کہ تاثیر کرے پتھر میں
یک طرف تیغ کہ نشتر کی زباں ہو رنگیں — خون اتنا بھی نہیں میرے تنِ لاغر میں
کیا کہوں پھونک دیا آہ نے خس خانہ مرا — گرمیِ دود سے یاں آگ لگی چھپّر میں
بادہ نوشی کا ہماری نہ کوئی پوچھو رنگ — خونِ صد آرزوے کشتہ ہے یاں ساغر میں
سرکشی پر یہ نہ آویں تو بچے جی ورنہ — تار سب خارِ مغیلاں ہیں مرے بستر میں
میں تو منھ پیٹنے[2] لگتا ہوں مرے آگے سے — نکلے ہے منھ کو لپیٹے جو کوئی چادر میں
روح سیراب کسی تشنہ جگر[3] کی ہووے — آب اتنا بھی نہیں تیرے دمِ خنجر میں
نتھ کے موتی ترے اتنے تو نہ تھے سرخ صنم — خون کس کشتے کا چھلکے ہے ہر اک گوہر میں

مصحفی دشت کو چل فصلِ بہار آئی ہے
اِن دنوں شورِ جنوں رہنے نہ دے گا گھر میں

312

اٹھوں گا روزِ حشر یہ کہتا زمیں سے میں — مرقد میں جل گیا نفسِ آتشیں سے میں
اتنا تو بے لحاظ نہیں صنع[4] کا مزاج — جاتا ہوں بوجھ یار کی چینِ جبیں سے میں
اے کاش روزِ حشر وہی مجھ سے ہو دوچار — مارا پڑا ہوں جس نگہِ سُرمگیں سے میں

1۔ ل : کی پرواز میں 2۔ل : دیکھنے 3۔ل : کشتہ جگر 4۔ل : منع (دونوں طرح مفہوم واضح نہیں ہوتا)۔

ازبسکہ دردِ رشک نے رخصت نہ دی مجھے احوال اپنا کہہ نہ سکا ہم نشیں سے میں
مجھ کو دیا ہے تیرے تئیں[1] اور اس سوا مانگوں[2] گا کیا خداے جہاں آفریں سے میں
خاکی تو ہوں ولیک یہ ہے مرتبہ مرا جوں نالہ پار جاؤں ہوں عرشِ بریں سے میں
اک شب کیا نہ اس کو اجابت کا ہم کنار شرمندہ ہوں بہت رخِ آہِ حزیں سے میں
جاتی رہی ہے عقل مری[3] مجھ کو کیا ہوا آنسو کو تولتا ہوں جو دُرِ ثمیں[4] سے میں
یارب وہ دن بھی آوے کہ آوے وہ شہسوار جھاڑوں غبار دامن زیں آستیں سے میں

یار اس پہ آفریں نہ کہیں تو بھی مصحفی
مضموں کوئی جو ڈھونڈ کے لاؤں کہیں سے میں

313

ہم ریختہ کو خیلے محبوب کر چکے ہیں تالیف کا سخن کے فن خوب کر چکے ہیں
پائے پہ یہ تمنچہ ہم نے چڑھا دیا ہے سب بانک پن سلف کا معیوب کر چکے ہیں
ہے وہ جو طرزِ اعلیٰ اردو کی اس زباں[5] میں اپنی طرف ہم اس کو منسوب کر چکے ہیں
دیوان کا ہے اپنے ہر نقطہ خال یوسف چشم پری کو اس کا یعقوب کر چکے ہیں

حرص غزل نہیں اب ایسی تو مصحفی کچھ
مضموں بہ از سلف ہم مکتوب کر چکے ہیں

314

سوے نجد حی کا وہ قافلہ عجب اِس کا کیا جو چلا نہیں
کہ ہواے شدتِ برف ہے ابھی قافلے کی ہوا نہیں

رہے اس کے ہاتھ میں دیر کیوں مجھے آرسی سے گلہ نہیں
اسے اس کی آنکھ ہی کہتی ہے نظر ایسے رخ سے پھرا نہیں

1۔ ل : میرے 2۔ل : مانگو 3۔ل :مگر مجھ کو کیا ہوا 4۔ درِ ثمیں = قیمتی موتی
5۔ل : زمیں

تو چمن کا حسن کے ہے شجر سرِ پا پہ اپنے تو کر نظر
کئی برگ گل ہیں جمے ہوئے یہ حنائے ناخنِ پا نہیں

وہ درختِ برق رسیدہ ہوں نہیں لگتے جس میں گل[1] و ثمر
وہ نہالِ یاس دمیدہ ہوں جسے آرزوے صبا نہیں

کوئی شکوہ لیلیٰ سے کیا کرے یہ ستم ہے گردشِ چرخ کا
کہ خرامِ ناقۂ تند کو سرِ قیس آبلہ پا نہیں

ہمیں کب چمن کی ہے آرزو نہیں اتنے کشتۂ رنگ و بو
جو دلِ شگفتہ ہو روبرو تو قفس بھی تنگ فضا نہیں

میں جفائیں جھیلی ہیں سیکڑوں ترے عشق میں بد و نیک کی
پہ ہزار شکر کہ آج تک گلہ گرد لب کے پھرا نہیں

حذر اس کو کہتے ہیں دوستاں مجھے قتل کر کے وہ نوجواں
ہوا جس طرف کو قدم زناں مرا خوں اُدھر کو بہا نہیں

گئے سیکڑوں ہی کے اس سے جی اسے ساتھ کس کے ہے آشتی
جو بغور دیکھے تو مصحفی، ستمِ زمانہ نیا نہیں

315

ابھی اپنے مرتبہ[2] حسن سے میاں باخبر تُو ہوا نہیں
کہ غزل سرا ترے باغ میں کوئی مرغِ تازہ نوا نہیں

جو گلی میں یار کی جاؤں ہوں تو اجل کہے ہے یہ رحم کھا
تو ستم رسیدہ نہ جا اُدھر کوئی زندہ واں سے پھرا نہیں

وہ غریب و بے کس و زار تھا تجھے اس کا دیتا ہوں میں پتا
ترے کشتہ کا وہ مزار تھا کہ چراغ جس میں جلا نہیں

1۔ ل : گل اور ثمر 2۔ ل : رتبہ حسن

جو حکیم پاس میں جاؤں ہوں تو وہ دوستی سے سنائے ہے
تو معاش کی بھی تلاش کر یہ مقامِ فقر و فنا نہیں

مجھے عشق رکھتا ہے سرنگوں مرا حال پوچھو نہ کیا کہوں
میں حبابِ بحر کا شیشہ ہوں مرے ٹوٹنے کی[1] صدا نہیں

ترے خاکساروں[2] نے اپنا سر نہیں پیٹا دشت میں اس قدر
کہ بگولہ[3] واں سے غبار کا طرف آسماں کے گیا نہیں

نہ نسیمِ باغ و بہار ہوں نہ فدائے روئے نگار ہوں
میں غریبِ شہر و دیار ہوں مری دیر و کعبہ میں جا نہیں

ترے نخلِ حسن کی کونپلیں ابھی ناشگفتہ ہیں[4] اے پری
جو نسیم آئی[5] ہے اس نے بھی انھیں کچھ سمجھ کے چھوا نہیں

ترے گیسوؤں میں جو جاتی ہے تو مرا ہی حال کہہ آتی ہے
مری خصمِ جاں بھی تو اس قدر یہ نسیمِ نافہ کشا نہیں

نہ میں رہنے والا ہوں باغ کا نہ صفیر سنج ہوں راغ کا
مجھے ڈھونڈے ہے سو وہ کس[6] جگہ کہیں آشیان ہما نہیں

کوئی زخم خوردہ ہے خار کا کوئی خوں طپیدہ بہار کا
ہے مرا ہی حوصلہ مصحفی کہ کسی سے مجھ کو گلا نہیں

316

یا پھول سے کرتے تھے شگوں دست و گریباں یا ہیں بہ تہِ داغِ جنوں دست و گریباں
چہرہ کبھی نوچا تو کبھی سینہ بہ ناخن ہیں شاہدِ بیرون و دروں دست و گریباں
جینا تو خوش آتا نہیں بن یار مجھے بھی اے کاش اجل ہی سے میں ہوں دست و گریباں

1۔ ل : میں 2۔ل : خاکسار 3۔ ل : تنورا (= آگ) 4۔ ل : ہے
5۔ ل : آئی تھی 6۔ ل : کوئی سو کسی جگہ

جب تیغِ تغافل سے مجھے ذبح کیا تھا　　حسرت تھی بہر قطرۂ خوں دست و گریباں
گھونٹیں ہیں گلا میرا کہ نالہ نہ کروں میں　　اتنا مجھے سمجھیں ہیں زبوں دست و گریباں
نے ہاتھ مرا ہاتھ ہے نے جیب مرا جیب　　کیا دست و گریباں کو کہوں دست و گریباں
سودے میں مرے ہیں سب اطبا متامل　　رکھتے ہیں وہ صد سر کو نگوں دست و گریباں
اے مصحفی کیا فصلِ بہار آئی جو پھر ہیں
سودے کی طرف راہ نمو دست و گریباں

317

ہیں باعثِ اخلاص فزوں دست و گریباں　　لگ چلتے ہیں ایامِ جنوں دست و گریباں
دامن کوئی جھپکے ہے مری آتشِ دل پر　　کیا تم سے ہو کم سوزِ دروں دست و گریباں
مارا ہے جو پتھر ترے دیوانے نے سر پر　　اس سنگ سے ہے بوقلموں دست و گریباں
انگشت ہیں چھریاں سی تو وہ صورتِ شمشیر　　ازبس ہیں مرے تشنۂ خوں دست و گریباں
دیوانہ بنا دیتے ہیں کیوں سینہ زنی میں　　کرتے ہیں یہ کیا سحر فسوں دست و گریباں
جلتا[1] ہے کبھی دل تو کبھی سینہ پھنکے ہے　　اک آگ کے شعلے میں ہوں دست و گریباں
آتا ہے یہ اب جی میں کہ اردو کی زباں سے　　اک فارسی مقطع میں پڑھوں دست و گریباں
وے مصحفیِ خستہ ہم آغوشِ پری بود
با وحشت و سودا ست کنوں دست و گریباں

318

وحشت ہے مری سب سے فزوں دست و گریباں　　کم ہو نہ مرا جوشِ جنوں دست و گریباں
خجلت سے رہے اپنے نگوں دست و گریباں　　کس دن ہوئے شایانِ جنوں دست و گریباں
سو شعبدے نکلیں ہیں مری جنبشِ لب میں　　ہے معجز[2] عیسیٰ بہ فسوں دست و گریباں

1۔ ل سے اضافہ　　2۔ اصل اور دیگر نسخوں میں: معجزہ

ملتی ہی نہیں اس کے تصور سے رہائی — کس دشمنِ جانی سے میں ہوں دست وگریباں
اے دودِ جگر مجھ کو کہیں آگ لگا دے
کب تک میں تفِ دل سے رہوں دست وگریباں

319

ڈوبوں پانی میں نہ میں آگ میں جل جاتا ہوں — جو ہُوا دام سے دونوں کے نکل جاتا ہوں
گو مرض صعب[1] ہو مرجانے کا غم کوئی نہیں[2] — زندگی ہے تو کوئی دن کو سنبھل جاتا ہوں
اژدہائے شبِ یلدا نے کہا وصل کی شب — غم نہ کھا آج میں سورج کو نگل جاتا ہوں
وادیِ[3] نجد میں گوگل کا نہیں نام ولے — پانو ناتے کا کہے ہے میں پھسل جاتا ہوں
اس بیاباں میں کہ ہر گام پہ ہے چشمۂ خضر — تشنہ دوڑا ہوا دنبالِ اجل جاتا ہوں
مثلِ پروانہ میں پھرتا صفِ آتش سے نہیں — روغنِ مرگ بدن[4] اپنے پہ مل جاتا ہوں
شوخیِ حسن کے نظارے کی طاقت ہے کہاں — طفلِ ناداں ہوں میں بجلی سے دہل جاتا ہوں
مادرِ دہر اٹھاتی ہے جو ہر دم مرے ناز — اس کے دامن پہ میں طفلانہ مچل جاتا ہوں
مصحفی غیر سے وہ کرنے لگیں ہیں باتیں
ایک دم کو بھی جو میں نظروں سے ٹل جاتا ہوں

320

شبِ ہجراں کی جو آمد سے دہل جاتا ہوں — جب وہ آتی ہے تو میں گھر سے نکل جاتا ہوں
گرمیِ غیر کی جوں شمع نہیں مجھ کو تلاش[5] — ژالہ ہوں برف ہوں میں آپ پگھل جاتا ہوں
میں نے ترکیب اُبٹنے کی نکالی ہے نئی — اشکِ رنگیں کو ترے مکھڑے پہ[6] مل جاتا ہوں
ضعف سے تابشِ خورشید کے کب ہے مجھے تاب — شب کو میں پرتوِ مہتاب[7] میں جل جاتا ہوں

1۔ صعب = سخت 2۔ل : غم مجھ کو نہیں 3۔ ل سے اضافہ 4۔ل : میں تن اپنے پہ
5۔ل : مجھے کب ہے تلاش 6۔ل : سے 7۔ل : سایۂ مہتاب سے

باندھ کب سکتے ہیں زنجیروں میں مجھ کو احباب　مثلِ سیماب میں[1] ہاتھوں سے نکل جاتا ہوں
بخت لائے تو ہیں کوچے میں مجھے خوباں کے　در کوئی دیکھ کے اچھا میں نکل جاتا ہوں
دل کی طاقت کا میں کیوں کر نہ کروں شکر ادا　پانو لغزش بھی جو کرتے ہیں سنبھل جاتا ہوں
تحفۂ جاں کے سوا اور مرے پاس ہے کیا　پیش کش لے کے یہی سوئے اجل جاتا ہوں
مصحفی رازِ حقیقت سے خبر ہے مجھ کو
بزمِ ہستی سے پے[2] رفعِ خلل جاتا ہوں

321

بیٹھے بیٹھے جو میں کم ظرف اُبل جاتا ہوں　حرفِ بے جا کی طرح منھ سے نکل جاتا ہوں
کم ہے عشرت مری ہوں وصل کا روزِ کوتاہ　چاشت ہونے نہیں پاتی ہے کہ ڈھل جاتا ہوں
ہوں وہ برگِ گُلِ پژمردہ کہ گرتے گرتے　دست گیری سے صبا کی میں سنبھل جاتا ہوں
ہونے لگتی ہے جو دنیا کی ہوا[3] دامن گیر　برق کی طرح زمانے سے اچھل جاتا ہوں
سوزِ غم میں مجھے جلنے کی زبس تاب نہیں　جوں سپندِ سرِ آتش میں اچھل جاتا ہوں
تومنِ عمر کے مانند میں جاتے جاتے　سبزۂ عیش کو اپنے ہی کندھل[4] جاتا ہوں
ہوں وہ ترسیدۂ دشمن کہ شبِ وصل میں آہ　جنبشِ پائے ہوا سے بھی دہل جاتا ہوں
مصحفی مے کدۂ دہر سے بادیدۂ ترق ساتگیں[5] بر کف و مینا بہ بغل جاتا ہوں
دیکھیے کیا ہو مآل اس کا کہ میں مست و خراب[6]
ساتھ اپنے لیے یہ جنسِ عمل جاتا ہوں

322

کچھ کلک کی نہیں[7] تحریر ہے پانو اس کے میں　خونِ عشاق زمیں گیر ہے پانو اس کے میں
رکھیے سینے پہ تو ہو جاوے خنک آتشِ دل　میں نے دیکھا ہے یہ تاثیر ہے پانو اس کے میں

1۔ ل: اچھا سا　2۔ اصل: لیے، ل و ب = کیے (قیاسی تصحیح)　3۔ ل: ہوس
4۔ کندھلنا = روندنا　5۔ ساتگیں = ساغر　6۔ل: مست شراب　7۔ ل: نہ یہ

بسکہ بیٹھی تھی رخِ گل پہ چمن میں بلبل اسی تقصیر سے زنجیر ہے پانو اس کے میں
کیوں نہ دیوانہ ترا قطع رہِ عشق کرے جوہرِ برّشِ شمشیر ہے پانو اس کے میں
ہیں جو دیوانے کے کانٹوں سے مشبّک تلوے جلوہ گر صورتِ کفگیر ہے پانو اس کے میں
باج دیتی ہے اسے پاشنہ خانم (؟) آ کر شہرِصورت[1] کی بھی تسخیر ہے پانو اس کے میں

مصحفی رنگِ حنائی نے دکھائی ہے بہار
ان دنوں عالمِ تصویر ہے پانو اس کے میں

323

کیا خاک در سے تیرے رختِ سفر اٹھاؤں اتنی نہیں ہے طاقت بالیں سے سر اٹھاؤں
ہمرہ ترے چلا ہوں میں ناتواں ولیکن پانو اپنے جلد کیوں کر اے نامہ بر اٹھاؤں
اس باغ میں تو گویا سب فرش ہے پروں کا کس کس چمن سے یارب بلبل کے پر اٹھاؤں
سیری کسی طرح سے ہوتی نہیں ہے میری تصویر سے میں اس کی کیوں کر نظر اٹھاؤں
کم بخت باغباں کی رخصت نہیں ہے اتنی اک برگِ گل چمن سے بادِ سحر اٹھاؤں
سیلِ بلا فلک سے جس جا ہو روز نازل برسات کے دنوں میں واں کیونکے گھر اٹھاؤں

اب مصحفی بدن میں طاقت وہ کب رہی ہے
جو نوکری کی خاطر تیغ و سپر اٹھاؤں

324

اے مرگ جلد آ کہ شتابی رواں ہوں میں بھاری ہوں آسماں پہ زمیں پر گراں ہوں میں
سمجھے ہے کون رتبۂ پرواز کو مرے باغِ جہاں میں طائرِ عرش آشیاں ہوں میں
عنقا ہزار کوس پرے مجھ سے رہ گیا واں پانو کوئی رکھ نہیں سکتا جہاں ہوں میں
اے ہمرہاں مجھے بھی ذرا تم نباہ لو واماندہ مثلِ گردِ پسِ کارواں ہوں میں

1۔ ل : شہرت سور

بلبل کے چہچہوں نے تو دم بند کر دیا　طاقت نہیں ہے اتنی کہ گرمِ فغاں ہوں میں
اپنا تو دشتِ عشق میں پڑتا نہیں قدم　اے برق تو چلے تو ترا ہم عناں ہوں میں
بستر کو ڈھونڈتے ہیں مرے آ کے میرے دوست　ہوں تو مریضِ عشق ولیکن کہاں ہوں میں
صیدِ زبوں سمجھ مجھے قاتل سے وقتِ ذبح　خنجر کہے ہے اس کے گلے پر رواں ہوں میں
لکھ اس زمیں میں اور غزل[1] ایک مصحفی
تا سن کے اس کو کچھ تو[2] بھلا شادماں ہوں میں

325

ساتھی سبھی ہیں تیز قدم، ناتواں ہوں میں　یعنی وبالِ ہمرہی ہم رہاں ہوں میں
اے گرد باد خاک کو میری اڑا بھی دے　بس کب تلک غبارِ رہِ دوستاں ہوں میں
خط نزع میں دیا ہے اسے دور کچھ نہیں　قاصد سے پیشتر دو قدم گر رواں ہوں میں
آیا ادھر سے اور ادھر سے چلا گیا　اس گلستاں میں ہم تکِ بادِ رواں[3] ہوں میں
اے باغباں نہ باغ سے میرے تئیں نکال　جاؤں کدھر کہ مرغِ کہن آشیاں ہوں میں
آتا ہے سنگِ تفرقہ ہر دم مجھی پر آہ　تیرِ جفائے چرخ کا گویا نشاں ہوں میں
پامالیِ فلک سے مجھے بیم کچھ نہیں　کس واسطے کہ سبزۂ باغ جہاں ہوں میں
دم میں شبِ وصال کو کر دے ہے میری صبح　پر شکوہ مندِ کجِ روِیِ آسماں ہوں میں
مجھ سے اسیر کوئی نہیں تنگِ زندگی　صیاد کا وبال، قفس کا زیاں ہوں میں
درپے ہے کس کے حسن کا جاسوس مصحفی
مثلِ نگہ جو چشم سے اپنی نہاں ہوں میں

326

ابرو[4] نے لیا ہے اسے شمشیر زنی میں　مژگاں سے دلِ خستہ ہے برچھی کی انی میں

1۔ ل :ایک غزل اور　2۔ل : اور　3۔ل : بادوزاں　4۔ ل میں ندارد

شوخی کی تری چشم کو ہیں یاد جو گھاتیں چھل بل نہیں دیکھی یہ غزالِ ختنی میں
گو یمنی ہے پرچاہے ہے کب عشق کی غیرت ہو نام ترا کندہ عقیقِ یمنی میں
مجھ کو ہی تامل نہیں جب کھینچے ہے نقشا مانی بھی تو سوچے ہے تری بے دہنی میں
میدان کے میدان ہی ستھراؤ پڑے ہیں صرفہ نہیں اس تیغ کو کچھ سر فگنی میں
حسرت یہ مجھے آئے ہے ان لوگوں کی رونا جو گھر سے نکل کر کے موے بے وطنی میں
ظاہر ہوئی عاشق پہ ترے مایۂ خوبی خوبی لبِ خنداں کی ترے خندہ زنی میں
کتنوں کے تئیں قتل کیا باتیں بنا کر کتنوں کے تئیں مار رکھا کم سخنی میں

اے مصحفی اک تازہ غزل اور بھی لکھ جا
ہے شہرۂ آفاق تو شیریں سخنی میں

327

مصروف[1] ستارے رہے سب سنگ زنی میں کی کب شبِ ہجراں نے کمی دل شکنی میں
مانندِ حبابِ لبِ جُو جسم کہاں ہے اک روح ہے تو جامۂ نازک بدنی میں
صدمے شب ہجراں کے اٹھائیں گے اسی طرح جب رات کٹی نعرۂ اللہ غنی میں
کھولا تھا کل اس شوخ نے کیا بالوں کا جُوڑا بو مشک کی آتی ہے نسیمِ ختنی میں
کھائی تو شبِ ہجر و لے تیزیِ خوں سے سوراخ کئی پڑ گئے ہیرے کی کنی میں
جس طرح چمکتا ہے ترے کان کا موتی یہ روشنی دیکھی نہ سہیلِ یمنی میں
شیریں کے مزے خسروِ پرویز نے لوٹے فرہاد کو مصروف رکھا کوہ کنی میں
افشاں نظر آتا ہے مجھے دامنِ قاتل چھینٹے ہیں جو لوہو کے پڑے تیغ زنی میں
جس دن کہ صبا لے گئی اس زلف کی نکہت خوں تازہ ہوا نافۂ مشکِ ختنی میں
شاید کہ گیا باغ سے تو سروِ خراماں وہ چہل نہیں خندۂ کبکِ چمنی میں

1۔ ل میں ندارد

معشوق جو مل جائے تو ہے یہ بھی غنیمت — اک اور گھڑی گزرے اگر ہم سخنی میں

واں ہاتھ نہ پہنچا، نہیں سازندہ لگاتا — سورج کی کرن کو ترے جوتے کی انی میں

اے مصحفی ناحق ہے یہ اسبابِ تعلق

آزاد کی نبھ جاتی ہے دو گز کفنی میں

328

گر شکوۂ ستم گریِ آسماں کروں — تا روز حشر بس یہی قصہ بیاں کروں

پاسِ ادب سے گو کہ میں ضبطِ فغاں کروں — بانگِ شکستِ رنگ کو کیوں کر بیاں کروں

کیا بیٹھے بیٹھے چہرے پہ آنسو رواں کروں — دل ہی نہیں رہا کہ میں یادِ بتاں کروں

ضعفِ قدم نے مجھ کو کیا وقفِ رہ زناں — تم جاؤ تم سے کیا گلہ اے ہم رہاں کروں

دل چہچہے میں ٹک بھی گر آوے تو میں ابھی — کنجِ قفس میں زمزمۂ گلستاں کروں

قاتل کہے ہے مجھ سے تو آنکھیں نہ کھولیو — جب تک ترے گلے پہ میں خنجر رواں کروں

اس تحفۂ حقیر سے آتی ہے مجھ کو شرم — کیا نذرِ برق خار و خسِ آشیاں کروں

لوکا[1] لگا کے پھونک دیا میرا آشیاں — میں کس سے شکوۂ ستمِ باغباں کروں

بسمل سے تیری تیغ کے کہتی ہے یوں اجل — کس منہ سے میں تری ہوس اے نیم جاں کروں

ہم پاے ضعف عشق مرا ہے عصائے آہ — میں وہ نہیں کہ شور پسِ کارواں کروں

نے شمع ملتفت ہو نہ پروانہ ہی سنے — کس کے مصیبتِ شبِ ہجراں بیاں کروں

مرنے کی میرے یار کو پروا ہی جب نہ ہو — کیا فائدہ جو جان کا اپنی زیاں کروں

قاتل نے تیغ کھینچ کے اک دن نہ یوں کہا

آ[2] مصحفی میں آج ترا امتحاں کروں

1۔ لوکا = شعلہ آتش، جلتی ہوئی لکڑی — 2۔ ل : اے مصحفی

329

ہوتے ہیں جب کہ یکجا لاکھوں ملال دل میں
آتے ہیں ہجر کی شب کیا کیا خیال دل میں

معشوق خواب میں بھی ہرگز نظر نہ آیا
آخر کو لے چلے ہم شوقِ وصال دل میں

اے غم فشار مت دے ہر لحظہ اس کو اتنا
انصاف کر تو آپھی ہے کچھ بھی حال دل میں

تیرے صفاے رخ کے عالم کو جب نہ پایا
آئینہ گر نے کھینچی خفّت کمال دل میں

مقدور یہ نہیں ہے جو لب کو وا کریں ہم
ورنہ بھرے ہوئے تھے لاکھوں سوال دل میں

جب سے نظر پڑی ہے اس نازنیں پہ اپنی
آنکھوں میں واں حیا ہے یاں انفعال دل میں

کوئی بھی ناتواں کو پامال یوں کرے ہے
اتنا تو سوچ گا ہے[1] اے نونہال دل میں

اس آستاں پہ جا کر سجدے کو سر جھکاوے
کب مصحفی نے پائی اتنی مجال دل میں

330

میرے اس کے وعدہ کس دن درمیاں رہتا نہیں
لیک وعدے پر بھی وہ نامہرباں رہتا نہیں

صبر کر اتنا بھی اے مرغِ قفس مضطر نہ ہو
نوبہار آتی ہے یہ عہدِ خزاں رہتا نہیں

بعدِ مردن بھی لحد میں مجھ کو ہے یہ اضطراب
جس سے تربت پر مری سنگ گراں رہتا نہیں

لاشہ کشتے کا ترے قوتِ[2] سگاں ہو جائے گا
خاک پر دیر اب یہ مشتِ استخواں رہتا نہیں

ہو چکے عہدِ جوانی میں جو کرتے تھے مقام
بن کیے کوچ اب ہمارا کارواں رہتا نہیں

تنگیِ جا پر قناعت گر کرے مرغِ چمن
رخنۂ دیوار میں کیا آشیاں رہتا نہیں

اک ترے پاسِ محبت نے رکھا ہے دم کو تھام
ورنہ میں کب زندگانی سے بہ جاں رہتا نہیں

عکس جا پڑتا ہے جب اس آتشِ بے دود کا
شمع کے شعلے میں پھر مطلق دھواں رہتا نہیں

چینِ ابرو دل کی دشمن ہے کہے چینِ جبیں
کب یہ مسکیں زیرِ تیغِ امتحاں رہتا نہیں

1۔ ل: کیا ہے 2۔ قوت = غذا

دل چلا بیٹھیں ہیں ہم جس دم متاعِ حسن پر کچھ ہمیں اندیشۂ سود و زیاں رہتا نہیں
سوز باں پیدا کرے ہے شوخیِ پروازِ رنگ خامشی سے راز عاشق کا نہاں رہتا نہیں

مصحفی عاشق اٹھاوے جان کے جوکھوں اگر
تو بھی بے مہری سے دَورِ آسماں رہتا نہیں

331

نہ کیونکہ ہو سرِ حسرت مرا گریباں میں مسافرانہ مجھے شب ہوئی بیاباں میں
چمن کی سیر سے آتا ہے وہ پری رخسار بھرے ہوئے گُلِ ناز و کرشمہ داماں میں
یہ کس کے موئے پریشاں پہ پڑ گئی تھی نظر صبا پھرے ہے مشوّش جو یوں گلستاں میں
کبھی نہ قصۂ زلف و رخ اس کا ان سے چکا بہم نزاع ہی رہی کافر و مسلماں میں
فلک پہ بے ادبی کا گناہ ثابت ہے پیمبروں کو بھی رکھا ہے اس نے زنداں میں
نئے کچھ اس دلِ وحشی نے اب نکالے ہیں ڈھنگ خلل نہ آئے کہیں شوخیِ غزالاں میں

میں جب سے دستِ حنائی کسی کے دیکھے ہیں
اک آگ پھنک[1] رہی ہے مصحفی دل و جاں میں

332

ہم اسیرانِ قفس لب پہ فغاں رکھتے ہیں بال و پر قابلِ پرواز کہاں رکھتے ہیں
اس کے کوچے کی زمیں گنجِ شہیداں تھی مگر واں سے خوں ابلے ہے ہم پانو جہاں رکھتے ہیں
صبح میلی ہوئی جاتی ہے رہ اے بے تابی شب کے نالے تو مرے حق میں زیاں رکھتے ہیں
اس کے کوچے میں نہتے نہیں جانا ہمیں خوب لاگ ہم سے بھی کئی شخص وہاں رکھتے ہیں
جستجو میں جو تری خاک ہوئے ہیں ان کے استخواں خاصیّتِ ریگِ رواں رکھتے ہیں
برق کی طرح تڑپ کر میں نکل جاؤں گا یار تربت پہ عبث سنگِ گراں رکھتے ہیں

1۔ل : لگ

دخل شانے کو نہ دے اتنا تری زلفوں سے دوستی ہم بھی تو اے دشمن جاں رکھتے ہیں
منھ چھپاویں جو بتاں ہم سے تو کچھ عیب نہیں قہر یہ [1] ہے کہ سراپا کو نہاں رکھتے ہیں
سیل آتا ہے کبھو، برق چمکتی ہے کبھو ہم بھی اک طرفہ خرابے میں مکاں رکھتے ہیں
کس کے آنے کی خبر آج صبا باغ میں ہے پھول نرگس کے جو چشمِ نگراں رکھتے ہیں
مصحفی کام ہے اندازِ فصاحت سے جنھیں
وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کیسی زباں رکھتے ہیں

333

ہم ہی ہیں ان کی جو باتوں کو نہاں رکھتے ہیں کچھ نہ پوچھو جو بتاں ہم پہ گماں رکھتے ہیں
کوئی گوشِ [2] شنوا ہو تو ترے کشتۂ ناز بے زبانی کے بھی عالم میں زباں رکھتے ہیں
قصد جانے کا نہ کر باغ سے کیا کیا گل پھول سر ترے پانو پہ اے سرو رواں رکھتے ہیں
عرصۂ [3] زیست کو سمجھیں ہیں تری اک سرپٹ تجھ سا شبدیز جو اے عمر رواں رکھتے ہیں
ان کا بوسہ کوئی کیا لے کہ یہ شکر دہناں تنگ تر مور کے دیدے سے دہاں رکھتے ہیں
عمر گزری کہ ہمیں عشق سے کچھ کام نہیں بدگماں اس پہ بھی چاہت کا گماں رکھتے ہیں
تیرہ [4] بختی سے نہیں کیا مری آگاہ وہ لوگ عارضِ سادہ جو زلفوں میں نہاں رکھتے ہیں
پردہ اٹھ جائے گران سے تو قیامت آوے شورشیں دل میں جو شوریدہ سراں رکھتے ہیں
لا مکاں سیر کو آتا ہے ہمارے گھر کی جب سے ہم کنجِ قناعت میں مکاں رکھتے ہیں
مصحفی جو مری فریاد کو سنتے ہی نہیں
کتنا یارانِ عدم گوش گراں رکھتے ہیں

334

کر قتل مجھے خوباں دریا میں بہا دیویں اس گریہ و زاری کا آخر یہ صلا دیویں

1۔ ل : قہر ہے یہ 2۔ل : جو کوئی گوش ہو شنوا 3۔ل سے اضافہ 4۔ل سے اضافہ

اے کاش طبیبوں کو یہ سوجھے کہ اب مجھ کو
یا یار ملا دیویں یا زہر کھلا دیویں

سوتے ہیں نصیب اپنے اور خطرے کی منزل ہے
گر آپ یہ چوکیں[1] تو مجھ کو بھی جگا دیویں

گر بانکپن اپنی پر آ جاویں تری[2] آنکھیں
بیٹھے ہوئے فتنے کو مجلس سے اٹھا دیویں

ہم سایہ ہمارا ہو گر کوئی حسیں آ کر
یہ رودیں[3] کہ پردے کی دیوار گرا دیویں

ہے باغ ارم سے بھی کچھ دور وہ رشکِ گل
جاوے گی پتا اس کا ہم تجھ کو صبا دیویں

ہم لوگ ہیں کوتہ دست اے کاش یہ فیاضاں
میوے کی کوئی ڈالی اب[4] دل پہ جھکا دیویں

لیلیٰ جو ہوئی غمگیں تو قافلے لیلیٰ کے
لیلیٰ سے یہ کہتے تھے[5] مجنوں سے ملا دیویں

ہم لوگ ہیں سودائی ہے کام یہی اپنا
جو نقش لکھیں لکھ کر پھر اس کو مٹا دیویں

اے مصحفی آ جاویں خوں رونے پہ ہم جس دم
ہر اشک کے موتی[6] کو یاقوت بنا دیویں

335

پیس[7] کر میں جو بھریں زخمِ کہن میں مرچیں
کر گئیں اپنا اثر سارے بدن میں مرچیں

تلخ اور تند کی مالش سے ندامت ہے حصول
آگ دیتی ہیں لگا سارے بدن میں مرچیں

انگلیوں کا ہوں میں اس دستِ حنائی کی شہید
کاش رکھ دیوے (کوئی) میرے کفن میں مرچیں

جھنڈیاں خسروِ گل کی ہیں بہم سرخ اور زرد
ہیں جو مرچوں کے درختوں میں چمن میں مرچیں

ان کی رنگینی کے عالم کو جو دیکھے تو مقیم
لعل و یاقوت سے بہتر ہیں پھبن میں مرچیں

آتشِ حسن دوبالا ہے جدھر جائے نظر
باغ میں لالے کی کلیاں ہیں تو بن میں مرچیں

دلِ خوں گشتہ کئی ہیں جو اسیرِ سرِ زلف
مجھ کو دکھلاتے ہیں وہ سانپ کے پھن میں مرچیں

کھائے ہے تیزیِ گفتار کی خاطر طوطی
دخل رکھتی ہیں کمال اپنا سخن میں مرچیں

رنت کبابِ جگرِ سوختہ کی خاطر ہم
با نمک پیستے ہیں بیتِ حزن میں مرچیں

1۔ ل : نہ چونکیں تو مجھ کو 2۔ ل : مری 3۔ ل : آئیں 4۔ ل : ادھر بھی
5۔ ل : کہتے ہیں مجنوں کو 6۔ل : قطرہ 7۔ یہ تین غزلیں 334, 335, 336 نسخہ لکھنؤ سے اضافہ ہیں

مصحفی طبع ہے تیزی پہ تو پھر اور بھی تو
یار کی طرح پرو تارِ سخن میں مرچیں

336

نہ بھرو غیر کے ہنس ہنس کے دہن میں مرچیں رشک سے لگتی ہیں عاشق کے بدن میں مرچیں
دیکھ سبزوں کو بِنا گوش میں تیری اے گل منھ کو لیتی ہیں چھپا برگِ سمن میں مرچیں
صید کر ماہیِ سرخ اپنے جو وہ گھر کو چلا صاف گویا کہ لٹکتی تھیں دہن میں مرچیں
دلِ خوں گشتہ کی حالت سے وہ ہوتا آگاہ رکھ کے بھیجی ہیں میں نامے کی شکن میں مرچیں
خود جدا مرچ ہے تیزی میں ہر اک اس کی نگاہ ہوویں گی ایسی تتیاً نہ دکن میں مرچیں
ماش کی دال میں بھی کھاتے جو بعضے ہیں گے ہیں مروّج یہ زمانے کے چلن میں مرچیں
آتشی رنگ کی تاثیر یہی ہوتی ہے کس طرح پھونک نہ دیں آگ بدن میں مرچیں
چرچراہٹ نہ ملی ہم کو دِلا پھر ویسی ہم نے کھائی تھیں کبھی جیسی وطن میں مرچیں
تھے ازل سے دلِ بیمار کے جو تلخ نصیب دے گئیں اپنی ہی بو سیبِ ذقن میں مرچیں
دیکھ کر ساق تلے فندقِ پا کا عالم لگ گئیں شمع کو رکھتے ہی لگن میں مرچیں

مصحفی کیوں نہ زباں لال کرے حاسد کی
کوٹ کوٹ اس نے بھریں طرزِ سخن میں مرچیں

337

زمانہ جائے گزر یا کہ ہم گزر جاویں کسی طرح سے یہ اوقاتِ غم گزر جاویں
دمِ اخیر ہے یکبار پھر بھی ہاں اے ضعف گلی میں اس کی ہمارے قدم گزر جاویں
ہزار حیف، تُو ہو شمعِ بزمِ غیر اور یاں ہماری جان پہ کیا کیا ستم گزر جاویں
دہن کو سوچیں تو ہو جاویں تنگ اہلِ وجود کمر کو دیکھیں تو اہلِ عدم گزر جاویں
نہیں انھوں کی یہ طبعِ بلند سے کچھ دور گر آبرو سے بھی اہلِ ہمم گزر جاویں

کہاں یہ صحبتِ اہلِ سخن، غنیمت ہے ‏ خوشی کے ساتھ جو دو چار دم گزر جاویں
نہیں خیال کسی کو ہماری جان پہ یاں ‏ اگرچہ سیکڑوں درد و الم گزر جاویں
بحال فقر کریں خاک مصحفی ہم زیست
کرم سے اپنے جب اہلِ کرم گزر جاویں

و ☆

338

جس وقت کہ قاتل سے مری آنکھ لڑی ہو ‏ اُس وقت ہی کیا سر پہ اجل آن کھڑی ہو
بوسے کو نہ ترسائیو تُو روح ہماری ‏ جس رات لبوں پر ترے مسّی کی دھڑی ہو
شیرینیِ لب نے تو تری ذبح کیا ہے ‏ اے وائے چُھری شہد کی اور اتنی کڑی ہو
دوں دام جو اس کی شبِ ہجراں کی سیاہی ‏ پھر دیکھوں تو کیوں کر نہ شبِ وصل بڑی ہو
پُھول اس کی میں کیا زور سے چھاتی کے اٹھاؤں ‏ جب پشت سے دروازے کی اک سل بھی اڑی ہو
آویں نہ مَلک کیونکہ زیارت کو پھر اس کی ‏ جس کشتے کی میت ترے کوچے میں پڑی[1] ہو
سختی میں رگِ سنگ تھی میری رگِ گردن ‏ ایسا نہ ہو خنجر کی ترے باڑ جھڑی ہو
کاش آوے مرے خواب میں اس رات تو جس شب ‏ دانتوں پہ مسی تو نے دھواں دھار جڑی ہو
گردش کہوں کیا اپنے نصیبوں کی وہ کافر ‏ آوے کبھی گھر میرے تو ساتھ اس کے گھڑی ہو
لازم ہے کہ تادیب کو مجنوں کی کمر کی ‏ نازک سی ترے ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی ہو
جھلسا ہوا آتا ہے نظر نخلِ تمنّا ‏ اس پر بھی کہیں آہ کی بجلی نہ پڑی ہو
اے مصحفی دل لوٹے ہے اپنا تو اسی پر
جو کوکنی[2] گل مہندی کے پھولوں کی پڑی ہو

☆ ل: آغاز ردیف واؤ کہ در ردیف ہذا بست و شش غزل است 1۔ ل: گڑی 2۔ کوکنی = گہری سرخ

339

تجھ سے تو پاسبانیِ گل باغباں نہ ہو	دامانِ پاکِ شبنم اگر درمیاں نہ ہو
دندانے سیکڑوں پڑے قاتل کی تیغ میں	مجروح کوئی مجھ سا بھی سخت استخواں نہ ہو
اے آتشِ فراق جلا اس قدر مجھے	یعنی کہ شعلہ صاف ہی نکلے دخاں نہ ہو
گر ذبح بھی کرے تو وہ ثابت قدم ہوں میں	ہرگز تری گلی سے مرا خوں رواں نہ ہو
چاہے ہے برق خندۂ گل یہ کہ باغ میں	مرغِ کباب ہوویں[1] کوئی آشیاں نہ ہو
اترے نہ قصرِ چشم سے عاشق کی طفلِ اشک	تا پہلے تارِ لختِ جگر نردباں نہ ہو
چاہے ہے یہ زمانۂ انجام بیں کی وضع	چہرے پہ میرے تہمتِ رنگِ خزاں نہ ہو
اللہ رے حسنِ شوخ کا جلوہ کہ مثلِ برق	چھپ جاوے تو بھی چشم سے ہرگز نہاں نہ ہو
اٹھتے نہیں ہیں ناقۂ لیلیٰ کے آج پانو	وامانده قیس خستہ پسِ کارواں نہ ہو
لیلیٰ تو چاہتی ہے بہت پر حیاے حسن	کہتی ہے ناقہ نجد کی جانب رواں نہ ہو
آتش نے سینہ پھونک دیا ضبط تا کجا	دل سنگ بھی نہیں ہے کہ گرمِ فغاں نہ ہو
اپنے تو عضو عضو سے ناطق ہے سوزِ دل	وہ چپ رہے جو منھ میں کسی کے زباں نہ ہو
ظالم بنا تو آپ کو جتنا کہ چاہے لیک	اتنا خیال رکھ کسی جی کا زیاں نہ ہو
میں صبر کر رہوں مری آنکھوں کے دیکھتے	اے بے وفا کسی پہ جو تو مہرباں نہ ہو

تربت پہ مصحفی کے چڑھانا نہ گل نسیم
چھاتی پہ برگِ گل کہیں اس کے گراں نہ ہو

340

کمندِ زلف کا یاں تک کوئی شکار نہ ہو	بغل میں سانپ کسی کے تہِ مزار نہ ہو
میں اپنے رُو سے خجل اتنا ہوں کہ آئینے میں	کروں نگاہ تو واں عکس بھی دو چار نہ ہو

1۔ ل :ہووے

نہ جاویں سیر کو ان فندقوں کے وارفتہ
چمن کے بیچ جو گل مہندی کی بہار نہ ہو
سنا ہے میں نے کہ اجزائے آسماں ہیں لطیف
کسی کے خاطرِ نازک کا یہ غبار نہ ہو
ہمارے عالمِ علوی میں ہے فزائشِ قدر
نہیں جو عالمِ سفلی میں اعتبار نہ ہو
یہ باقی ماندوں کی بد جوہری ہی قسمت ہے
جو خوں بھی چاٹے پہ وہ تیغ آبدار نہ ہو
یہ چاہتا ہے میاں اب علوے الفتِ غیر
کہ مصحفی کا تری طبع پر گزار نہ ہو

341

پری جب کر دکھاوے لالہ دشتی بیاباں کو
نہ ہووے گھر سے نفرت کیونکہ پھر مجھ خانہ ویراں کو
ادائے نوک مژگاں دشتِ کعبہ میں جو یاد آئی
مری آنکھوں نے پلکوں سے چنا خارِ مغیلاں کو
پتنگوں پر فلک ٹوٹا ہے جب شب نے دوالی کی
بنایا چرخ دیگر جمع کر [1] دودِ چراغاں کو
مسیحا نے ترے زخمی کی اتنی پاس خاطر کی
بجائے حقۂ مرہم کیا ہدیہ نمک داں کو
خدا [2] کے واسطے ہر دم نہ ملیے ہونٹوں پر مسّی
نہاں ظلمات میں رکھیے نہ اتنا آبِ حیواں کو
جہاں ہے گل فروشی حسن کی واں مغتنم سمجھے
ملے گر قیمت افسردہ گل فردوس رضواں کو
بہ آبِ اشکِ تازہ حسنِ رنگیں کام رکھتا ہے
کبھی دیکھا بھی ہے تو نے دکانِ گل فروشاں کو
فقیری میں کریں ہیں سیر عالم اپنے گھر بیٹھے
کہ زیرِ بوریا رکھتے ہیں ہم تختِ سلیماں کو
میں ہوں وہ جن گرفتہ عشق کا اس قصر مینا میں
کہ دیوانہ بنایا جس کی وحشت نے پری خواں کو
جو صحرا گردِ وحشت ہیں وہ تیری یادِ مژگاں میں
بنا لیتے ہیں آخر کفشِ پا خارِ مغیلاں کو
کوئی [3] شاید گریباں چاک اس کوچے میں پھر آیا
کمر سے باندھتے ہیں کو دکانِ شہر داماں کو
دیا وعدہ قضا نے ان کو صحرائے قیامت پر
زمیں از بس وفا کرتی نہ تھی گورِ غریباں کو
غزل اک مصحفی وہ کہہ کہ جس کو آشنا لکھ کر
بہ طورِ ارمغاں بھیجیں فصیحانِ صفاہاں کو

1۔ جمع کر؟ 2۔ل سے اضافہ 3۔ل سے اضافہ

342

ملی گر رخصتِ نظارہ گاہے چشمِ گریاں کو
کھلایا تا قیامت خوں میں اس نے موجِ طوفاں کو

فلک بے وارثوں کی وارثی اتنی تو کرتا ہے
خدا رکھے سلامت گنبدِ گورِ غریباں کو

لگی [1] مقسوم ہونے لذتِ کانِ نمک جس دم
ترے زخمی کے طالع میں لکھا خالی نمک داں کو

فلک وہ ماتم افزا ہے کہ ہووے دن جہاں آخر
چراغِ گور سے روشن کرے شامِ غریباں کو

جدائی نے تو خواب اور چشم میں اک تفرقہ ڈالا
کسی شب تو ہو یارب آشتی مژگاں سے مژگاں کو

نشاں جونکو کے اس پر خوش نما جوں عقدِ گوہر ہیں
ثریا نے نہیں دیکھا ترے زیرِ زنخداں کو

وہ سر رشتے ہی اب بھولے کبھی ہم لوگ لاتے تھے [2]
بہ کارِ نسخۂ زخمِ جگر تارِ گریباں کو

سیاہی بخت کی میری زبس عالم پہ چھائی ہے
نہیں پُر نور کرتی شمعِ مہ بھی اس شبستاں کو

اسیرِ زلفِ پُر خم تھے، ہماری خاک پر یارو
جمانا تھا تمھیں جائے قلم شاخِ غزالاں کو

نہ پوچھ [3] اس نرگسِ فتاں کی چالاکی کا کچھ عالم
ملا کس ناز سے تلووں تلے چشمِ غزالاں کو

چمن پیرائے عزلت مجھ سا کم ہے باغِ عالم میں
مری تسلیم نے گل کر دکھایا داغِ حرماں کو

جو ہمت اپنی آتی مصحفی عاجز نوازی پر
حوالے مور کے کر دیتے ہیں ملکِ سلیماں کو

343

گھر میں جا دیتے ہیں درویش و تونگر ہم کو
خانہ بردوش ہیں ہم، چاہیے کیا گھر ہم کو

خط تو لکھا پر اٹھانے نہیں دیتا غمِ رشک
ننگِ منتِ کشیِ بالِ کبوتر ہم کو

رگِ گل آپ ہے خونابِ ہوس میں غلطاں
اس کو یہ منہ ہے لگاوے گی وہ نشتر ہم کو

نہیں اچھا، ہو ترا دہر میں ہمسر پیدا
کمرِ یار تو کیوں کرتی ہے لاغر ہم کو

کس قدر ہستیِ موہوم کا نقطہ جس میں
ہووے مرکوز تلاشِ زر و زیور ہم کو

1۔ ل : لکھی　　2۔ ل : لاتے ہیں　　3۔ ل سے اضافہ

حلبی آئینہ ہیں ہم گہرِ عیب سے پاک عیب بیں جانتے ہیں صاحبِ گوہر ہم کو
تیرے کوچے کی طرف جاویں جو دو چار قدم پھیرے رستے سے وونہی رجعتِ آخر ہم کو
پینے والے ہیں مے، صاف کے ہم گلشن میں جامِ خوں دیوے ہے کیوں لالۂ احمر ہم کو
جلنے والوں میں ترے یوں نہ گنے جاویں گے ہر بُنِ مُو کے تلے چاہیے اخگر ہم کو
دیکھنے پائے نہ ہم سبزۂ گلشن کی بہار خط کے آتے ہی ملا زہر کا ساغر ہم کو
ہو گیا ضعف سے اشکوں میں بدن اپنا نہاں لاغری تو نے کیا رشتۂ گوہر ہم کو
نالۂ نیم شبی نے یہ بڑا قہر کیا لے گیا وادیِ محشر کے برابر ہم کو
دل گیا ہاتھ سے نظارہ کی دنبال تو جائے تو تو رسوا نہ کر اب اے مژۂ تر ہم کو
صید لاغر ہیں نہ ہر لحظہ تو خنجر دکھلا استخواں پہلو کے خود لگتے ہیں خنجر ہم کو
مرگ نے بھی ترے زنداں کا زبس سمجھا تنگ کر دیا خانۂ زنجیر سے باہر ہم کو

مصحفی دست جنوں کا تو نہ رہتا کھٹکا
کرتے شاگرد جو ادریس پیمبر ہم کو

344

خانہ زنداں ہے تری چشم کے بیماروں کو دام ہے الفتِ صیاد گرفتاروں کو
یاں نہیں قطرۂ خوں اپنے تنِ خشک میں اور واں بتاں سان پہ رکھواتے ہیں تلواروں کو
ضبطِ مرغانِ چمن کا ہوں میں کشتہ دے[1] میں کیسے کانٹوں کہ یہ سی رکھتے ہیں منقاروں کو
پہنچے منزل کو سبک گام زہے ناکامی بیٹھے تلووں سے نکالا کیے ہم خاروں کو
موتیوں کی یہ ترے ہاتھ میں سمرن[2] ہے صنم یا ثریا نے پرو اس میں دیا تاروں کو
بے سبب بھی نہیں یہ تیزیِ سوہانِ[3] فلک اور ہموار کیا چاہے ہے ہمواروں کو
مدد تیز پری ہو تو حضورِ صیاد توڑ جاویں ہم ابھی دام کی دیواروں کو
ہوں میں وہ سوختہ قسمت کہ جو اولے مانگوں ابر برسائے مرے کھیت پہ انگاروں کو

1۔ دے = فارسی مہینے کا نام 2۔ سمرن: مالا 3۔ سوہان = ریتی

لطف کی تہ سی ہے اک اس کے غضب سے پیدا تب تو امیدِ شفاعت ہے گنہگاروں کو
ان پہ عالم یہ صفا کا ہے کہ کہتے ہیں مقیم آبِ گوہر نہیں لگتی ترے رخساروں کو
جی رندھا جائے ہے تاریکی سے اس کی یارب شبِ ہجراں نے چھپایا ہے کہاں تاروں کو
مصحفی گر ہے تجھے دعویِ شیریں دہنی
اک غزل اور بھی تو کہہ کے سنا یاروں کو

345

چاہیے سینۂ افگار عزا داروں کو عَلَمِ آہ سے باندھیں ہیں یہ تلواروں کو
پردگی تو ہی نہیں تو یہ مرا ناوکِ آہ توڑ جائے ابھی فولاد کی دیواروں کو
پشت پر آئینے کی بوسہ نہیں دیتا یار چومتا بھی ہے تو بس اپنے ہی رخساروں کو
بے وفائی[1] کی جو تیغ ان کی عَلَم ہوتی ہے قتل کرتے ہیں بُتاں پہلے وفاداروں کو
نہ ڈروں کیوں میں شبِ ہجر کی تاریکی سے کھائے جاتی ہے یہ ڈائن کی طرح تاروں کو
نشۂ عقل سے ہرگز نہیں باہر آتے بیہشی کس نے پلا دی ہے یہ ہشیاروں کو
دل میں ہو عشق تو کچھ حسن پہ موقوف نہیں دام ہے ہر شجرِ باغ گرفتاروں کو
سنگِ رہ ہوتے ہیں اب آبلۂ پا، میں نے طے کیا تھا کبھی ان پانو سے کہساروں کو
کس طرح منزلِ تجرید میں پھر پانو رکھیں بارِ سر بھی ہے گراں ہم سے سبک ساروں[2] کو
ان کے چھالوں کے تئیں جان کو لوہے کے چنے تیرے دیوانے چبا جاتے ہیں تلواروں کو
کس سے دریا میں یہ بگڑی ہے کہ بے تابانہ لہریں سب کھینچے ہوئے جاتی ہیں تلواروں کو
مصحفی آنے کا وعدہ تھا عدم سے ان کا
نہیں معلوم کہ کیوں دیر لگی یاروں کو

1۔ ل سے اضافہ 2۔ل :سبک باروں

346

آئی ہے فصلِ گل پھر گلشن میں نغمہ سازو
گل گوش بن رہے ہیں آ ان کو سرفرازو

دیکھی نہیں ہے تم نے کیا اس پری کی صورت
مغرورِ حسن اتنے تم کیوں ہو عشوہ[1] سازو

انصاف سے نہ گزرو نازِ بتاں نہ کھینچو
جائے نیازمندی بس ہے یہ بے نیازو

اتنا تو دھیان رکھو یہ کس کی انجمن ہے
بیٹھو ذرا سرک کر اے اہلِ امتیازو

عالم جو آنسوؤں کا مژگاں پہ میں دکھاؤں
کام اپنا بھول جاؤ تم ووں ہی شیشہ سازو

دو چار شمع جلتی مجلس میں دیکھ اپنی
بولا وہ بڑھ چلو مت اتنی زباں درازو

رنگِ رخ اس کا گویا دانہ انار کا ہے
ایسا بھی پھول تم نے دیکھا چمن طرازو

ہے آج وصل کی شب جھگڑا رہے نہ باقی
تم آپ کو مٹا دو جوں شمع جاں گدازو

اہلِ صفا کی مجلس، مجلس سماع کی ہے
یاں بے وضو تو ہرگز آؤ نہ بے نمازو

فرمائشی غزل یہ لکھی ہے مصحفی نے
تم کو بھی فکر اس کا لازم ہے عشق بازو

347

کچھ غم نہیں دنیا سے اٹھ جانے کا شاعر کو
الفت ہی نہیں ہوتی منزل سے مسافر کو

خوں خوار ترا تیغا وہ قہر کا دریا ہے
اک گھاٹ اتارے ہے جو مومن و کافر کو

ہر زخم میں اک خنجر رکھنا ہے[2] مجھے لازم
واں چیز نہیں گنتے ایوب سے صابر کو

تا مسئلۂ وحدت مکشوف ہوا ہم پر
ہم فرق نہیں کرتے منظور سے ناظر کو

ہم خاک کے پتلے ہیں کیا ہم میں تو واں اِلّا
دیکھیں تری آنکھوں سے تیرے ہی مظاہر کو

آنکھوں کے اشارے میں کیا کیا نہ کہا میں نے
گاہے تو بھلا تم بھی رکھتے مری خاطر کو

تدبیر معاش اس جا ہے شرط خرد مندی
انسان نہیں گنتے ہم مصحفی کایر[3] کو

1۔ ل : عشقبازو 2۔ ل : رکھنا مجھے لازم تھا 3۔ کایر = بزدل، بے عمل

348

نظر کیا آئے ذاتِ حق کسی کو — خیال اس کا نہیں مطلق کسی کو
نہ تھا عاشق کے خوں میں رنگ گلزار — کوئی تو دے گیا رونق کسی کو
مقید میں مقید ہے وہ مطلق — نہ سوجھا اتنا بھی مطلق کسی کو
نہ کر اتنی بھی ناصح ہرزہ گوئی — خوش آتی کب ہے یہ بق بق[1] کسی کو
فریبِ مدعی کھاتے ہیں کب ہم — مگر سمجھا ہے وہ احمق کسی کو
جگر ہے چاک، چاکِ آستیں سے — دکھائی تو نے کیا مرفق[2] کسی کو
ریاضِ وصل سے وقتِ سقیمی — نہ ہاتھ آئی کبھی سرمق[3] کسی کو
تصور میں ترے اے شعلۂ حسن — نہیں آرام چوں زیبق[4] کسی کو
بھروسا کیا ہے دل کا بحرِ غم میں — ڈبو دیوے نہ یہ زورق[5] کسی کو
نکلنے آپ سے دیتا نہیں آہ[6] — طلسمِ گنبدِ ارزق[7] کسی کو
دکھا دے چاندنی میں اپنا مکھڑا — صنم، مل کر ذرا ابرق کسی[8] کو

وحیدِ دہر ہے اے مصحفی تو
نہ اپنے ساتھ کر ملحق کسی کو

349

فغاں جو کنگرۂ عرش سے بلند نہ ہو — تو بامِ وصل کی آہِ رسا کمند نہ ہو
اڑائے جائے وہ مرکب کو کیا قیامت ہے — ہماری خاک سے ہمراہیِ سمند نہ ہو
میں دردِ ہجر میں پاتا ہوں وصل کی لذت — دوا وہ دو مجھے یارو جو سودمند نہ ہو
چمن میں جائے جو وہ نوبہار محبوبی — بغیر خوردۂ گل چاہیے سپند نہ ہو

1۔ بق بق = بک بک 2۔ مرفق = کہنی 3۔ سرمق = بتھوے کا ساگ 4۔ زیبق = پارہ
5۔ زورق = کشتی 6۔ ل : ہائے 7۔ ارزق (صحیح ازرق) = نیلگوں 8۔ ل سے اضافہ

بشر کا حوصلہ ہے یہ کہ پھاندے خندقِ دہر ہزار مرحلے ہیں اس میں اک زغند نہ ہو
نہ دیکھے گر تری آنکھوں کو غور سے تو کبھو دوچار فتنۂ دل عافیت پسند نہ ہو
وہ شہسوار مری آنکھوں میں نہیں کھبتا پری کے ہاتھ میں جس کا شکار بند نہ ہو
کبھو ہوں کشتۂ چشم اور کبھی ہوں بستۂ زلف شبِ فراق میں کیوں دردِ دل دو چند نہ ہو
جلا ہوا ہوں بہت ناصحوں سے مصحفی میں
غزل سنا تو وہ اب جس میں حرفِ پند نہ ہو

350

رہینِ ضبط کوئی مجھ سا دردمند نہ ہو شکستِ رنگ سے جس کی صدا بلند نہ ہو
لگے ہے ہاتھ کب اپنے وہ گوری گوری ساق نصیبِ مردمِ تلخی نصیب قند نہ ہو
پہن گلے میں نہ اپنے تو ہار نرگس کا کہ چشمِ زخم سے اے گل تجھے گزند نہ ہو
خضاب مونچھوں کو کرتا ہے اپنے زاہدِ شہر مجھے یہ ڈر ہے کہیں اس پہ ریش خند نہ ہو
پری نے اپنا جسے خالِ رخ بنایا ہے جلا بھنا یہ اسی بزمِ کا سپند نہ ہو
دلِ شکستہ نہ ہوتا درست واں دیکھا دیارِ حسن میں شاید شکستہ بند نہ ہو
حجابِ حسن کا زیور ہے گر کوئی سمجھے عروس چاہیے بے معجر[1] و پرند نہ ہو
لہو تو جاے کف آنے لگا دہن سے ترے زیادہ گرم اب اے عشق کے سمند نہ ہو
سخن بھی علتِ ناسور ہے عجب مت جان
جو تا بہ مرگ زباں مصحفی کی بند نہ ہو

351

دم بہ دم رو بہ قفا اے صاحبِ محمل نہ ہو در قفاے ناقۂ مجنوں زخود غافل نہ ہو
بدگمانی آئینے سے بھی فزوں ہوتی ہے یاں جی دھڑکتا ہے وہ اپنا آپ ہی مائل نہ ہو

1۔ معجر = چادر۔ پرند = سادہ یا ریشمی کپڑا

اس حنائے عیش کے ملنے کا پھر کیا فائدہ جز کفِ افسوس جس سے اور کچھ حاصل نہ ہو
صورتِ خورشید گر کاسہ بنے سب تن مرا چرخِ دوں ہمت سے ہرگز تو بھی یہ سائل نہ ہو
تا[1] نہ رعشہ دست کو قاتل کے ہو ہنگام ذبح اس کے رخ پر چاہیے وا دیدۂ بسمل نہ ہو
کر سکے گا روکشی اس قامتِ موزوں سے تو منھ تو دیکھ اپنا خفیف اے سرو پا در گل نہ ہو
عشق میرا ہے خطِ تقدیر جوں نقشِ نگیں پھوڑ ڈالوں کاسۂ سر تو بھی وہ زائل نہ ہو
پانو اُٹھتے ہیں گرانی سے مرے اے ہمرہاں جس میں مجنوں کھپ گیا ہے یہ وہی منزل نہ ہو
حسن کی غیرت یہ چاہے ہے کہ بعد از مرگ بھی اس کے کوچے میں مزارِ عاشقِ بے دل نہ ہو
ہوں میں بے پروا غریق ایسا کہ بے تحریک[2] موج جس کا لاشہ اچھلے پر بھی قاصدِ[3] ساحل نہ ہو
چاہتا ہوں دل بنے خلوت سرائے خاص یار اس مکانِ تنگ میں ہنگامۂ محفل نہ ہو
ہجر کہتا ہے کہ لذت چکھ مری اے ننگِ عشق شوق چاہے ہے کہ پردہ درمیاں حائل نہ ہو
تیشۂ فرہاد کہتا تھا زبانِ حال سے آدمی تا سر نہ دیوے عشق میں کامل نہ ہو
اُربسی نیلم کی واں سینے سے ٹلتی ہی نہیں داغ غم چھاتی کا میری کس طرح پھر سل نہ ہو
کر ریاضت سے بدن کو اپنی تو مانندِ روح نقشِ ہستی بعدِ مردن چاہیے باطل نہ ہو

کیمیا سازِ جہاں جتنے ہیں سب قلاب[4] ہیں
مصحفی یاں چاہیے وہ مس کہ جس میں غل[5] نہ ہو

352

ناقۂ لیلیٰ سے تو اے سارباں غافل نہ ہو نجد کی جانب خیالِ صاحبِ محمل نہ ہو
مر گیا ہو دیکھ کر جو قامتِ موزوں ترا سرو کے تختے دے اس کی قبر گل در گل نہ ہو
خوں بہا تو اک طرف میرا رہا روزِ جزا میں یہ ڈرتا ہوں کہ مجھ پر دعویِ قاتل نہ ہو
تجھ کو جانا نجد میں بے سارباں اچھا نہیں بازیِ گردوں سے غافل اے مہِ محمل نہ ہو

1۔ ل: تا کہ 2۔ل: بے تجرید 3۔قاصد = قصد کرنے والا 4۔ قلاب = بدل دینے والے، مراد فریبی 5۔ ل: طل

دستِ قاتل کو نہ ایذا پہنچے جنبش سے تری ہے یہ جاے پاس اتنا مضطراے بسمل نہ ہو
اے حجابِ عشق ٹک آنکھیں اٹھانے دے مجھے شرم کا پردہ تو واں ہے اور تو حائل نہ ہو
ہجر میں ممکن نہیں بچنا ترے عاشق کا جاں قدرتِ حق سے اگر امرِ قضا باطل نہ ہو
مصحفی یہ بحرِ دلکش طرفہ معنی خیز ہے
قافیوں پر اس کے ہر دم فکر کیوں مائل نہ ہو

353

وہ مرقع میرے قاتل کے پسندِ دل نہ ہو جس کے صفحے پر شبیہِ طائرِ بسمل نہ ہو
نزع میں مدت سے ہوں اور دم نکلتا ہی نہیں کس نے دی تھی یہ دعا آساں تری مشکل نہ ہو
چشمِ لطف اس کی پڑی ہے انتقامِ چرخ سے ڈر ہے یہ مجھ پر فرشتہ قہر کا نازل نہ ہو
کارواں میں تو نہیں پرسش ولے چاہے ہے رشک محملِ لیلیٰ کے پیچھے زید کا محمل نہ ہو
صبح دم وعدہ ہے مجھ مضطر سے اس کے وصل کا اے شبِ ہجراں سمٹ جا آج تو حائل نہ ہو
لیلیٰ کہتی ہے کہ ناقہ آج کچھ چلتا ہے ست پوچھ تو اے سارباں یہ نجد کی منزل نہ ہو
فکرِ دنیا سہل ہے عقبیٰ کی کچھ تدبیر کر چاہیے انسان کو اندیشۂ باطل نہ ہو
سیر دیکھے ہے تڑپنے کی ترے قاتل مرا اس کی خاطر رکھ ابھی سے سرد اے بسمل نہ ہو
رشک کھاوے کیوں نہ اس احساں پہ تیرے مصحفی
اس کو بوسہ دے تو جو دشنام کے قابل نہ ہو

354

صاف کا عاشق تو رہ اور دُرد کا مائل نہ ہو ے وہ کیا پینے سے جس کے سرخوشی حاصل نہ ہو
پردہ دارِ سوزِ غم ہرگز صفاے دل نہ ہو شیشے کی فانوس نورِ شمع کے حائل نہ ہو
ذبح کرنے سے فقط تو شاد وہ قاتل نہ ہو برق تیغ اس کی سے تا خاکستر بسمل نہ ہو
حرف سخت اس کو نہ کہہ عاشق شکستہ دل نہ ہو دل کے توڑے سے پشیمانی تجھے حاصل نہ ہو

خضر کے مانند جینا ہے وبالِ زندگی　　زیر تیغ ایک پل میں طے تا عمر کی منزل نہ ہو
اے تنِ خاکی نظر میں رکھ تو اپنا مرتبہ　　روح کے پیچھے نہ جا مجبول سے عاجل نہ ہو
ہستیِ فرضی کا عالم کی نہیں کچھ اعتبار　　موج دریا کی طرح سے یہ خطِ باطل نہ ہو
جب کیا ہو اس کی فکرِ وصل نے اس میں ہجوم　　سر کو زانو سے اٹھانا کس طرح مشکل نہ ہو
کیوں پذیرائی ہو اس کو رنگ کے اعراض کی
مصحفی گر جسمِ انساں جوہرِ قابل نہ ہو

355

بے داغ عاشقوں کو ثمر رُت حصول ہو　　دیکھا نہیں درخت میں گُولر کے پھول ہو
کاوش یہ تھی[1] زمین کو مجھ سے کہ میں غریب　　جاؤں اگر چمن میں تو سبزا ببول ہو
دستک بھی بھیجے مجھ پہ جو رنگ حنائے دست　　جز اشکِ سرخ اور تو کیا زر وصول ہو
آتش کدے میں عشق کے رکھے وہی قدم　　چلنا تمام عمر کا جس کو قبول ہو
صورت کو تیری دیکھ کے کہتے ہیں ذی شعور　　یا خود پری ہے یا کہ پری کا حلول ہو
کر گفتگوئے روح سے دل شاد اے حکیم　　بس کب تلک مباحثۂ عرض و طول ہو
غایت کو اپنی پہنچے نہ حیرانِ رنگِ دہر　　ممکن نہیں کہ غنچۂ تصویر پھول ہو
کیا اس پہ معترض ہو کسی بات کا کوئی　　قرآں میں جس کی شان ظلوم و جہول ہو
قانونِ منضبط سے کنارا نہیں بھلا　　کس کام کا وہ رقص کہ جو بے اصول[2] ہو
ہیبت سے میری کانپیں ہیں زور آورانِ دہر　　واں شیر کب رہے ہے جہاں سار وصول[3] ہو
جو کچھ کہے تو ہم کو بھی کرنا وہ مصحفی
سلطاں کے حکم کا نہ کسی سے عدول ہو

1۔ ل : تھی یہ　　2۔ ل : بے وصول　　3۔ ل : سار دھول (سار وصول۔ سار دھول؟)

356

چاہت[1] تری جذب اور ہی دکھلاتی ہے مجھ کو
بیتابیِ دل کھینچے لیے جاتی ہے مجھ کو

کہتا ہوں جو افسانہ کبھی درد کا اپنے
وہ شوخ یہ کہتا ہے کہ نیند آتی ہے مجھ کو

ساغر نہیں آتا ہے مرے ہاتھ کسی سے
جو حور بہشتی ہے سو ڈہکاتی ہے مجھ کو

ہر چند میں کم قدر ہوں اک ریگ کا ذرہ
روشن گریِ خاک میں چمکاتی ہے مجھ کو

جوں ہیزمِ تر کیوں نہ دھواں آہ کا پھیلے
اک آگ ہے سینے میں کہ سلگاتی ہے مجھ کو

نے وصل ہے، نے ہجر ہے، نے موسمِ گل ہے
بے ہیچ طبیعت مری گھبراتی ہے مجھ کو

کیا یہ بھی کسی دستِ حنائی کی ہے فندق
لالے کی کلی اتنا جو للچاتی ہے مجھ کو

کشتہ ہوں میں اس شوخ کے اندازِ حیا کا
وہ نیچی نظر خاک میں ملواتی ہے مجھ کو

کس واسطے دامن میں مرے آ نہیں پڑتی
بجلی کی چمک دور سے ترساتی ہے مجھ کو

اے مصحفی قاصد نہیں جاتا تو نہ جائے
اتنی تو خوشامد بھی نہیں بھاتی ہے مجھ کو

357

رہے[2] ہے گل سے افزوں بیمِ تاراجِ خزاں مجھ کو
بنانا ہی نہ تھا ایسے چمن میں آشیاں مجھ کو

حقیر اتنا ہوا ہوں میں کہ گر گلزار تک جاؤں
ہر اک کانٹا بھی دکھلاتا ہے واں نوکِ سناں مجھ کو

قیامت کے تو آنے میں نہیں شک یہ تأمل ہے
لحد سے اٹھنے دے گا کیوں کہ یہ خوابِ گراں مجھ کو

میں کچھ مردہ نہیں کیوں جیتے جی یارب دکھاتے ہیں
فشارِ قبر کا عالم زمین و آسماں مجھ کو

معاذ اللہ عجب مشکل مرے درپیش آئی ہے
نہ تابِ ضبط ہے یکدم نہ یارائے فغاں مجھ کو

گلے پر میرے خنجر کھینچ کر وہ کاش رکھ دیوے
جدائی نے کیا ہے جس کی مشتِ استخواں مجھ کو

میں تھا ہمدرد اس کا پاس مجنوں ہی کے لے جاتا
اگر لیلیٰ کے ناقے کا بناتے سارباں مجھ کو

1۔ نسخۂ پٹنہ میں اس غزل کا صرف پہلا شعر ہے۔ باقی نسخۂ لکھنؤ سے اضافہ

2۔ یہ اور اس کے بعد کی تیرہ غزلیں اصل کے سوا دیگر نسخوں میں نہیں ہے۔

میں سمجھا تھا کرے گا کچھ اثر اس شوخ کے دل میں　　جلایا تو نے تو اے نالۂ آتش فشاں مجھ کو
اگرچہ مصحفی مانع ہے میری نغز گوئی کے
پر اس پر بھی سمجھتے ہیں سبھی آتش زباں مجھ کو

358

نظر میں لالۂ رنگیں ہے ہر زخمِ نہاں مجھ کو　　دکھاتا ہے مرا سینہ سیر گلستاں مجھ کو
نگاہوں میں بہارِ گل کو میں تو لوٹ لیتا ہوں　　بھلا کیا رخصتِ سیرِ چمن دے باغباں مجھ کو
میں روزی غیر کی قسمت کی نت کھاتا رہا ہئے ہئے　　ہُما کا قوت تھا وہ بھی ملا جو استخواں مجھ کو
بلایا صاعقے کو گہ، گہے بجلی کی دعوت کی　　نہ تھا منظور آتش میں جلانا آشیاں مجھ کو
قدم جوں جوں اٹھائے جلد دوں دوں ناتوانی نے　　برنگِ نقش پا رکھا قفائے کارواں مجھ کو
معاذ اللہ کہ غیر از عکس دیکھے کوئی منھ اس کا　　رکھے ہے آئینے سے بھی محبت بدگماں مجھ کو
برا ہو آنکھ کا کب کی یہ میری دشمنِ جاں تھی　　کیا جس نے گرفتار بلائے ناگہاں مجھ کو
نہیں موسم سفر کا تازہ آیا ہوں میں صحرائی　　بھلا دو دن تو رہنے دے چمن میں باغباں مجھ کو
سبک اے مصحفی یاں تک ہوا میں ضعف پیری سے
کہ آخر زیست اپنی ہو گئی بارِ گراں مجھ کو

359

بدگمانی جو ہوئی سیرِ چمن سے یار کو　　عادتِ دامن کشی سکھلائی کس نے خار کو
عارضی عزت کا خواہاں ہی نہیں مردِ فقیر　　سر پہ آزادوں کے دیکھا ہے کہیں دستار کو
گر نہ ہووے اس میں تیرے لعلِ نوشیں کا مزہ　　نوش دارو زہر کا بخشے اثر بیمار کو
جب جوانی ہو چکی، پیری میں غفلت آ گئی　　صبح کو نیند آتی ہے ہر شخص شب بیدار کو
ہجر کی شب ہر ستارہ ہے مرے نالے کا خصم　　تاکتا ہے گل چلا [1] پہلے علمبردار کو

1۔گل چلا = گولا چلانے والا

بندھ گیا کم فرصتی میں صبح کے تارے کا دھیان
وصل کی شب جب میں دیکھا روزن دیوار کو

تنگ چشمی نے بتاں کی یہ ستم کیسا کیا
مور کا دیدہ بنایا روزن دیوار کو

مشک بیز ایسی ہی ہے گر اس کی زلفوں کی شمیم
تختہ کر دے گی دکانِ کلبۂ عطار کو

ہم غریبوں کی تھا پھوٹی آنکھ کا تارا وہی
کر دیا بند اس نے ناحق روزن دیوار کو

نقشۂ شہر وفا سے جس کو آگاہی نہ ہو
قبر بنوانے نہ لانا میری اس معمار کو

خاک میں ملتا ہے پیری سے جوانی کا مزہ
جب ہوئی کہنہ تو لونی لگتی ہے دیوار کو

حق اگر دیتا مجھے مسند نشینی کا دماغ
سامنے آنے نہ دیتا چرخ ناہنجار کو

بعدِ بوسہ لذتِ مس ہاتھ سے جانے نہ دی
پشت پا پر اس کے لب رکھ کر رکھا رخسار کو

بیٹھنا اب اس کے پہلو ہی کا دیویں گے اڑا
کب تلک ہر اک سے سنیے حرف پہلودار کو

ہاتھ وہ جو آستیں ہی کے رہے کوچے میں بند
پاؤں وہ جو جانتے ہرگز نہیں رفتار کو

سامنے نقش فنا ہے ان کے اور غافل ہیں یہ
آئینے میں سوجھتا ہے کیا اولی الابصار کو

رسم میں میری رہے کب تک مسیحا پائے بند
اے اجل آ بھی اٹھا دے پردۂ پندار کو

چلتے چلتے یہ کنایہ زور قاتل نے کیا
ہاتھ میں کشتے کے جو وہ دے گیا تلوار کو

مصحفی چھوڑا در اس کا تو نے ناداں کیا کیا
ہاتھ سے دیتا ہے کوئی ایسی بھی سرکار کو

360

حسن سے اپنے خبر شاید ہوئی اب یار کو
دیدۂ عاشق وہ سمجھا روزن دیوار کو

کیا سمجھ کر دل دیا تھا میں نے چشم یار کو
اب کروں کیونکر علاج اس سیپ کے بیمار کو

تھی مناسب اوٹ بینی کی دو چشمِ یار کو
جیسے رکھتے ہیں جدا بیمار سے بیمار کو

زور پایا ہے یہ تصویر پری نے مرتبہ
جو لگاتی ہے ترے رخسار سے رخسار کو

گر خم مے کی یہ جوشش ہے تو اک دن دیکھیو
لگ رہے گی آگ بامِ خانۂ خمار کو

ہم بھی بھنورا بن کے ان پھولوں کی بو کو جا لگے
عید کی شب اس نے جو پہنا گلے میں ہار کو

کس قدر مرغ چمن کو بھی ہے پاس روے دوست
برگ گل پر رکھ کے لیتا ہے اٹھا منقار کو

راہ معنی میں جو اس کے پاؤں یہ چالاک ہیں
میرے ہاتھوں سے قلم سیکھا ہے اس رفتار کو

تو لتی ہے جو نظر میں اپنے پیچ اور اس کے پیچ
زلف کی لٹ تک رہی ہے لٹ پٹی دستار کو

بیچ میں زلف سیہ نظارے کے حائل ہوئی
چہرہ تو چاہے تھا اس کا حق ملے حقدار کو

بے ستوں مت کوہ کن کو اس بزرگی پر ڈرا
تیشہ یاں چٹ کر گیا ایسے کئی کہسار کو

عاشقوں سے اس کے ہوتا ہی نہیں افشاے راز
عشق کردیتا ہے گونگا واقفِ اسرار کو

جوش میں آیا ہے جس ساعت مرا دریائے اشک
اس نے مارے ہیں تھپیڑے سیل بے زنہار کو

کب چکا چونداس نے جھیلی آہ آتش بار کی
جھجکے ہے جو سان پر رکھتے ہوئے تلوار کو

سوزنِ مژگاں تجسس کر اسے لائیں نکال
عشق نے تلووں میں جو توڑا تھا میرے خار کو

لن ترانی کی صدا سے دل پہ جو آئی شکست
کر دیا موسیٰ نے رخصت طاقتِ دیدار کو

آرزوے تیر میں اس کی موے سوفاقہ کش
فاق[1] بند اس نے کیا کس پر لب سوفار کو

عشق کی آتش کا رتبہ کیا بیاں میں آسکے
جس نے پھر پیدا کیا بیضے سے موسیقار کو

بچۂ بلبل وہی مجھ کو خوش آیا بیضے میں
بیشتر آنکھوں سے جس نے وا کیا منقار کو

آدمی میں مصحفی اتنی صلاحیت تو ہو
دوست رکھتا ہوں میں قرطاس غلط بردار کو

361

سبزۂ خط دام میں لایا ہے زلفِ یار کو
اس زمرد نے کیا ہے کور چشمِ مار کو

کیا بہار آئی کھلے جو ہم اسیروں کے نصیب
پھر قفس لے لے چلے صیاد سب گلزار کو

عشق کے میداں کا سرکھپ ہے عجب رستم مزاج
نے وہ گھوڑے کی ڈپٹ سمجھے ہے نے للکار کو

1۔ فاق = ''ریسمانِ خام کہ در وسطِ چلہ کماں بعرضِ یک انگشت بپچند تا سوفار براں بند کردہ زہ بکشند''۔ پہلے مصرعے میں اسی کی رعایت سے ''فاقہ کش'' ہے۔

بار عصیاں کا ہمارے لے تو وہ بھی بیٹھ جائے
گاؤ نے سر پر اٹھایا گو، زمیں کے بار کو

جس سے ملتا ہی نہیں راہ برآمد کا پتا
گرد کھینچا ہے فلک نے کیا خط پرکار کو

جس طرح اخگر کو دم سے ہووے ہے حاصل فروغ
اور بھی بوسے نے چمکایا ترے رخسار کو

کیوں نہ وہ دزدِ حنا پاوے جہاں میں مرتبہ
ہاتھ میں رکھنے سے عزت ملتی ہے تلوار کو

دم بدم رہتا ہے ان کو اک خراشیدن سے کام
دوست رکھتے ہیں مرے ناخن مرے رخسار کو

بھان متیوں سے نہ مل گر ہے تجھے عزت کا پاس
آگ میں پہلے جلا دیتے ہیں یہ دستار کو

کچھ چمکتے جوہرِ مُو ان دنوں آئے نظر
کیا کسیس اس نے دیا ابرو کی پھر تلوار کو

درمیاں میں ہو جو اہلِ جنگ کے پردہ تو کیا
پیل دو ٹکر میں دیتا ہے گرا دیوار کو

آستین و جیب و دامن سرخ کب تک دیکھیے
اب میں پانی میں رکھوں گا دیدۂ خونبار کو

رفتہ رفتہ قافیے بندھ کر قصیدہ ہو گئے
اس غزل کے دیکھیو اے مصحفی بستار کو

362

کیا کڑھاؤں میں دکھا کر شیشہ چشمِ یار کو
رسم ہے آئینہ دکھلاتے نہیں بیمار کو

میرے مرنے کی کہو مت کوئی چشمِ یار کو
صدمہ کیا پہنچے خدا جانے دلِ بیمار کو

مو قلم سے کھینچ مت نقاش چشمِ یار کو
مول کم لیتے ہیں مردم چینیِ مودار کو

دیتے ہیں موے جبیں بوسہ جبینِ یار کو
رشک کش اپنا کریں تا طالبِ دیدار کو

کر چکے ہیں نذر دل اول خدنگ یار کو
سر بھی حاضر ہے اگر خواہش ہو اس تلوار کو

ہم نشیں تیرا نہ ہو کوئی تو تنہائی کے بیچ
مشورہ کر باندھ کر زانو پہ تو دستار کو

عشق کا کافر ہوں رکھتا ہوں مسلمانوں کا حکم
پھر نہیں میں ہی اگر توڑا مرے زنار کو

شاید اس کے حسن میں باقی ہے آرائش ہنوز
روز محشر پر جو رکھا وعدۂ دیدار کو

دل اگر ٹوٹا تو وہ بھی کام آتا ہے کبھی
پھینک بھی دیتے نہیں ہیں کاسۂ مودار کو

شہرِ خوباں میں ہے نقدِ داغِ دل سب کو پسند
سکۂ رائج سمجھتے ہیں اسی دینار کو

لے گیا کوچے میں اس کے یوں مجھے بختِ سعید　　کوئی جوں دار الشفا کو لے چلے بیمار کو

دخل کیا جو اس میں ہووے سبزۂ خط کا نمو　　آبِ گوہر کی صفا دی جو ترے رخسار کو

لذتِ لولیِ دنیا کے تئیں سمجھا جو شہد　　چوستا ہے منھ میں لے کر وہ زبان یار کو

زخم کاری جن کے آئے ہیں ترے مقتل کے بیچ　　دے رہے ہیں وہ دعا اس تیغ لنگر دار کو

اس سے گاہے تو شعاعِ حسن آتی ہے نکل　　حق سلامت رکھے اس کے روزنِ دیوار کو

دور ہیں ایسے سے پھر کیونکر ملاوے کوئی آنکھ　　چشمِ نا محرم جو سمجھے رخنۂ دیوار کو

صاف لکھتا ہے زوالِ عشق کی مدت حکیم　　اور ہم چھاتی کی سل سمجھے ہیں اس آزار کو

بل بے غیرت حسن کی بل بے تری شہزداگی　　ساتھ آنے کی نہیں رخصت چرن بردار کو

اس صفِ مژگاں میں ناگہ جا پڑی جس کی نگاہ　　طے کیا آنکھوں سے اک صحرائے نشتر دار کو

تجھ کو کیا بسیار گوئی سے ہے کام اے نغز گو
مصحفی موقوف کر اس کثرتِ اشعار کو

363

گئے وہ دن کہ دل چاہے تھا گاہے سیر دریا کو　　ہم آئے شہر میں جب سے نہ دیکھا روے صحرا کو

کہیں دم لینے دے دشمن کے ہمسائے ہے گھر میرا　　نہ رسوا اور کر اے گریہ و زاری تو رسوا کو

دوائے دردِ ہجراں کیا کرے گا عشق میں اس کے　　ہوئی ہے اب تو آپھی جاں بڑی مشکل مسیحا کو

سیہ بختی پر اپنی کیوں نہ جھنجھلاؤں میں کم قسمت　　جو بوسہ زلف دے ہر دم ترے رخسار زیبا کو

نہیں اتنی بھی رخصت مجھ کو ملتی واے محرومی　　کہ کھولوں اس کے رخ پر خواب میں چشمِ تماشا کو

اگر ہم خاکساروں کا نہیں منظور خوں کرنا　　حنا سے پھر بتاں کرتے ہیں رنگیں کیوں کفِ پا کو

زمین و آسماں حکمِ پیمبر میں رہے اکثر　　نہ دریا راہ دے وقتِ ہزیمت کیونکہ موسیٰ کو

محبت نے کشش کا اپنی نقشا کھینچ دکھلایا　　لکھا آغوش میں یوسف کی تصویر زلیخا کو

اگر مجنوں تک اے بادِ صبا ہووے ترا جانا　　دعا کہہ دیجیو میرے جنونِ وحشت افزا کو

جو کوئی قرط[1] ہووے کا تو دفعِ تشنہ کامی کو　دکھاتا ہے ہمیں چھلکا کے ساقی کیا تو مینا کو
گر اس حورِ بہشتی کا اسے عالم نظر آوے　ہوس مریم کی رخ پر وا کرے بابِ تمنا کو
نہ پوچھیں مصحفی گو اہلِ دولت مجھ کو کیا غم ہے
مقام اپنے میں آزادی کی عشرت بس ہے عنقا کو

364

خدائے پاک کی حکمت کو دیکھو　سبھی صنعت ہے جس صنعت کو دیکھو
جو کشتہ ہے نگاہِ سرگیں کا　نہ اس کی کھول کر تربت کو دیکھو
صفائے آئینہ پر کیا ہو لقو　مرے دل کی بھی ٹک حیرت کو دیکھو
نہیں دم مارنے کی جا دمِ نزع　ذرا اس وقت کم فرصت کو دیکھو
گلے پر اپنے خنجر رکھ دیا میں　مرے دل کو مری ہمت کو دیکھو
ہوا میاں مصحفی لیلیٰ پہ شیدا　ذرا تم قیس کی چاہت کو دیکھو
گرفتارِ بلائے عاشقی ہو
فصیحِ دہر اس ذلت کو دیکھو

365

جو ہوتے حاسدوں کے حق کرے گا کامراں مجھ کو　تو میں جانوں گا یہ چاہے ہے جی میں آسماں مجھ کو
میں جتنا جاگ لوں اس تیرہ شب میں زندگانی کی　غنیمت ہے کہ ہے درپیش اک خواب گراں مجھ کو
خدا ہی کی مدد ہووے تو پاؤں کامِ دل ورنہ　نظر آتا ہے مفسد کچھ مزاجِ دوستاں مجھ کو
سلائی دستِ مشاطہ سے گر کر ہوگئی پنہاں　سیہ بختی نے میری جب بنایا سرمہ داں مجھ کو
گلستانِ جہاں میں نغمہ پردازِ کہن ہوں میں　نواسنجوں سے بہتر جانتا ہے باغباں مجھ کو
مری تربت پہ بس ہے خیمۂ زنگاریِ گردوں　نہیں کچھ بعدِ مردن احتیاجِ سائباں مجھ کو

1۔ قرط = گھونٹ

پڑا ہوں ہاتھ میں اس کے میں برگِ زرد کی صورت
خدا جانے کہاں لے جائے یہ بادِ خزاں مجھ کو

ارادہ تو قفس سے چھوٹ کر کرتا ہوں گلشن کا
اگر واں دیں جگہ طالع بقدرِ آشیاں مجھ کو

گیا میں بیٹھ آخر کو قدم اُٹھتے رہے میرے
نظر آتی رہی جب تک کہ گردِ کارواں مجھ کو

خداوندا ثباتِ جاں فشانی تو عنایت کر
کہ تا خجلت نہ ہو قاتل سے وقتِ امتحاں مجھ کو

برابر محملِ لیلیٰ کے آکر بول اٹھا مجنوں
تو خالی چل، مہارِ ناقہ دے اے سارباں مجھ کو

گیا ہے دل تو جاوے جان و تن بھی غم ہے کیا اس کا
محبت میں نہیں اندیشۂ سود و زیاں مجھ کو

ہے جائے بیم رہزن اور میں مطلق چل نہیں سکتا
جواب اس طاقتِ پا نے دیا بھی ہے کہاں مجھ کو

کہوں کیا مصحفی میں حال گلگشتِ گلستاں کا
بغیر از یار نوکِ نیزہ لگتی ہے سناں مجھ کو

366

میری طرف بھی اے بتِ عیّار دیکھ تو
کتنا ہوا ہوں تیرے لیے خوار دیکھ تو

مت کیجیو علاج، یہ مانا، پر اک ذرا
عیسیٰ تو نبضِ عاشقِ بیمار دیکھ تو

صیاد جائے رحم ہے اب ان کو چھوڑ دے
غوغائے طائرانِ گرفتار دیکھ تو

اتنا گھمنڈ خوب نہیں اپنی چال پر
کبکِ دری تو اس کی بھی رفتار دیکھ تو

اے مصحفی تو غش سے بس اب آنکھ کھول دے
کس کا ہے سر پہ سایۂ دیوار دیکھ تو

367

روئے عرق افشاں جو ترا جلوہ کناں ہو
گردوں پہ شبِ وصل میں تاروں کا زیاں ہو

پتھر میں جو عاشق ہے تو پانی میں ہے گوہر
یہ سچ ہے کہ چھپتا ہی نہیں حسن جہاں ہو

موذی کو کمینے سے ہے تنبیہ پہنچتی
مچھر نہیں واں رہتے ہیں جس گھر میں دھواں ہو

دے کون زلیخا کو سوا قیمتِ یوسف
کم بکتی ہے بازار میں جو جنس گراں ہو

سرخی لیے دیکھے جو مرے اشک کا مونگا حسرت سے اسے چشمِ کبوتر نگراں ہو
تربت مری معلوم نہ ہو تا کہ کسی کو واں دفن مجھے کیجو جہاں ریگ رواں ہو
اے ضبط نہ کر مجھ کو خجل یار کے آگے جیتے تو نہ منھ میں مرے پتھر کی زباں ہو
اس نورِ تجلّی میں ہے خو برق کی ساری سو بار کرے جلوہ تو سو بار نہاں ہو
یا رب کہیں دن جاویں گزر ...... کے خورشید کرے قصدِ حمل رفع خزاں ہو
سچ کیا ہے وہ احوال ستاروں کا فلک کے
اے مصحفی تجھ سا جو کوئی ہندسہ داں ہو

368

ناداں بہت بھلا نہیں ہوشیار کچھ تو ہو فہمیدہ اپنے کام کا دلدار کچھ تو ہو
لاوے صبا چمن سے اگر کوئی برگِ گل تسکینِ طائرانِ گرفتار کچھ تو ہو
خورشید کی پناہ کو صحرائے حشر میں ظلِ درخت و سایۂ دیوار کچھ تو ہو
عالم خیالِ زلف نے دیوانہ کر دیا سودا جنوں مجھے بھی شبِ تار کچھ تو ہو
مدت میں تم ملے ہو بھلا آج تو میاں پیمان و عہد و وعدہ و اقرار کچھ تو ہو
بیچو بالاضطراب نہ ابرو کی تیغ کو سودے میں تیز اس کے خریدار کچھ تو ہو
پیری میں تو نہ رکھ تو مجھے مبتلائے رنج اے بختِ خفتہ خواب سے بیدار کچھ تو ہو
سرخی شفق کی یا وہ سپیدے کی روشنی لیلِ فراقِ صبح کا آثار کچھ تو ہو
ساقی سفالِ سنگ میں تو اس کے دے شراب
سامانِ عیش مصحفیِ زار کچھ تو ہو

369

زلفِ مشکیں کہ وہ رکھتا ہے پریشاں اس کو جو کوئی اس میں پھنسے تازہ ملے جاں اس کو
تیرے دیوانے کو لگتی ہے بھلی عریانی زیب دیتا نہیں اب چاکِ گریباں اس کو

غار میں جب سے کہ بیمار پڑا ہے مجنوں دیکھ جاتا ہے ہر آہوے بیاباں اس کو
خاک آمیختۂ خونِ شہاں سے دنیا اور ہم سمجھے ہیں بازی گہِ طفلاں اس کو
اس کے رخسار جبیں میں ہے یہ نسبت باہم گر سکندر اسے کہیے تو سلیماں اس کو
شہر کو چھوڑ کے صحرا کو گیا گر مجنوں خوں رلاوے گی بہت یادِ دبستاں اس کو
معجزِ حسن نے رکھا نہیں آپس کا خلاف یار ہو چاہتے ہیں گبرو مسلماں اس کو
مصحفی چاہیے میں بھی نہ کروں اتنا خیال
کچھ مرے ساتھ گر الفت نہیں چنداں اس کو

ہ

370

اچھا[1] ہے گیسوؤں کے ترے بل سے آئنہ لیتا ہے روز درس مطوّل سے آئنہ
اک دم جدا نہ ہو جب اس اچپل سے آئنہ تم ہی کہو کہ کیونکہ رہے کل سے آئنہ
جو اس کے روے صاف کو کہتا ہے مہر و ماہ وہ دیکھتا ہے دیدۂ احول سے آئنہ
تیرے قماشِ حسن کی نازک تنی کو دیکھ حسنِ تراش مانگے ہے ململ سے آئنہ
یہ شوقِ حسن چاہے ہے اس کا جدا نہ ہو اک لحظہ نازِ بالشِ مخمل سے آئنہ
اس حسنِ صندلی کے نہیں جذب سے عجب آوے نکل جو خانۂ صندل سے آئنہ
جوہر نہیں چمکتے عرق اس کے منھ کا دیکھ افشاں چنے ہے ماتھے پہ بھوڈل سے آئنہ
شب اس نگاہِ تند نے ٹکڑے کیا ہی تھا کہتے ہیں بچ گیا بڑی کلول سے آئنہ
دیکھیں گے ہم نمد تری شیخی بروزِ حشر نکلے گا جب فقیر کے کمبل سے آئنہ
کہتے ہیں سادہ اس کو کہ گلزارِ حسن میں
واقف ہوا نہ پھول سے نے پھل سے آئنہ

1۔ یہ اور اگلی غزل اصل کے سوا دیگر نسخوں میں ندارد

371

چاہے ہے زیب حسن اس کی بازو پہ ہوں نو رتن ہمیشہ
غربت میں رہی نصیب ہم کو خوش طالعِ وطن ہمیشہ
جعدِ مشکیں کی تیری کافر دنبال پھرا ختن ہمیشہ
تلوار سے تیرے عاشقوں کے اُتو ہوئے پیرہن ہمیشہ
کچھ ہم پہ کھلا نہ عقدۂ دہر گو کرتے رہے جتن ہمیشہ
رہنے کی نہیں ہے، چیت غافل یہ صحبتِ جان و تن ہمیشہ
معشوق خیال کی رہی ہے چھاتی پہ میرے ذقن ہمیشہ
واں بن گئے قصے اور فسانے یاں بند رہا دہن ہمیشہ
چھوڑا نہ حجاب تم نے ہم سے ڈھانپا کیے بدن ہمیشہ
آتی ہے صدائے تیشہ اب تک جیتا رہے کوہکن ہمیشہ
یا رب رہے پیشِ چشمِ ساقی دیدار کی انجمن ہمیشہ
رفتارِ فلک سے شکوہ کیا ہے ق ہیں اس کے یہی چلن ہمیشہ
شاہوں کو بجائے خلعتِ زر پہنائے ہے یہ کفن ہمیشہ
صدقے ہوں سخن کے مصحفی میں
صدقے ہے مرے سخن ہمیشہ

372

چکھی نہ جس نے کبھی لذتِ سنانِ نگاہ مزہ دے پھر اسے کیا تیغ خوں چکانِ نگاہ
جس انجمن میں کہ پڑتا نہ تھا گمانِ نگاہ پڑا ہے ٹوٹ دمِ رقص آسمانِ نگاہ
بلا سے اس سے ہی روزِ سیہ کا حال کہوں کہ میلِ سرمہ ہے اس کے مزاج دانِ نگاہ
دھنک سے سرمے کی چلّہ ہے تا بگوشۂ چشم کوئی ہے صید جو پھر زہ ہوئی کمانِ نگاہ

بَری ہے واجب و ممکن کی قید سے وہ حسن　نہ درمیانۂ مردم، نہ درمیانِ نگاہ
ہوا تھا مستی[1] کی مجلس میں شب گزر اپنا　کیا نظارۂ محویتِ جہانِ نگاہ
وہ آسماں کی طرف دیکھے گر اٹھا کر آنکھ　گرے زمین پہ عیسیٰ بھی کھا سنانِ نگاہ
نہ تاب نورِ تجلّی کی[2] لا سکا موسیٰ
فروغِ حسن ہوا باعثِ زیانِ نگاہ

373

چاہ کی رکھے کہیں تہمت نہ تم پر آئنہ　دم بدم دیکھا نہ کیجے بندہ پرور آئنہ
بے دھڑک عاشق سے سنمکھ ہووے کیونکر آئنہ　ہے نگاہوں کا تمھاری ناز پرور آئنہ
گر یہی ہے سبزۂ خط کی ترے رخ پر بہار　ایک دن اپنے کرے گا آپ جوہر آئنہ
سادہ رویوں سے جو میں رکھتا تھا الفت بعدِ مرگ　میری تربت پر چڑھاتے ہیں وہ آکر[3] آئنہ
رشک کے مارے نہ ہو کیوں شیشۂ دل چور چور　بن گیا ہے ہاتھ میں جا تیرے پتھر آئنہ
گرچہ فردِ سادہ تھا وہ کر دیا وقتِ خمار　لال ڈوروں نے تری آنکھوں کی مسطر آئنہ
منھ نہ دکھلانے سے تیرے اس کا پہنچا ہے یہ حال　جو نظر آتا ہے شکلِ دیدۂ تر آئنہ
جوہروں کو اپنے چٹکاتا ہے مانندِ سپند　عکسِ روے آتشیں سے بن کے مجمر آئنہ
پانو گر ناقے کا واں پھسلے عجب اس کا نہ جان　سطح ہے مجنوں کی وادی کا سراسر آئنہ
خود ہماری آنکھ میں تو حیرت ستاں ہے بزم یہ　کس لیے لایا بنا کر تو سکندر آئنہ
آفتابِ حسن گر آوے تمازت پر ترا[4]　برف کی مانند پانی ہو پگھل کر آئنہ
داغ چیچک منعکس ہیں کس کے جو دکھلائے ہے　عالمِ سرخی میں صد چشمِ کبوتر آئنہ
دیدہ بازوں کا ہلاکو، مدعی، دشمن، رقیب　اور تو کوئی نہیں، اِلّا یہ کافر آئنہ
سنگ پر پٹکے ہے اس کو جب وہ ہنگامِ عتاب　ٹوٹنے میں مارتا ہے اپنے خنجر آئنہ

1۔ ل : مسّی　2۔ ل : کا　3۔ ل : اکثر　4۔ ل : ورا

کس کو دیکھا ہے کہ ہے اس بزم میں اے مصحفی
بے حواس و بے خود و حیران و ششدر آئنہ

374

تپ کی شدت میں دلِ زار ہوا کچھ کا کچھ
سوکھ کر اور یہ بیمار ہوا کچھ کا کچھ

اپنے مجروح کی تب آ کے خبر لی اس نے
جب کہ حالِ دلِ افگار ہوا کچھ کا کچھ

دن بدن بڑھتی گئی رونقِ ایامِ شباب
رفتہ رفتہ وہ طرحدار ہوا کچھ کا کچھ

ہم بھی جھیلا ہی کیے جی سے جفائیں اس کی
جس قدر چرخِ جفاکار ہوا کچھ کا کچھ

رنگِ بے صبریِ دل پر مری آئی نہ شکست
گرچہ رنگِ گل و گلزار ہوا کچھ کا کچھ

ہم تو کچھ سمجھے تھے انجامِ محبت میں ولے
ماجرا دیدۂ خونبار ہوا کچھ کا کچھ

قدر تھی اس کی بڑی عالمِ آزادی میں
حیف، دل ہو کے گرفتار ہوا کچھ کا کچھ

اس کی مجلس میں جو مذکور چلا کچھ میرا
سنتے ہی رنگِ رخِ یار ہوا کچھ کا کچھ

جس سے کل مدِ نگہ تنگ گزر کرتی تھی
آج وہ روزنِ دیوار ہوا کچھ کا کچھ

ہم سے کچھ اور کہا اس بتِ ہرجائی نے
غیر سے وعدہ و اقرار ہوا کچھ کا کچھ

اس کی تقصیر نہیں سننے میں وقتِ پرسش
مدعا مجھ سے ہی اظہار ہوا کچھ کا کچھ

مصحفی میں تو عبادت کا کیا تھا ساماں
پر عمل مجھ سے شبِ تار ہوا کچھ کا کچھ

375

تھا جو شعر راست سرو بوستانِ ریختہ
اب وہی ہے لالۂ زردِ خزانِ ریختہ

آگے کچھوے کی کماں کے قدر کیا اس کی رہی
تھی فرید آبادی اپنی گو کمانِ ریختہ

خشک کرتے ہیں جو فکرِ خشک سے اپنا دماغ
جانتے ہیں اس کو مغزِ استخوانِ ریختہ

پیچ دیدے لفظ و معنی کو بناتے ہیں کلفت[1]
اور وہ پھر اس پہ رکھتے ہیں گمانِ ریختہ

1۔ کلفت = ناہموار

فہم میں اتنا نہیں آتا بحکمِ رائے پست
اس بلندی سے گھٹی جاتی ہے شانِ ریختہ

خوانِ یغما بن کے پہنچا ہر کس و نا کس کے ہاتھ
نطعِ[1] سلطاں جو تھا مخصوص خوانِ ریختہ

ہے رگِ ابرِ بہاری ہاتھ میں میرے قلم
رشکِ جنت جس سے ہے یہ گلستانِ ریختہ

فارسی اب ہوگئی ہے ننگ اس کے واسطے
فارسی کا ننگ تھا جیسے قرآنِ ریختہ

چاند تارے کا دوپٹا میں دیا اس کو بنا
ورنہ اس زینت سے کب تھا آسمانِ ریختہ

رفتہ رفتہ ہائے اس کا اور عالم ہو گیا
نظم سے اپنی گرا نظمِ بیانِ ریختہ

جب سے معنی بندی کا چرچا ہوا اے مصحفی
خلطے میں جاتا رہا حسنِ زبانِ ریختہ

376

جنگجویوں نے بتا کر مجھ کو شمشیروں کے ہاتھ
کاٹ ڈالے ہیں مرے نالوں کی تاثیروں کے ہاتھ

اس کے مقتل میں ہوئے شاید کہ کشتوں کے شمار
ہے ملائک سے بلند اب تک جو تکبیروں کے ہاتھ

کر چکے ہیں ذبح تب چورنگ کرتی ہے وہ شوخ
ان کے پھر[2] پانو سے بندھوا کر وہ نخچیروں کے ہاتھ

اشتیاقِ وصل میں تیرے موے ہیں جو جوان
ہیں کفِ افسوس باہم ان جوانمیروں کے ہاتھ

غالت آتے ہی نہیں تقدیر سے جو فلسفی
باندھ رکھے ہیں قضا نے ان کی تدبیروں کے ہاتھ

جاوے گر بت خانۂ چیں میں تو[3] اے جانِ جہاں
وا ہم غوشی کو تیری ہوویں تصویروں کے ہاتھ

اس کی کیا تقصیر ہے خود بِک گیا ہے ان دنوں
یہ دلِ دیوانہ ان پانو کی زنجیروں کے ہاتھ

حسن نے آخر کرامت کچھ نہ دکھلائی جو ہیں
اے جواں حق میں ترے صرفِ دعا پیروں کے ہاتھ

جن گداؤں کے گئی ہے مغز میں بوے طعام
دیدۂ حسرت سے تکتے ہیں وہ کفگیروں کے ہاتھ

کون سا پیکاں نہیں سر ڈوب میرے خون میں
تا بساعد تو حنائی ہیں ترے تیروں کے ہاتھ

آوے گر جادوگری پر اپنی وہ سحر مبیں
باندھ لیوے ایک تارِ زلف میں تیروں کے ہاتھ

سامنے تیرے وہ کس رو سے ہو یارب بخش دے
مصحفی کے منھ پہ ہیں خجلت سے تقصیروں کے ہاتھ

1۔ نطع = فرش۔ مراد دسترخوان 2۔ل : دو پاؤں 3۔ ل : جاوے گر تو آئنہ خانے میں

ی، ے

377

پئے کبادہ جو بہرام کی کماں کاٹے
نہ کیوں کہ تیر وہ ارجن کے ہر زماں کاٹے

جو باغباں کو تری چشم کا اشارہ ہو
تو میل سرو وہ از بہرِ سرمہ داں کاٹے

پڑیں نہ تیغ میں قاتل کی کیوں کہ دندانے
لگائے سنگ پہ گہ، گاہ استخواں کاٹے

مرے نہ زندۂ جاوید مثلِ راس و ذنب[1]
اگرچہ تیغِ فنا اس کو از میاں کاٹے

اگر میں خط میں اسے حالِ زار لکھ بھیجوں
تو آ کے خواب میں ظالم مری بناں[2] کاٹے

جو تیرا بوسۂ لب یاد آوے عاشق کو
لحد میں بھی لبِ افسوس ہر زماں کاٹے

رقم نہ ہو کبھی مجنوں سے نامۂ لیلیٰ
اگر بجائے قلم اپنی انگلیاں کاٹے

ہوئی ہو نجد میں جب شام شاہدِ حی کو
نہ کیوں کہ رات پھر آنکھوں میں سارباں کاٹے

میں وہ اسیر ہوں وحشی کہ جب بہار آئی[3]
قفس کی اپنے بہ منقار تیلیاں کاٹے

جنوں زدہ کو ترے جکڑیں جب سلاسل میں
نہ اپنا گوشت وہ دانتوں سے ہر زماں کاٹے

غزل وہ لکھ تو اب اے مصحفی کہ دیکھ جسے
قلم تراش سے شیریں رقم بناں کاٹے

378

اگر بہ تیغ سرِ تاکِ بوستاں کاٹے
رگِ حیات کو مستوں کی باغباں کاٹے

نہ اپنی تیغ کو اتنی ستم گری سکھلا
کہ گوشت کاٹ کے میرے وہ استخواں کاٹے

جگر سراہیے، اس کا قفس میں بلبل نے
کئی بہار[4]، کئی موسمِ خزاں کاٹے

1۔ راس و ذنب = اژدھے سے مشابہ ایک شکلِ آسمانی   2۔ بنان = انگلی کی پوریں   3۔ ل : آوے
4۔ ل : کئی بہار کے ہیں

نہ تن کو سر سے ہو پیوند پھر معاذ اللہ گلا کسی کا تری تیغِ امتحاں کاٹے
لگے جو ہانکنے ناقے کو نجد سے سوے حی الٰہی تیغِ قضا دستِ ناقہ راں کاٹے
مزے بہار کے لوٹے ہیں خوب بلبل نے رہے قفس میں بھی اب چند روزیاں کاٹے
صفا جو دانتوں کی دیکھی تری تو ہندوے چرخ گہر فروش کے شب تختۂ دکاں کاٹے
جگایا خواب سے غنچے کو صوتِ بلبل نے اسی گناہ پر اس کی کوئی زباں کاٹے
کدھر ہے وادیِ مجنوں کہ جس میں ہو بےغم زمامِ ناقۂ لیلیٰ کو سارباں کاٹے
سناؤں ایک غزل مصحفی میں تجھ کو اور
گلا نہ تیغ سے اپنا تو گر میاں کاٹے

379

غضب ہے زلف کو اپنی وہ دلستاں کاٹے طنابِ عمر کسی کی نہ آسماں کاٹے
جو موے سر سے ترے ہمسری کا دعویٰ ہو چمن میں گیسوے سنبل کو باغباں کاٹے
میں کب سے کشتۂ کوثر ہوں کہہ دو قاتل سے[1] جہاں نہ پانی ہو، گردن مری وہاں کاٹے
فلک نہ دیکھ سکے یہ بھی گر کوئی دم چند بہ زیرِ سایۂ دیوار گلستاں کاٹے
کروں چمن میں جو مذکور اس کی چوٹی کا تو مار بن مجھے شاخ سنمراں[2] کاٹے
کہے تھا قیس کہ اے کاش میری رسوائی زبانِ طعنۂ یاران و دوستاں کاٹے
ہزار حیف کہ مجنوں نے تجھ بن اے لیلیٰ دن اپنی عمر کے کاٹے پہ رائیگاں کاٹے
مجالِ حرف نہیں اس کے سامنے مجھ کو کسی کی تیغ خموشی نہ یوں زباں کاٹے
بہت محال ہے بازی کا جیتنا اس سے جو کعبتین کو عاشق کی استخواں کاٹے
شفیع ہو جو تری زلف و رخ تو تیغ خزاں نہ پیچ سنبل و نے شاخِ ارغواں کاٹے
وہ بحر پر ہو شبِ مہ تو جان کر مقیش شعاعِ ماہ کو مقراضِ کہکشاں کاٹے
کسی کے عشق میں ہے یہ بھی بستۂ زنجیر کوئی نہ بیدِ مولّہ کی ڈالیاں کاٹے

1۔ ل : کو 2۔ اصل اور دیگر نسخوں میں ''صمنبر اں'' ہے

نہ بت کدے میں لگے اس کا دل نہ کعبے میں
بقیہ عمر کو پھر مصحفی کہاں کاٹے

380

زلفِ عاشق کے لیے مار لیے پھرتی ہے — اور جو ابرو ہے وہ تلوار لیے پھرتی ہے
شیخ مغرور ہے اسلام پہ کیا ساتھ اپنے — تیری تسبیح تو زنار لیے پھرتی ہے
نذر کو کس گلِ نورستہ کے دامن میں نسیم — بھر کے پھولوں کا اک انبار لیے پھرتی ہے
کہہ دو اس پردہ نشیں سے ترے سودائی کو — بیقراری سرِ بازار لیے پھرتی ہے
ہیں جو سرگشتہ بگولے کی طرح خاک ان کی — گردشِ چرخِ ستم گار[1] لیے پھرتی ہے
پردۂ حسن ترا سقف فلک ہو نہ سکے — آرسی اپنی ہی دیوار لیے پھرتی ہے
سمجھے تو معنی انساں تو حقیقت یہ ہے — روح اک صورتِ دیوار لیے پھرتی ہے
اس چمن میں تری نذرِ کمرِ نازک کو — رگِ گل ہاتھ میں زنار لیے پھرتی ہے
پیرزن کیا تجھے سوجھے ہے جو زنجیروں میں — کر کے مجنوں کو گرفتار لیے پھرتی ہے

مصحفی اور غزل کہہ کہ طبیعت تیری
لفظ و معنی کا اک انبار لیے پھرتی ہے

381

اجلِ بلبلِ گلزار لیے پھرتی ہے — موجِ گل ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی ہے
خانۂ عمر ہے یاں ایک ہی دم میں مسمار — زندگی خانۂ دیوار لیے پھرتی ہے
روح فرہاد کے آلودہ بہ خوں تیشے کو — اب تلک برسرِ کہسار لیے پھرتی ہے
جس طرف جاوے ہے تو شورِ قیامت کے تئیں — تیرے پازیب کی جھنکار لیے پھرتی ہے
کیوں نہ عاشق کو ہو سودا کہ وہاں اس کی نگاہ — روز ساتھ اپنے خریدار لیے پھرتی ہے
دل کو بہلانے مگر نکلی ہے لیلیٰ سوے دشت — ناقے ساتھ اپنے جو دو چار لیے پھرتی ہے

1۔ل: جفاکار

بدگمانی مرے دل کی ترے کوچے میں صنم / سو طرف مجھ کو شبِ تار لیے پھرتی ہے

کیا ہوا پیر ہوئے مصحفی گلیوں میں ہمیں
اب تلک خواہشِ دیدار لیے پھرتی ہے

382

کیوں نہ تنہائی سے جی اپنا شبِ تار الجھے / جب رگِ جاں سے تری زلف کا ہر تار الجھے

روٹھ کر گھر سے مرے یار چلا ہے، اس کا / کاش چوکھٹ ہی میں دامن گہِ[1] رفتار الجھے

اٹھ کے اس کو سے چلوں میں تو مرے پانو میں / مار پیچاں ہو وونہی سایۂ دیوار الجھے

نوبتِ جنسِ خط و خال نہ آئی از بس / رہ گئے زلف کے سودے میں خریدار الجھے

بوسۂ عارضِ گل لیجو سمجھ کر بلبل / بے خبر تیری رگِ گل میں نہ منقار الجھے

بند شلوار کا اس گل کے جو لچھا دیکھا / متفق ہو کے بہم کافر و دیں دار الجھے

بعد مُردن بھی ہے دشوار رہائی ان کی / سخت یاں دامِ تعلق کے گرفتار الجھے

صلح و جنگ کا پوچھو نہ سبب آپ ہی آپ / سلجھے سو بار جو وہ زلف تو سو بار الجھے

بدگمانی نے کیا داغ جو اس مجلس میں / فرش پر دیکھے پڑے ہم نے کئی بار الجھے

یاد آوے جو اسے رنجِ گرفتاریِ دام / آشیانے میں پرِ بلبلِ گلزار الجھے

جب کہ بندھ جائے تصور تری زلفوں کا صنم / نزع کے وقت نہ کیوں کر دلِ بیمار الجھے

دیکھ لوں اس کو دمِ قتل بھی گر قاتل کے / دستگی[2] ہاتھ سے ٹک کھینچ کے تلوار الجھے

لاغری کی ہے بہم دونوں میں نسبت پیارے / کیوں ترے موے کمر سے نہ دلِ زار الجھے

مجھ کو وہ طرۂ پُر پیچ بہت یاد آیا / باغ میں دیکھے جو سنبل کے کئی تار الجھے

ہے یقیں مجھ کو کہ ہووے گا چھڑانا دشوار / دامنِ دل سے جو مژگاں کی تری خار الجھے

جانے پاتا ہے کوئی دشتِ جنوں سے مجنوں / گرد کو جھاڑے تو دامن سے وونہی خار الجھے

1۔ ل : دم رفتار　　2۔ دستگی = دستانہ

منھ جو ناقے کا پھرا نجد سے ناگہہ سوے حی — دامنِ محملِ لیلیٰ سے وونہی خار الجھے
خارِ مژگاں سے ذرا اس کو بچائے رکھنا — تار اشکوں کا نہ اے دیدۂ خونبار الجھے
شانہ دن رات پھرے جب کہ ترے[1] بالوں میں
کیوں نہ دیکھ اس کو دلِ مصحفیِ زار الجھے

383

ساتھ عاشق کے ہی گو زیرِ زمیں جاتا ہے — خوب رُویوں کا تصور بھی کہیں جاتا ہے
واہے جس دن سے مکاں حسن کی تیرے گھر میں — مشتری برسرِ بازار نہیں جاتا ہے
اس کے بیمار کی بالیں پہ پشیماں ہوگا — کیا مسیحا تو دمِ باز پسیں جاتا ہے
داد ملتی ہے جہاں لال زبانوں کو مدام — داد خواہی کو مرا نالہ وہیں جاتا ہے
قیمتِ لختِ جگر دور کھنچی ہے یعنی — بکنے بازار یمیں کو یہ نگیں جاتا ہے
در تلک آ کے ذرا جھانک تو لے تو اس کو — اک جواں جان سے اے پردہ نشیں جاتا ہے
ہاتھ میں یار کے آیا ہے کماں کا قبضہ — ملکِ دل قبضے سے اے جان جزیں جاتا ہے
نہ سمجھنا تو کہ نالہ ہے ضعیفوں کا ضعیف — لب تلک آتے ہی تا عرش بریں جاتا ہے
کاش اسی گرد میں ملتی یہ مری خاک بدن — ہاتھ جس گرد کا تا دامن زیں جاتا ہے
کس کی یہ نعش مقدس ہے کہ جس کے ہمراہ — سر برہنہ کیے جبریل امیں جاتا ہے
مصحفی چشمِ وفا اس سے نہ رکھ، برسرِ مہر
کوئی اس کا دلِ خو کردہ بہ کیں جاتا ہے

384

گلبن کو رعشہ ہے نہ نشیمن کے بوجھ سے — کانپے ہے طائرانِ نوازن کے بوجھ سے
یاروں کی چھاتیوں پہ سلیں ہیں دھری ہوئی — ہم اتنے کیوں دبیں گلِ مدفن کے بوجھ سے

1۔ ل :تری زلفوں

یاں دل میں سو گماں کیے اور واں نکل گئی | دامن کی چین بخیۂ دامن کے بوجھ سے
لوٹے ہے اس پہ لعلِ مسی زیب سے بہار | سوسن کی ٹہنی خم نہیں سوسن کے بوجھ سے
ہے بسکہ ناتواں پہ ترے زندگی وبال | عاجز ہوا ہے وہ سرو گردن کے بوجھ سے
اللہ رے نازکی کہ جوابِ سلام کو | ہاتھ اس کا اٹھ کے رہ گیا سمرن کے بوجھ سے
گر سنگ لعل میں ہو ترے لعل لب کا وزن | پھٹ جائے سینہ کوہ کا معدن کے بوجھ سے
نازک ہے اس قدر وہ کہ گر کچھ کبھی سیے | انگلی پہ خطِ نیل ہو سوزن کے بوجھ سے
ازبس موا میں ہو کے سبک چشم خلق میں | بھاری ہوئی نہ نعش مرے تن کے بوجھ سے

اب مصحفی وہ جنسِ نفیسِ سخن نکال
ہوتی ہو بے کلی جسے بیٹھن[1] کے بوجھ سے

385

وہ کوہ پارہ جب بنے آہن کے بوجھ سے | خم ہو زمیں کی پشت نہ توسن کے بوجھ سے
کیوں کر گراں ہو روح رواں تن کے بوجھ سے | کشتی نہ ڈوبے بحر میں آہن کے بوجھ سے
خود و زرہ لباس ہے مردوں کا وقتِ جنگ | آہن تنوں کو فخر ہے آہن کے بوجھ سے
منقارِ مرغ عظمت باری میں آسماں | کم وزن تر ہے دانۂ ارزن[2] کے بوجھ سے
سینے کا کر نہ قصد مرے زخم کے مسیح | لگتی ہے ٹھیس اسے سرِ سوزن کے بوجھ سے
دیوار وہ خیال کی ہر شب بنے ہے یاں | جو گر پڑے ہے کاغذِ روزن کے بوجھ سے
اللہ رے نازکی کہ دمِ رقص وہ صنم | اٹھ اٹھ کے بیٹھ جاوے ہے دامن کے بوجھ سے
کانوں کی بالی ہی نہیں ان کانوں پر گراں | گردن بھی خم ہے زیورِ گردن کے بوجھ سے
بحرِ عدم کی تہ کو گیا ہے جہازِ عمر | آخر سیاہیِ شبِ مردن کے بوجھ سے
بیٹھے گا ملنے اب کے وہ نازک بدن تو ہم | تولیں گے اس کو پھولوں کے خرمن کے بوجھ سے

1۔ بیٹھن = سرپوش، وہ کپڑا جس میں کوئی چیز لپیٹی جائے　　2۔ ارزن = غلے کا دانہ

اس نوجواں کو مصحفیؔ کیوں کر اٹھایئے
بوجھ اس کا اب زیادہ ہے چھٹپن کے بوجھ سے

386

سنائی اس کو جو میں اپنی داستاں ساری　خوشی میں رات کٹی اس کی ہمدماں ساری
اگر نہ تھا کفِ عشاق میں ترا دامن　نکل گئی ہے یہ چیں اس کی پھر کہاں ساری
قفائے[1] ناقۂ لیلیٰ ہی رہ گیا مجنوں　یہ راہ طے نہ ہوئی اس سے سارباں ساری
ادائے شکر ہوا حسنِ گل کا تب مجھ سے　بہ رنگِ خار میں جب بن گیا زباں ساری
یہ کس غریب نے سر اپنا اس پہ پٹکا ہے　لہو سے تر ہے جو دہلیزِ گلستاں ساری
کسی مقام میں شاید کہ اس کو رحم آوے　کہانی میری سنا اس کو قصہ خواں ساری
ہے جس دکان میں یوسف کے حسن کا پرتو　منڈھی ہوئی ہے تمامی[2] سے وہ دکاں ساری
ہدف بنا ہے یہ کس کے خدنگِ مژگاں کا　جو ماہ نو میں ہے اک شکل استخواں ساری
رہے ہے دھیان اسے کس کی دیدبانی کا　جو رات آنکھوں میں کاٹے ہے پاسباں ساری
کیا ہے ذبح کسے بے دریغ یہ تو بتا　بھری ہے خوں سے تری تیغ کیوں میاں ساری
تو جس میں چاند سا مکھڑا کبھی چھپاتا ہے　بنے ہے نور کی چادر وہ طیلساں[3] ساری
تبھی میں قتل ہوا تھا نیام سے باہر　ابھی نہ نکلی تھی وہ تیغِ امتحاں[4] ساری
ہماری بزم میں اس بادہ کش کا کام نہیں　پیئے صراحی نہ جو مے کی مے کشاں ساری
یہ نیزہ بازی خزاں کی مگر بہار نے کی　لہو میں ڈوبی جو ہر غنچہ کی سناں ساری
لکھا جو خط[5] اسے گا ہے تو پھر پشیماں ہو　قلم تراش سے کاٹیں میں انگلیاں ساری
نہ جب تلک کہ کرے اس کو پہلے کاسہ بکف　نہ دیوے ماہ کو روٹی یہ آسماں ساری

1۔ ل سے اضافہ　2۔ تمامی = سنہری کپڑا　3۔ طیلساں = چادر　4۔ ل : تیغ خوں چکاں
5۔ ل : لکھا خط اس کو جو

یہ مصحفی نے غزل لکھی اس فصاحت سے
کہ جس پہ کر گئی غش بزمِ دوستاں ساری

387

قاتل کے کُو سے آئے جو ہم نیم جاں لیے
قاضی کے سامنے گئے یہ داستاں لیے

پھرتی ہے اس گلی ہی[1] میں اب تک نسیمِ صبح
مشتِ غبارِ عاشقِ بے خانماں لیے

یاں ہونٹ کاٹنے دانتوں سے اس تیرہ بخت نے
واں خالِ لب نے بوسۂ کنجِ دہاں لیے

وہ مرغِ خوں گرفتہ میں ہوں جس کے شوق میں
طفلانِ شوخ پھرتے ہیں تیر و کماں لیے

از بسکہ انس تھا سگِ لیلیٰ کو اس کے ساتھ
مجنوں کے وہ پھرے ہے ہنوز استخواں لیے

آخر چمن تو لٹنا ہے، نقصان کیا ہوا
دو چار گل جو ہم نے بھی اے باغباں لیے

کیا جنس درد واں سے وہ لاوے گا سوے نجد
جاتا ہے آج ناقۂ حی سارباں لیے

مانی نہ رکھ ورق کو مرقع میں صبر کر
میں اس کی شکل کے ابھی بوسے کہاں لیے

درد و فراق و حسرتِ دیدار اپنے ساتھ
شہرِ عدم کو ہم گئے یہ ارمغاں لیے

رنگِ حیا تو دیکھ کہ عاشق کے ہاتھ سے
ظالم نے عمر بھر نہ کبھی برگِ پاں لیے

یاد آتے ہیں وہ روز کہ پھرتے تھے دیر میں
سر پر سبوے بادہ ہم اے مے کشاں لیے

ہیں عاشقوں کے دیدہ و دل اس کے زیرِ حکم
یعنی اجارے[2] حسن نے کیا کیا مکاں لیے

اک خار بن نے اس کو جگہ شاخ پر نہ دی
بلبل بہت چمن میں پھری آشیاں لیے

باقی نہیں کچھ اس میں، فقط طاقتِ سخن
پھرتی ہے جسمِ مصحفیِ ناتواں لیے

388

مشتِ خاکِ گور سے دست و گریباں ہو گئے
آہ کیا کیا آشنا نظروں سے پنہاں ہو گئے

1۔ ل : گلی میں جو
2۔ اجارے لینا = مکان کرائے پر لینا (پلیٹس)

اس کی انگشتانِ فندق بند کا آیا جو ذکر قطرہ ہائے خوں کئی ہم دست مژگاں ہو گئے
ہجر کی شب جب ترے مجروح پر آئی تو ہائے اس کو دکھ دینے کو یہ تارے نمکداں ہو گئے
مرہم لطف اس نے جو رکھا دریغ ان سے وونہی زخم سینے کے گلِ گلزارِ حرماں ہو گئے
آشیانے پر نہ بلبل کے پڑا اک پھول بھی اور چمن سب آتشِ گل سے چراغاں ہو گئے
اک نگہ نے تیری ڈالا سو مسلمانوں پہ سحر اک ادا میں تیری سو کافر مسلماں ہو گئے
زندگی میں وہ جو دیتے تھے غریبوں کو کفن ان کے لاشے خاک میں دابے تو عریاں ہو گئے
میرے دودِ آہ نے باندھا جو گردوں پر تتق[1] شب ثوابت بھی چراغِ زیرِ داماں ہو گئے
کوڑی کوڑی بکتے ہیں گل کشورِ دہلی کے بیچ حسن کے مالک جو تھے وہ ایسے ارزاں ہو گئے
جس نے کاٹی زندگی زیرِ دمِ تیغِ بتاں جرعہ ہائے خوں بھی اس کو آبِ حیواں ہو گئے
مجھ کو حیرت ہے کہ ان کو ان سے کیا سر چوٹ تھی لختِ دل کیوں رو کشِ لعلِ بدخشاں ہو گئے
روح نے جن کی کیا جا چرخِ اطلس پر قرار فردِ اعلیٰ دفترِ تن کی وہ[2] انساں ہو گئے

اک غزل میں نے لکھی اے مصحفی اب ایسی اور
جس کو سن کر دنگ مرغانِ خوش الحاں ہو گئے

389

منھ دکھا کر بام سے کل وہ جو پنہاں ہو گئے ننگِ رسوائی سے ہم دست و گریباں ہو گئے
تیرہ بختی نے یہ آتش میں ہمیں جلنے دیا آہ ہم پروانۂ دودِ چراغاں ہو گئے
باغ میں لایا جو ہم نازک مزاجوں کو جنوں اوس کے قطرے ہمارے حق میں پیکاں ہو گئے
کچھ اسیری میں ہمیں پرواز یہ بھولی کہ ہم تا بہ دیوارِ قفس اڑنے کو حیراں ہو گئے
کل تو نالے کو ہمارے رخصتِ لب بھی نہ تھی آج کیوں وا خود بخود درہائے زنداں ہو گئے
رکھ دیا خنجر گلے پر تنگ آ کر روزِ وصل رشک کے مارے ہم اپنے دشمنِ جاں ہو گئے
میں نے صحرائے جنوں میں پائی یہ لذت کہ بس آبلوں کی بوسہ گہ خارِ مغیلاں ہو گئے

1۔ تتق = چادر 2۔ل : وے

نام کی فہرست کس کس کے لکھے ہے باغباں سیکڑوں اس باغ میں ہم سے نواخواں ہو گئے
صدمہ ہم نازک دلوں کو زلف کا پہنچا وو نہی بال سنبل کے ہوا سے گر پریشاں ہو گئے
کب ہے مجنوں کی رقابت[1] اس قدر تجھ کو روا آشنا گو تیرے آہوائے حدی خواں ہو گئے
مصحفی افسوس، اس آتش زبانی پر بھی ہم
بزمِ خوباں میں حریفِ آبِ دنداں ہو گئے

390

ہو ناقۂ لیلیٰ کی کیا قیس سے ہمراہی جب طاقتِ پا اس کی کرنے لگے کوتاہی
جو داغِ دل اپنا ہے رہتا ہے ہمیشہ سے آغوش میں ناخن کے جوں فلسِ پرِ ماہی
قاصد کا تو واں جانا موقوف ہے مدت سے اب تو ہی خبر دیجو اے قاصدِ آگاہی
منصور کو سولی پر جس وقت کہ کھینچا تھا ہر سو سے نکلتی تھی فریادِ انا الٰہی
اے خضر قدم رکھے اس پر تو سمجھ کر رکھ خط اس کے زنخداں کا سبزہ ہے سرِ چاہی
زنداں سے نکالا جب قاتل نے پئے کشتن مقتل کی طرف کیا کیا ہم تکتے گئے واہی[2]
جوں مصحفی البتہ عاشق میں سخن کا ہوں
اشکی ہی تخلص ہے یارو نہ مرا آہی

391

اس کے بھی دھیان پر نہ چڑھا رنگِ شاعری سحباں کو ہم سمجھتے رہے ننگِ شاعری
دشمن پہ مارے منھ جو مرا مستفید ہو نہ یہ کہ میرے ساتھ کرے جنگِ شاعری
یہ بھی نئی پسند ہے لعلِ سخن کو چھوڑ گر اب کوئی پسند کرے سنگِ شاعری
ممکن نہیں کہ شہرتِ سعدی مٹا سکے خواجو کا شور و غلغلۂ رنگِ شاعری
ہرگز سنا نہ میں کہ مبارک ہوا کبھی یوزانِ شیر گیر کو آہنگِ شاعری

1۔ ل : رفاقت 2۔ واہی = فضول

دم بند کر دیا مری تحریکِ کلک نے ان کا جو یاں بجاتے رہے زنگِ شاعری

بے عقل تیرے حق میں کہے کچھ تو مصحفی
یہ تو سمجھ چڑھی ہے اسے ننگِ شاعری

392

شاہدِ حسن ترا ڈھونڈے ہے زردار کوئی جنس موجود ہے گر ہووے خریدار کوئی
اس کے کوچے میں سدا مجھ کو نظر آتا ہے بستۂ زلف کوئی، رفتۂ رفتار کوئی
جاوے محرم میں اگر تو بس اتنا کہیو جان دیتا ہے کسی کے پسِ دیوار کوئی
سر ترا تکیۂ بازو پہ سدا رہتا تھا جبکہ رکھتا تھا صنم طالعِ بیدار کوئی
دل کو ہو جائے تسلی تُو گر آکر پونچھے یہ تصور ہی مرے دیدۂ خونبار کوئی
آکے رستم نے گلا اپنا کٹایا تجھ سے تجھ سا دیکھا نہ زمانے میں جو خوں خوار کوئی
شانہ ہر وقت تو کرتا ہے، مجھے یہ ڈر ہے ہو نہ جاوے تری زلفوں میں گرفتار کوئی
حسرتِ دل جو نہ نکلے تو بھلا کیا حاصل لے کے بوسہ جو ترا ہووے گنہگار کوئی
آٹھ آٹھ آنسو نہ کس طرح سے رووے شبنم صبح تک تھا سببِ رونقِ گلزار کوئی
جو عمل میں نے کیا دورِ صلاحیت سے چرخ پیدا تو کرے مجھ سا زیاں کار کوئی
حصۂ مرغِ چمن میں وہی آیا آخر برگِ گل تھا جو خراشیدۂ منقار کوئی
خمِ ابرو کا تصور جو کبھی کرتا ہوں مجھ پہ دوڑے ہے وونہی کھینچ کے تلوار کوئی
دل پہ فرہاد کے کچھ صدمہ نہ گزرا ہو کہ رات نوحہ گر تھا طرفِ دامنِ کہسار کوئی
عکس تیرا یہی کہتا ہے سدا آئینے میں نیچی کرتے ہیں نظر طالبِ دیدار کوئی
شرمِ الفت اسے کہتی ہے کہ مرتے مرتے حرف آیا نہ یہاں بر لبِ اظہار کوئی
پل پڑا دستِ جنوں جامۂ عریانی پر جب گریبان میں باقی نہ رہا تار کوئی
نہ رہا تن میں مگر خون جو گرتا ہی نہیں لختِ دل تجھ سے جواب چشم گہر بار کوئی

سخت دشوار یہ منزل ہے غنیمت سمجھے   بارِ ہستی سے جو ہو جاوے سبک بار کوئی

وہ بھی خود بے خبری میں ہے اسے کیا غم ہے
گو نہ پوچھے خبرِ مصحفیِ زار کوئی

393

دینے لگا جو مجھ کو شب وہ نگار بوسے   گن کر لیے ہیں اس کے لب سے ہزار بوسے

عاشق کی عمر از بس معشوقی میں کٹی تھی   مانگے ہے اب تک اس کی خاکِ مزار بوسے

جب پیاری پیاری صورت اس کی نظر پڑے ہے   آتے ہیں دل سے لب تک ہو بیقرار بوسے

اس رشک سے نہ کیونکر مل جاویں خاک میں ہم   لیتا ہے تیرے رخ کے خطِ غبار بوسے

ترکِ ادب نہ ہو تو ہاں اے تصورِ یار   تیرے لپٹ کے لیجے بے اختیار بوسے

اپنے دہن کو رکھیں ہم ان لبوں پہ کیونکر   ہوتے ہوں مدعی کے جس سے دوچار بوسے

دو گالیاں بھی جس نے ہم سے دریغ رکھیں   مشکل ہے یہ کہ پاویں ہم اس سے چار بوسے

ہاں آگے آگے تو چل لیتا چلے گا پیچھے   نقشِ قدم کے تیرے یہ خاکسار بوسے

رخصت طلب ہے تجھ سے اب مصحفیِ مجنوں
پائے جنوں کو دے اے نوکِ خار بوسے

394

کیوں کہ کہیے کہ ادا بندی ہے   شاعری کیا ہے ہوا بندی ہے

خمِ گیسو کو چھوا تھا کس کے   شب سے گلشن میں صبا بندی ہے

کیوں کہ ہم خون نہ رویں شبِ عید   یار مشغولِ حنا بندی ہے

در پہ بیٹھے ہیں ترے بے زنجیر   یہ عجب طرح کی پابندی ہے

نہیں پڑھتا مرا نسخہ عطار   بسکہ مصروفِ دوا بندی ہے

شوخ مضموں سے حذر کرتے ہیں   شعر میں جن کے حیا بندی ہے

مژدہ اے حسرتِ نظارہ کہ واں گرد چلمن کے ردا بندی ہے
ہر نفس تازہ غزل کہتے ہیں ہر نفس تازہ نوا بندی ہے
مصحفی شعر میں تو یاد ہمیں
زور صورت کی ادا بندی ہے

395

تو پی کہ نہ پی اے دلِ ناکام یہی ہے باقی ہے جو کچھ دُردِ تہِ جام یہی ہے
دکھلا کے قضا دور سے اس کو مجھے بولی غارت گرِ خواب و خور و آرام یہی ہے
جو جو کہ کہا اس نے مجھے غصے میں آ کر میں نے کہا یہ سچ ہے مرا نام یہی ہے
ہم جی ہی پہ کھیلیں ہیں تری جنبشِ لب میں ہاں صاحبِ غیرت کو تو دشنام یہی ہے
پروانہ رخِ شمع پہ ہووے گا نہ صدقے اے گل جو ترا عارضِ گلفام یہی ہے
کیا غم ہے جو مارا بھی گیا عشقِ بتاں میں میں مرد سپاہی ہوں مرا کام یہی ہے
کیا خون میں ڈوبی ہے ترے کشتۂ غم کے مدت سے جو رنگِ شفقِ شام یہی ہے
قاصد تو اسے کہیو دمِ نزع تو اتنا یعنی ترے بیمار کا پیغام یہی ہے
آخر ہوئی جب عمر تو تُو یہ سمجھ اس کو
اے مصحفی خورشیدِ لبِ بام یہی ہے

396

پھر تیغِ جفا ہم پر تم تیز لگے کرنے پھر دل کو لگا لیکر پرہیز لگے کرنے
پھر دامنِ مژگاں ہم گل بیز لگے کرنے پھر خونِ دل اشکوں میں آمیز لگے کرنے
پھر دل سے لگا اٹھنے طوفانِ ہم آغوشی پھر رخشِ ہوس کو ہم مہمیز لگے کرنے
شیریں سے تو کیا کم ہے کیا اس کا تعجب ہے تیری بھی غلامی گر پرویز لگے کرنے
اغیار سے ملنے کا بے ہودہ یہ شکوہ ہے جب اس کی جفائیں سب انگیز لگے کرنے

باتوں کو مری سن کر اس کے شبِ ہجراں میں فریاد کئی مجھ سے شب خیز لگے کرنے

اے مصحفی سن سن کر ہر شام و سحر مجھ کو
طوطی کی طرح کتنے یاں ریز لگے کرنے

397

زخم ہے اور نمک فشانی ہے دوستی دشمنِ جانی ہے
نقشِ اول ہے چہرۂ یوسف اور ترا چہرہ نقشِ ثانی ہے
تیرے کوچے سے مانعِ رفتار ہم کو اپنی ہی ناتوانی ہے
حسن میں چہرہ اس گلِ تر کا نقشِ رنگینِ کلکِ مانی ہے
اس پہ پروانے گو ہجوم کریں شمع کی وہ ہی کم زبانی ہے
اس سرا میں سبھی مسافر ہیں یعنی جو ہے سو کاروانی ہے
عالم اس کی صفا کا مجھ سے نہ پوچھ نظم میں تیری جو روانی ہے

مصحفی شعرِ سادہ کہنے میں
وقت کا اپنے تو فغانی ہے

398

نقاش نے پہلے مری زنجیر نکالی بعد اس کے مرے پانو کی تصویر نکالی
مستی کا تری ذکر کیا میں جو چمن میں سوسن کے ہر اک برگ نے شمشیر نکالی
اے نالہ کیا اور دلِ یار کو پتھر یہ تو نے عجب طرح کی تاثیر نکالی
زنداں سے تو آزاد کیا عشق نے مجھ کو لیکن نہ مرے پانو کی زنجیر نکالی
جب لکھنے پہ آیا، قلمِ شوق نے اپنے ہر لحظہ نئے رنگ کی تحریر نکالی
قاصد نے مرا نامہ دیا اس کو تو اس نے جو سطر پڑھی اس میں بھی تقریر نکالی
حسن اس کا ذرا دیکھ تو تو نے کوئی ایسی شکل اور نہ اے خامۂ تقدیر نکالی

فرقت میں رکھا چرخِ جفا کار نے مجھ کو اچھی گنہِ عشق کی تعذیر نکالی

اے مصحفی سوجھی نہ زلیخا کو قباحت
جو وصل کی صورت سرِ تعمیر نکالی

399

ایک دن وہ تھا کہ چڑھ آتے تھے تپ آئینے سے یا نہیں فرصت اسے اک دم بھی اب آئینے سے
آنکھ[1] واں لڑتی رہے ہے جب نہ تب آئینے سے میری بیزاری کا تم پوچھو سبب آئینے سے
پھر نہ دیکھے اس کو وہ اتنا قباحت فہم ہے عکس میں پیدا ہو گر تحریکِ لب آئینے سے
اس کو کیا کیا ناز و شوخی کی ادائیں یاد ہیں روٹھ جانا، منھ پھرانا بے سبب آئینے سے
وہ دوچارِ حسن و خوبی ہم دوچارِ یاسِ محض روز روشن ہو گیا ہے اپنا شب آئینے سے
سامنے جب اس کے ہوویں دیدۂ حیرانِ قیس دل لگاوے کس طرح ماہِ عرب آئینے سے
سنگ دل کو اس کے اتنا موم کس نے کر دیا ہو گیا جو انس اسے اے میرے رب آئینے سے
سنگ سار ناز خوباں ہیں ہمیں اب چاہیے دل شکستن کا کریں تا واں طلب آئینے سے

مصحفی جاوے خریداری کو گر وہ شاہِ حسن
گنجِ زر پیدا کریں اہلِ حلب آئینے سے

400

وہ[2] کیا بنے گا اتنے میں ہم آپ کیا بنے گو ہم سے سیکھ کر کوئی اب خوش نوا بنے
تک در دل پر ہاتھ کو اپنے دھرے رہو یارو ہمارے درد کی جب تک دوا بنے
سائے میں گو ہما کے ملے اس کو تربیت ممکن نہیں کہ چغد کا بچہ ہُما بنے
بالیدگی قلم میں کہاں اس کے اس قدر مانی سے دخل کیا ہے ترا پشتِ پا بنے
خاک مزار کشتہ مژگان یار سے سبزہ اُگے تو چاہیے دستِ دعا بنے

1۔ یہ غزل نسخۂ ل سے اضافہ ہے 2۔ل سے اضافہ ہے

ہولی کے دن جو بزم میں اس کی گزر کیا رکھتے ہی پانو در پہ کئی آشنا بنے
واقف ہیں اس کے رنگ سے دونوں ہی چاہیے مژگاں کی گل کشی ہی شبیہِ حنا بنے
اچھا تو ہے ترا دلِ پُر درد مصحفی
گر کاروانِ نالہ کشاں کا درا بنے

401

شاخِ گل[1] دیکھ کے قد کو ترے جھک جاتی ہے اب سے لالے کی کلی آگ میں پھک جاتی ہے
عشوہ جب مول لیا ہم نے تو پھر فرق ہے کیا قیمت اک آن میں غمزے کی بھی چک جاتی ہے
اختیار اس پہ کچھ اپنا نہیں اے مصحفی ہاں
یہ طبیعت ہے جو رکتی ہے تو رک جاتی ہے

402

لباسِ جام میں بن صورتِ دہن مٹّی یہ کس کے ہے لبِ میکش پہ بوسہ زن مٹّی
ہم اپنے جامۂ عریاں تنی پہ یوں خوش ہیں کہ جوں شبیہ گلی کا ہو پیرہن مٹّی
عبث تو شیریں پہ مرتا تھا آخرش پسِ مرگ نہ آئی وہ تجھے دینے کو کوہ کن مٹّی
وہ تیرے آتے ہی کنجِ لحد میں اٹھ بیٹھا پڑی تھی جسم پہ جس کے ہزار من مٹّی
جب آب سیب سے گوندھا قضا نے اس کے تئیں تب اس صنم کے ہوئی قابلِ ذقن مٹّی
تری گلی سے ترے نقشِ پا کی بادِ صبا اٹھانے آتی ہے گوئی بہ مکر و فن مٹّی
ملا میں خاک میں یاں تک تری جدائی سے کہ رفتہ رفتہ مرا ہو گیا بدن مٹّی
تب اپنی قبر پہ چادر چڑھانے آیا سہیل لحد میں گل کے ہوا تن پہ جب کفن مٹّی
خدا نے آدمِ[2] خاکی کو خود کیا گویا رکھے تھی ورنہ کہاں طاقتِ سخن مٹّی
دلا تو گورِ غریباں کی جا کے سیر تو کر کہ آوے تجھ کو نظر ساری انجمن مٹّی

1۔ نسخۂ لکھنؤ میں اس غزل کے تینوں شعر ندارد 2۔ ل : آدمی

ذرا تو دیکھ تو فیضِ ہوا سے فصلِ بہار ہمیں دکھاتی ہے کیا کیا چمن چمن مٹّی

غزل اب ایسی تو لکھ مصحفی کہ بن جاوے[1]
شمیمِ گل سے تری نافۂ ختن مٹّی

403

تو زندگی ہی میں اے ننگِ زیست بن مٹّی یہ جان ہووے گا اک دن ترا بدن[2] مٹّی
گلے تلک وہ نہاں ریت میں رہے ہے مدام ہوئی ہے اب ترے عریاں کی پیرہن مٹّی
بنایا مجھ کو تبرک یہ عشق نے پسِ مرگ کہ لے گئے مری تربت کی مرد و زن مٹّی
وہ تیشہ مارے تھا پتھر پہ جب کہے تھی قضا عزیز ہووے کہیں تیری کوہ کن مٹّی
موا ہے نجد میں شاید کہ آج قیسِ غریب بدوش باد لیے جاتی ہے کفن مٹّی
جدا نہیں کسی حالت میں پشت و پہلو سے ہے تیرے خاک نشینوں کا جزوِ تن مٹّی
مرے مزار پہ جس دن سے رکھ گیا ہے تو پانو ہنوز دیتی ہے بوے گل و سمن مٹّی
گرا ہے قیس جہاں آ کے جوشِ الفت میں وہاں کی کھودتے ہیں سینگوں سے ہرن مٹّی
ملائک اس کو عبیرِ کفن کریں ہیں کہ ہے گلی کی تیرے بہ از نافۂ ختن مٹّی

وہ تازہ گل جو نہیں مصحفی تو لگتی ہے
ہماری آنکھوں میں سیرِ گل و سمن مٹّی

404

بے مے و شیشہ ہوا بس کہ کڑی مینہ کی لگی سنگ باراں ہوا ہم پر جو جھڑی مینہ کی لگی
دل پہ رونے کا تصور یہ بندھا رات کہ بس چشم کے سامنے تصویر کھڑی مینہ کی لگی
ہے لبِ لعل سے کس گل کے ہوا عکس پذیر بوندھ ہر اک جو مجھے چُنّی جڑی مینہ کی لگی
بدگمانی نے ہمیں خوب رلایا شبِ ہجر دیر قاصد کو جو واں کوئی گھڑی مینہ کی لگی

1۔ ل : پہنچاوے 2۔ل : وطن

سنگ یہ ہاتھ میں کس ترک پسر کے ہے یہاں جس کے آتے ہی بس آنکھوں سے جھڑی مینہ کی گھڑی

گھر کی دیوار مرے مصحفی ناقص ہے اسے
اب کی برسات میں بوچھاڑ پڑی مینہ کی لگی

405

نسیمِ گل سے مجھے بوے یار آتی ہے گلی سے کس کی یہ بادِ بہار آتی ہے

کیا ہے خاک کو نم اس کے اشکِ شبنم نے چمن سے تب تو ہواے غبار آتی ہے

الٰہی تو مجھے جیتا نہ رکھیو اس دن کو سنا ہے میں کہ شبِ انتظار آتی ہے

قدم کو رکھ کے مری خاک پر وہ یہ بولا کہ اس زمین سے بوے مزار آتی ہے

تو آہوؤں کے تئیں مژدہ دے یہ اے مجنوں کہ لیلیٰ آج بہ عزمِ شکار آتی ہے

ترا بھی کیا کسی گل سے لگا ہے دل سچ کہہ چمن میں کیوں تو صبا، بار بار آتی ہے

یہ کس نے کھولی ہے دریا پہ کاکلِ پیچاں جو موج دوڑی ہوئی بیقرار آتی ہے

گیا ہے کیا کوئی دشتِ جنوں سے آبلہ پا جو آج سرخ نظر نوک خار آتی ہے

ستی[1] نہ خانۂ زیں پر ہے آج بال کھلے پری بہ تختِ سلیماں سوار آتی ہے

ہوا ہے مصحفی گم اس قدر کہ یاروں کو
اب اس کے نام کے لینے سے عار آتی ہے

406

دور سے گر کہیں صحرا میں غبار اٹھتا ہے لیلیٰ وہ آئی یہی قیس پکار اٹھتا ہے

حاکم نامیہ[2] معزول ہوا ''دے'' آیا اب چمن سے عملِ فصلِ بہار اٹھتا ہے

بیم جاں سے کوئی جاتا جو نہیں اس کے قریب[3] کشتۂ ناز ترا روزِ شمار اٹھتا ہے

1۔ ستی = شریف نیک عورت مراد ہے 2۔ نامیہ = قوتِ نمو مراد بہار

3۔ ب : قرین، پ: جاتا نہیں اب اس کے قریں

ساتھ جس حسرت و حرماں کے چلا تو افسوس
یوں بھی دنیا سے کوئی اے دلِ زار اٹھتا ہے

تا نہ ہو دن کو وہ باعث تری رسوائی کا
تیرے کشتے کا جنازہ شبِ تار اٹھتا ہے

اپنے بالوں کی ادھر تار رواں کر دیویں
فتنہ جس سمت سے اے کاکلِ یار اٹھتا ہے

اہلِ کاوش ہیں سدا لازمِ نازک طبعاں
پہلوئے گل سے سنا ہے کہیں خار اٹھتا ہے

جس بیاباں میں ترے کشتہ کا مدفن ہے ہنوز
خونِ منصور کے واں دعوے کو خار اٹھتا ہے

تشنۂ شربتِ[1] دیدار ترا حشر کے دن
آرزومندِ مےء بوس و کنار اٹھتا ہے

مشتعل گر نہیں مدفوں کی ترے آتشِ دل
کیوں دھواں سا بہ سرِ خاکِ مزار اٹھتا ہے

مصحفی پھر قلق اس کا مجھے کرتا ہے تباہ
ٹک بھی پہلو سے جو دستِ دلِ زار اٹھتا ہے

407

بہ پیری اگر ہم جوانوں میں بیٹھے
تو غمگین سے شادمانوں میں بیٹھے

توانا جو تھے وہ ہوئے کب کے راہی
ہم اک رہ گئے ناتوانوں میں بیٹھے

جو جا پاتے ہم ہو کے دو دائیں بائیں
فسوں پھونکتے اس کے کانوں میں بیٹھے

صدا دل شکستوں کی تب یار سمجھا
کئی تیر جب استخوانوں میں بیٹھے

میں کس طرح دیکھوں رقیبوں کی شوخی
کہ لیں چٹکیاں تیری رانوں میں بیٹھے

گیا برق جولاں جو بازار سے وہ
تماشائی رہ گئے دکانوں میں بیٹھے

زباں منہ میں رکھتے ہیں میاں مصحفی ہم
رہیں کیونکہ پہرے زبانوں میں بیٹھے

408

دو قدم بھی جو کبھی ہمرہِ جاناں چلیے
عزتِ عشق کہے پس سوئے زنداں چلیے

1۔ ب : تشنہ

چاہتی ہے یہی آبِ دمِ شمشیرِ نگاہ تشنہ حلقوم پہ جوں خنجرِ برّاں چلیے
پاسِ ناموس یہ رخصت نہیں دیتا کہ کبھو داد خواہی کے لیے تا درِ سلطاں چلیے
چاکِ دامن کو پہنچتا ہے گریباں سے کوئی تو یہ کہتا ہے کہ پھر سوے گریباں چلیے
قوتِ بازوے قاتل جو مدد فرما ہو
زخم ہو کر پے تاراجِ نمکداں چلیے

409

بہار آئی ہے اور اس پر یہ اپنی خوش نصیبی ہے کہ ہر دوکان پر خالی دھری پھولوں کی چھبی ہے
برائے امتحاں یاں ہم بھی اک بیمار لائے ہیں کریں صرف اس پہ جتنی ان طبیبوں کی طبیبی ہے
ادب کرتے ہیں چوبِ گل سے دیوانے کو اس رُت میں صبا بہرِ خدا یہ بھی کوئی طرزِ ادیبی ہے
کریں گے من چلوں سے زور کیا یہ نازنیں لڑکے گُس اور بَل ان میں جتنا ہے وہ صرفِ جامہ زیبی ہے
کہو اس شوخ سے اوروں کو کھینچے دار پر ظالم تری زلفِ چلیپا ہی ہمیں خطِ صلیبی ہے
شبِ وصل ایک دن اپنا گلہ کہہ دیں گے خنجر پر یہی ہم ساتھ کہ اس پاکبازی کی رقیبی ہے
گلہ کس کا کریں میاں مصحفی ہم ہجر کی شب میں
خود اپنی دشمنِ جاں آہ اپنی ناشکیبی ہے

410

برق چمکے جو چمن میں ترے رخساروں سے جا لگے مرغِ چمن باغ کی دیواروں سے
دوریِ گل سے مگر صدمہ قفس میں پہنچا نو اسیروں کے جو خوں ٹپکے ہے منقاروں سے
حاجتِ رشتۂ گلدستہ نہیں کچھ اس کو کفر ظاہر ہے رگِ گل ہی کے زناروں سے
کتنے ناداں ہیں کہ اس انجمنِ فطرت میں بیہشی مانگنے ہم آئے ہیں ہشیاروں سے
غم بڑا یہ ہے کہ اس فصلِ بہار آنے تک کوئی جیتا نہ بچا تازہ گرفتاروں سے
لیلتہ القدر کا فیض ان کو ملا ہو شاید کوئی پوچھو تو شبِ ہجر کے بیداروں سے

نہ پھرا آنکھ کہ ہم سنتے ہیں جاتی ہی رہی
طاقتِ آہ تری چشم کے بیماروں سے

411

رفتنی ہیں، ہونٹوں پر جاں کوئی دم کی ضیف ہے
جس کو جی چاہے تھا اپنا وہ نہ آیا حیف ہے

دیکھتے ہی اس کے، ہم مارے پڑے، جانا نہ یہ
سرمۂ دنبال دار اس کا پٹایا سیف ہے

خالِ پشتِ چشم نے اس کے جو رکھی حُب دریغ
عندلیبِ طبع اپنا رات دن بے کیف ہے

لالۂ افیونیِ گلزار ہی نالاں نہیں
چشمِ نرگس کو بھی میں دیکھا تو وہ[1] بے کیف ہے

ہو مجرد، جامۂ عریاں تنی[2] بھی پھونک دے
چاہیے ملبوس کیا تجھ کو یہ فصلِ سیف[3] ہے

فارسی گویوں کو تجّ ہم عالموں کو مصحفی
کیونکہ واں چون و چرایاں ذکرِ کم و کیف ہے

412

اس کے خیال نے جو شب مجھ سے صلح کی تھی
صبح اپنے ساتھ مجھ کو اک جنگِ زرگری تھی

شاید نہا گیا تھا دریا میں وہ کہ جس پر
لہروں کے بیچ باہم تلوار چل رہی تھی

گر خاک بھی ہوا وہ تو بھی نہ ساتھ چھوڑا
ناقے کے ساتھ از بس مجنوں کو رفتگی تھی

گو راستی پہ آئی چینِ جبیں و لیکن
اس پر بھی وہ نہ نکلی ابرو میں جو کجی تھی

وہ تلخ کام ساقی ساغر میں بھر کے لانا
جو ہم کہیں کہ ہم نے ایسی کبھی[4] نہ پی تھی

مے پینے سے وہ عارض کیا اور ہو گئے تھے
اک نازکی کی ان پر تہ سی چڑھی ہوئی تھی

زلفِ دراز کا جو قصہ لکھا نہ تو نے
کلکِ زباں بریدہ پہ تیری کوتہی تھی

کوئی گرفتہ دل کیا آیا تھا شب چمن میں
دیکھا جو غور سے میں جو پھول تھا کلی تھی

اس گل کا رنگ عارض کیا کیا نہ رنگ لایا
پوچھے کوئی صبا سے جو اس میں نازکی تھی

1۔ ب: کی 2۔ ل، ب: جامہ عریاں کو اپنے 3۔ضیف = مہمان 4۔ ب: کڑی

کنجِ لحد میں جا کر ہم یاد یہ کریں گے — اک چند روز ہم کو نالے سے ہمدمی تھی
بس دیکھتے ہی اس کو ہم ہو گئے پریشاں — گویا بلا[1] یہ تیری زلفوں کی درہمی تھی
کیوں آبِ تیغِ قاتل تو نے پیا نہ اے خضر — تجھ کو عزیز ایسی کیا اپنی زندگی تھی

برچھی سے اس نگہ کی ہم مصحفی بچ آئے
مرنے میں کیا رہا تھا، کچھ اپنی زندگی تھی

413

لگے جو ہاتھ ہمارے لیے زمیں کوئی — تو پکڑے ہاتھ کوئی، کھینچے آستیں کوئی
نقابِ مہرِ درخشاں نہ ہو سکے افلاک — چھپے ہے پردوں میں وہ روے آتشیں کوئی
کہوں تو کس سے کہوں اپنا دردِ دل میں غریب — نہ آشنا، نہ مصاحب، نہ ہم نشیں کوئی

گئی ہے عقل مگر چرخِ بے مروّت کی
مسافروں پہ بھی کھینچے ہے تیغِ کیں کوئی

414

طرح اولے کی جو خلقت میں ہم آبی ہوتے — اپنے ہی واسطے بنیادِ خرابی ہوتے
وہ جو سوتے ہیں فراغت سے انھوں کے سینے — کاش یک شب ہدفِ تیرِ شہابی ہوتے
مے نہ پیتے کبھی گلزار میں ہم یار بغیر — پھول شبّو کے جو یکدست گلابی ہوتے
دل سے گردِ غمِ کونین تو دھوئی جاتی — کاش ہم کشتۂ شمشیرِ دو نابی ہوتے
گر سمجھتے وہ کبھی معنیِ متنِ قرآں — چہرے شرّاح کے ہرگز نہ کتابی ہوتے
عمر کے فوت کا ہم مرثیہ پڑھتے جو کبھو — آن کر خضر و مسیح اپنے جوابی ہوتے
اپنی قسمت میں تو محرومیِ جاوید تھی آہ — ورنہ ہم شیفتۂ روے نقابی ہوتے
رو کشی کرنے کو ہم بحر سے جاتے مجنوں — آبلے پاے جنوں کے جو حبابی ہوتے

1۔ ب: گویا بلاے مبرم

آتشِ دل ہی فروزاں نہ ہوئی ورنہ ہمیں
الفِ تیغ بتاں سیخ کبابی ہوتے

ہم کو دشوار تھا پھر روے زمیں پر رہنا
کوکبِ بخت ہمارے جو شہابی ہوتے

کوے عشاق سے گزرا نہ وہ کافر ورنہ
لوگ رستے کے بہ تقلید شرابی ہوتے

ماہ ہی بس ہے ہمیں گو کہ نہ ہووے خورشید
زردہ کیوں ڈھونڈتے فرنی کی رکابی ہوتے

نیم رنگ اس کی حنا دیکھ نہ مرتے گر ہم
پھول تربت کے ہمارے نہ گلابی ہوتے

مصحفی نالہ خموشی سے کیا میں نے بدل
تا کجا تارِ نفس تارِ ربابی ہوتے

415

بحث اس کی میری وقتِ ملاقات بڑھ گئی
باتیں ہوئیں کچھ ایسی کہ بس بات[1] بڑھ گئی

بولا نہ مرغِ صبح نہ آئی صداے آہ
یا رب شبِ فراق کی کیا رات بڑھ گئی

اصلاح بھی ضروری ہے اب اس کی شیخ جی
داڑھی تمھاری قبلۂ حاجات بڑھ گئی

پہنچے تھا اپنا دستِ ہوس جس پہ گاہ گاہ
وہ شاخِ میوہ دار بھی ہیہات بڑھ گئی

شملہ رکھا جو دوش پہ لنگور کی سی دُم
کیا اس میں شیخ جی کی کرامات بڑھ گئی

جس دن سے ان پہ پردۂ پوشیدگی پڑا
اس دن سے قدرِ عالمِ جنات بڑھ گئی

دیں گالیاں جو تو نے صنم اک غریب کو
کیا گالیاں دیے سے تری ذات بڑھ گئی

دے مصحفی کو نعمت و دولت تو اے کریم
تا سب کہیں کہ اس کی اب اوقات بڑھ گئی

416

پردہ جو اٹھا رخ سے شبِ تار سدھاری
آنکھیں جو کھلیں حسرتِ دیدار سدھاری

کوچہ ہے یہ کس کا کہ جہاں آتے ہی ناگہ
پانو سے مرے طاقتِ رفتار سدھاری

1۔ ب :رات

ہمسایہ میں اس کا جو ہوا گریے سے میرے | برسات نہ آئی تھی کہ دیوار سدھاری
تھا نوحہ لبِ زمزمہ سنجانِ چمن پر | شب باغ سے کیا نرگسِ بیمار سدھاری
گر[1] بوسہ ستانی یہ رہی غنچہ و گل کی | یہ جان لے بلبل تری منقار سدھاری
گرتے ہی مرے ٹوٹ گئی ہو کے دو ٹکڑے | ایدھر میں، اُدھر آپ کی تلوار سدھاری
گر جوش خریدار یہ ہے کوچے میں اس کے | تو دیکھیو تم رونقِ بازار سدھاری
پائی نہ شبِ وصل بھی کچھ ہم نے تمتّع | افسوس کہ یوں دولتِ بیدار سدھاری
تصویر تری سامنے میرے جو کھڑی تھی | آخر وہ مجھے کر کے گنہگار سدھاری
ہے آج نسیمِ سحری صبح سے غائب | شاید طرفِ مرغِ گرفتار سدھاری
خسرو نے کیا چاک گریبان غضب ہے | شیریں طرفِ دامنِ کہسار سدھاری
رینی[2] سی ٹپکتی نہیں تیری جو یہ مژگاں | بدلی ہی وہ اے چشمِ گہربار سدھاری
کیا سر کے ترے بال پڑے دیکھے کمر پر | خجلت سے عدم کو جو شبِ تار سدھاری
دل کیوں نہ مکدر ہو کہ بس آتے ہی خط کے | تیری وہ صفا آئینہ رخسار سدھاری
ہے روح کے کاندھے پہ گراں تن کا علاقہ | جس وقت ہوئی اس سے سبکسار، سدھاری
میں بیٹھ گیا تھک کے تو ہمت مرے دل کی | کعبے کے تئیں ہمرہِ زوّار[3] سدھاری

اے مصحفی اب میں ہوں بس اور گوشۂ صحرا
ہم سائگیِ کافر و دیندار سدھاری

417

شاہد حی کے گلے میں ہے حمائل بھاری | پشتِ جمازہ[4] پہ کیوں کر نہ ہو محمل بھاری
ہوں ابھی بیچ میں دریا کے یہ ڈر ہے نہ کرے | میری کشتی کو غمِ دوریِ ساحل بھاری
حشر کے دن بھی ترا کشتہ نہ تربت سے اٹھا | بسکہ چھاتی پہ رہی اس کے دھری سِل بھاری

1۔ ب، ل: گو......غنچہ و گل پر 2۔ نسخۂ بنارس میں ندارد 3۔ زوّار= زیارت کرنے والا 4۔ جمازہ= تیز رو

دل ترے پانو تلے مفت میں پس جاوے گا — پہنیو کفش نہ اے حور شمائل بھاری
کیا سروگردنِ عاشق سے اٹھے بوجھ اس کا — دستِ قاتل پہ ہو جب خنجرِ قاتل بھاری
یادِ لیلیٰ نے رلایا جو بہر گام اسے — قیس پر نجد کی دونی ہوئی منزل بھاری
مردمِ چشم سے کیونکر وہ کنارا نہ کرے — جب نزاکت سے ہو عارض پہ ترے تل بھاری
ٹھہر اے سلسلہ جنبانِ قیامت کوئی دم — جنبشِ پا سے ترے ہے سرِ محفل بھاری

مصحفی تو لکھ غزل اک اور بھی تو لنگر دار
تا کہ اس بحر کا ہو دامنِ ساحل بھاری

418

پہنے جوڑا جو تو اے حور شمائل بھاری — پہلے رکھ لے مری تربت پہ بھی اب سل بھاری
گو گراں خاطرِ شاہدِ حی پنہاں ہے — راہ جاتوں کو نظر آئے ہے محمل بھاری
ہے بنا شیر کی صورت کا نہ جڑنا اس کو — کہ یہ قبضہ ہے تری تیغ پہ قاتل بھاری
لے چلوں بزم میں کیا اس کے تجھے اے ہمدم — واں تو ہو جاوے ہے خود مجھ پہ مرا دل بھاری
خوشیِ زخم سے تن پھول گیا ہے اس کا — فربہی سے نہیں اس تیغ کا بسمل بھاری
پانو رفتار سے مجنوں کے تھکے یا قسمت — ہو گئی ریگِ رواں کی بھی سلاسل بھاری
صورتِ نور جہاں ہووے نہ اس کا پاسنگ — کوہِ تمکیں ہے ترا حور شمائل بھاری
سنگِ طفلاں سے تسلی نہیں گر اے مجنوں — سر سے دے مار اٹھا کر تو کوئی سل بھاری
نجد کی راہ ہی کچھ طے نہ ہوئی ناقے سے — ورنہ اتنا تو نہ تھا لیلیٰ کا محمل بھاری

مصحفی جوں جوں چلوں راہ نبڑتی ہی نہیں
پیش آئی ہے عجب طرح کی منزل بھاری

419

پانو ناقہ کے تھکے اور نہ محمل بھاری — درد دل مجھ پہ تو کی تو نے یہ منزل بھاری

کیا کوئی رطلِ گراں تو نے کہیں نوش کیا
پانو پڑتا ہے ترا آج جو قاتل بھاری

جب سے دریا پہ تو بیٹھا ہے ہوا ہے اے ماہ
کوہِ تمکیں سے ترے پلّۂ ساحل بھاری

زیرِ دیوارِ چمن دفن نہ کرنا تھا مجھے
سایہ اس کا ہے[1] مری چھاتی پہ جوں سل بھاری

تن کا یہ حال ہے بارِ غمِ دنیا سے کہ جوں
گٹھری کاندھے پہ دھرے رہرو عاجل[2] بھاری

کیا ستم اور ہوا کچھ کسی زندانی پر
کان، کیوں لگتی ہے آوازِ سلاسل بھاری

اس ادا کا ہوں میں کشتہ کہ چھڑی پھولوں کی
ہے تری نازکیِ دست پہ قاتل بھاری

قیس ہے نزع میں اے ناقہ سبک گامی کر
ڈھل گیا دن کہیں ہو جاوے نہ محمل بھاری

اپنے کشتہ کے اٹھانے کی تو کر فکر شتاب
اب زمیں پر ہے مری جان یہ بسمل بھاری

مصحفی بات نہ کر باغ میں زالہ بر سے
کان کو لگتی ہے آوازِ عنادل بھاری

420

بن رہی جی پہ مرے مجلسِ خوباں میں ہے
پر سراسیمہ یہ پروانہ چراغاں میں ہے

خال جو نیل کا لیلیٰ کے زنخداں میں ہے
نقطہ اس خال کا مجنوں کی رگِ جاں میں ہے

مہِ کنعاں کا ٹھکانا نہیں لگتا جو ہنوز
سرِ اندیشۂ یعقوب گریباں میں ہے

کر دیا اس نے پری کے بھی تئیں دیوانہ
یہ بلا سحر تری جعدِ پریشاں میں ہے

آج پہلو میں مرے درد سا کچھ ہوتا ہے
دل کسی شخص کا شاید ترے پیکاں میں ہے

اے فلک اور کوئی زخم لگا لے جلدی
ابھی چٹکی مری قاتل کے نمکداں میں ہے

شفقِ شام کی کشتی نہیں دیکھی ہے تو دیکھ
کش مکش زور ہی رنگِ مسی و پاں میں ہے

گرد ہر گل کے صبا ہوتی ہے صدقے سو بار
اس لطافت کی بہار اب کے گلستاں میں ہے

چشمِ موسیٰ نہ یہاں تابِ تجلی لاوے
حوصلہ دید کا تیری نہ ہر انساں میں ہے

1۔ ب : یہ ہے چھاتی پہ   2۔ عاجل = عجلت کرنے والا

دیکھنا لختِ جگر رووِیں گے کیا کیا عشاق آج آویزۂ یاقوت[1] ترے کان میں ہے
مجھ سے دیوانے کی سنتا نہیں ہرگز کوئی[2] ورنہ کیا کیا نہ ہنر بے سروسامان میں ہے
داد خواہی کو مگر آئے گا مقتول ترا آج انبوہ بڑا حشر کے میدان میں ہے
اس کی تصویر پہ کیونکر نہ پری مر جاوے چشم پوشی کی نگہ دیدۂ حیران میں ہے
ہیں جو اطفال محلے کے یہی کہتے ہیں سیر نظارہ کی لیلیٰ کے دبستان میں ہے
سرک اے موج سلامت تو رہِ ساحل لے تجھ کو کیا کام جو کشتی مری طوفان میں ہے
مصحفی دیدۂ انصاف سے دیکھے تو اگر
ہر غزل سحرِ مجسّم مرے دیوان میں ہے

421

خندۂ لب سے ترے بجلی کی چتون لڑ گئی کیوں نہ شمشیرِ قضا سے اپنی گردن لڑ گئی
ایک چشمک کے رہے ہم منتظر بیرونِ در اور وہاں آنکھوں سے اس کی چشمِ روزن لڑ گئی
اس گھڑی چاکِ قفس سے آئے کیا کیا گل نظر نورتن سے اس کے بازو کی جو چلمن لڑ گئی
مجھ کو تو اس کے شکم ہی کی صفا سے کام تھا ناف سے کیوں اس کی ناحق آنکھ، دشمن لڑ گئی
نالہ درد آمیز تھا اس کا اٹھی دونی صدا جب دلِ رہباں سے ناقوسِ برہمن لڑ گئی
سطحِ کشتی پر اٹھا جب رقص کو دو لاکھ بار موجِ دریا سے سنجافِ زیرِ دامن لڑ گئی
آتش افروزی سے دو دل کے حذر کر مصحفی
برق سوزاں ہے جو طبعِ سنگ و آہن لڑ گئی

422

کچھ صبا کوچے سے اس کے جو چھپا کر لے گئی شاید اس کی مشتِ خاکِ پا اڑا[3] کر لے گئی
سو گئے بخت اپنے کچھ ایسے کہ اک شب بھی مجھے اس کے کوچے میں نہ بیتابی جگا کر لے گئی

1۔ ب : یعقوب (سہو کاتب) 2۔ ب: سنتا ہی نہیں بات کوئی 3۔ ل ، ب : اٹھا

میں اگر پاس اس کی کشتی میں کبھی بیٹھا تو موج — جانبِ ساحل مری کشتی بہا کر لے گئی
اے اجل شکوہ کروں کیا تجھ سے میں تُو تو مجھے — ہستیِ موہوم کا نقشہ دکھا کر لے گئی
مجلس خوباں میں مَیں کھویا گیا ہوں کیا کہوں — کس کی دزدیدہ نگہ دل کو چرا کر لے گئی
اس نے جب بالوں کا جُوڑا اپنا کھولا بہرِ غسل — موج ساحل پر بلائیں اس کی آ کر لے گئی
تھا جو چشمِ باغباں میں تیرے عارض سے شبیہ — باغ سے آخر صبا وہ گل اڑا کر لے گئی
اک پری کی سی جو صورت آئی اس در سے بروں — میں نہ جاتا تھا، مجھے گھر سے بلا کر لے گئی
دیدۂ مجنوں میں ہرگز حور نے پائی نہ جا — گو سفارش نامۂ لیلیٰ لکھا کر لے گئی
وہ نہ آیا، گرچہ سو سو بار لیلیٰ کی طلب — واسطے مجنوں کے ناقہ کس کسا کر لے گئی
میں تو روٹھا تھا نہایت باغباں سے کیا کہوں — نکہتِ گل باغ میں مجھ کو منا کر لے گئی
شب کی شب بزمِ چمن میں رہ گئی فصلِ بہار[1] — شبنم اپنا رخت پھولوں میں بسا کر لے گئی

میں تو مقتل میں نہ جاتا تھا وہ تیغِ آبدار
مصحفی سر کی مرے سوگند کھا کر لے گئی

423

ہم کو کیا دامِ گرفتاری عزیزاں چاہیے — دوش پر بس کاکلِ خوباں پریشاں چاہیے
تیرہ بختی کا برا ہووے کہ جس کے واسطے — روز کرنی منّتِ شب ہائے ہجراں چاہیے
گھر سے جب نکلے تو پھر کیسا خیالِ خانماں — اہلِ جوہر صورتِ شمشیر عریاں چاہیے
کھیلنا جی پر کٹھن ہے معرکہ میں عشق کے — اس جگہ رستم سا کوئی مردِ میداں چاہیے
خاکساری سے مزے ہم نے اٹھائے ہیں بہت — باد کا ہم خانہ ویرانوں کو طوفاں چاہیے
ژالہ باری سے تیری ڈرتے ہیں کب اے ابر ہم — سر پہ ہم لوگوں کے دامانِ گلستاں چاہیے
آبداری پر بہت آئے ہیں وہ یاں خوردہ لب — کچھ تو کم ہو قیمتِ لعلِ بدخشاں چاہیے
باغ میں جاؤں میں دیوانہ تو گل کہنے لگے — لیجیے مجھ سے اگر چاکِ گریباں چاہیے

1۔ ب : کہ پھر فصلِ بہار

ساغرِ مے ہاتھ میں میرے نہ ہو تو گو نہ ہو میں ہوں کافر مجھ کو اک ناقوس رہباں چاہیے
بے لفافہ میں نے خط لکھ کر اسے بھجوا دیا نامۂ عاشق کو کہتے ہیں نہ عنواں چاہیے
ابر سے منّت کشی کرنے کو جاتی ہے بلا بارور[1] ہونا ترا اے نخلِ حرماں چاہیے
خاکساری سے مرے عالم ہے میرے حکم میں مور کو کیا خاتمِ دستِ سلیماں چاہیے
شال سے گزرا کوئی دُھسّا[2] کوئی ہو یا گلیم کچھ تو پوشش کے لیے فصلِ زمستاں چاہیے
سن کے چپ رہنا مرا کیا کوئی جی میں شاد ہو یاں زبانِ اہلِ معنی زیرِ دنداں چاہیے
زندۂ جاوید ہیں جو اس کے آبِ تیغ سے ان ذبیحوں کے تئیں کیا آبِ حیواں چاہیے
تا نہ عاشق کا گزر اس کی گلی میں ہو کبھی اک نیا روز اس کے دروازے پہ درباں چاہیے

مصحفی اس نظم کا رتبہ سمجھتے کیا ہیں یار
داد دہ اس کا کوئی اہلِ صفاہاں چاہیے

424

ہچکیاں رونے میں گو دو دو پہر لیتا ہے کون زندانیِ الفت کی خبر لیتا ہے
بعد آدم کے ملی دولتِ آدم مجھ کو حق ہے اس کا جو پسر مالِ پدر لیتا ہے
پرزے اڑ جاتے ہیں لاکھوں ہی گریبانوں کے نالہ جب ہاتھ میں دامانِ اثر لیتا ہے
تیرے عاشق کو نہیں مرگ کی پروا اے بت اپنی چھاتی پہ وہ سِل جیتے ہی دھر لیتا ہے
کیا خبر ہے تجھے واں اوٹ میں جھاڑوں کی کھڑا گل کے بوسے کوئی اے بادِ سحر لیتا ہے
وہ تو محروم ہے لیکن مرے نظارے سے چشمِ عاشق کے مزے روزنِ در لیتا ہے
بیچنے آئے ہیں اشکِ سرِ مژگاں عاشق جوہری مول کو یہ سلکِ گہر لیتا ہے
نہیں بازارِ محبت میں خریداریِ دل خام ہے بسکہ، کوئی کم یہ ثمر لیتا ہے

مصحفی سے نہ رک اے غیرتِ ماہ و خورشید
گو بلائیں وہ تری شام و سحر لیتا ہے

1۔ ب : یارو 2۔دھسّا = موٹی چادر

425

تربیت کا دلِ ناصاف اثر لیتا ہے
لوحِ خارا کو کوئی آئینہ کر لیتا ہے

شاخِ طوبیٰ نہ قلم ہوں کہ شبِ ہجر کے بیچ
آہ سے نالہ مرا کارِ تبر لیتا ہے

بوسہ زن آبلے ہوتے ہیں اسی کے رخ سے
پشتِ پا کی مرے جو خار خبر لیتا ہے

سعی کر سعی کہ حاصل ہو نتیجہ اس کا
عشق یاں بیدِ مولّہ سے ثمر لیتا ہے

طائرِ دل کو نہ سینے سے لگا لو، یہ اسیر
ٹک ہوائے قفسِ زخمِ جگر لیتا ہے

قبر پر جس کے دھرے ہے تو قدم وہ مردہ
پانو اٹھا کر کے تری آنکھ پہ دھر لیتا ہے

نازِ بالش کا مگر شوق ہوا ہے گل کو
باغباں مول اسیروں کے جو پر لیتا ہے

سرقۂ دہر سے ایمن ہیں جو ہیں عالیجاہ
کب ثریّا[1] سے کوئی دُرجِ گہر لیتا ہے

سر کے بال ایسے ہیں نازک ترے اے رشکِ پری
جن سے اصلاح ترا موئے کمر لیتا ہے

مصحفی گو کوئی بیگانہ ہو وہ حور مثال
وونہی دو بات میں اپنا اسے کر لیتا ہے

426

لطف کیا عشق میں جینے کا جو حاصل نہ ملے
کاٹ ڈال اپنا گلا آپ جو قاتل نہ ملے

دست و پا قلزمِ غم میں کوئی کیا مارے کہ ہائے
یہ وہ دریا ہے کہ جس کا کہیں ساحل نہ ملے

خواہشِ وصل تو رکھتا ہوں بہت جی میں ولے
کیا کروں میں جو مرے دل سے ترا دل نہ ملے

زلفِ مقطوع[2] کا ہو اس کی تصور جس کو
شام ہو جاوے اسے راہ میں منزل نہ ملے

ہووے اے سروِ سہی جب نہ تری طرزِ خرام
خاک میں کیونکہ ترا عاشقِ مائل نہ ملے

سیکھ لے ناقہ جو رفتار سے لیلیٰ کے فریب
قیس کو حشر کے دن تک کبھی محمل نہ ملے

یہ غضب ہے کہ مرقع سے جہاں کے ہم کو
ورقِ حسن کوئی سیر کے قابل نہ ملے

1۔ ب: کب ترے پاسے 2۔ مقطوع = بریدہ

مصحفی کیوں نہ ہو دشوار اسے راہِ سلوک
مردِ سالک کو اگر مرشدِ کامل نہ ملے

427

ہیں پروں سے صفِ عشاق کے میداں خالی — کس کماں کش نے کیے ترکشِ مژگاں خالی
خونِ دل بھرتے ہیں اس میں جو نبڑ جائے ہے — کبھی ہوتا ہی نہیں ساغرِ مستاں خالی
خاک دل شاد ہو، مجنوں کا کبھی جانبِ حی — لے گیا نجد سے ناقہ نہ حدی خواں خالی
کون میکش ہے فلک پر جو سدا ہوتا ہے — بادۂ نور سے کاسِ مہِ تاباں خالی
دردِ پہلو ہے مرا زخم طلب مانو کہا — سینگیاں اس پہ نہ کھنچواؤ طبیباں خالی
سامنے[1] سے جو ترے تیر کو آتا دیکھا — خانۂ زیں کو کرے رستم دستاں خالی
کھینچوں کیا یار کا دامن کہ مرا پنجۂ عزم — دستِ قدرت سے ہے جوں بہلۂ[2] ترکاں خالی
نہ رہی ضبط کی طاقت تو وونہی مجنوں نے — رو دیا دیکھ کے لیلیٰ کا دبستاں خالی
مجھ تلک آئی جو نوبت نمک افشانی کی — تھا مرے زخم کے طالع میں نمکداں خالی
کس نے خوش چشمیِ لیلیٰ کا کیا ذکر ان سے — کر گئے نجد کا صحرا جو غزالاں خالی
ایک جاتا ہے تو آتا ہے عوض اس کے اور — کبھی ہوتی نہیں یہ منزلِ ویراں خالی
سخت ہنگامہ ہے پیچھے ترے دیوانے کے — سنگریزوں سے نہیں دامنِ طفلاں خالی
تیغِ قاتل کا بھی احساں نہ اٹھایا ہم نے — پیشتر عید سے ہم کر گئے زنداں خالی
ہم کو صیاد نے دی رخصتِ پرواز اُس دم — غنچہ وگل سے ہوا جب کہ گلستاں خالی

مصحفی تجھ پہ مجھے آئے ہے غصہ اب تو
اس قدر شغلِ تعشق سے ہو انساں خالی

1۔ ہر نسخے میں: ''سامنے سے جو تری کو آتا ہے دیکھے'' (قیاس سے تصحیح کی گئی)

2۔ بہلہ = دستانہ

428

عارف کا دل چراغِ محفل نہیں تو کیا ہے
سب اس کی روشنی ہے دل دل نہیں تو کیا ہے

آپ ہی تڑپ تڑپ ہم کام اپنا کر رہیں گے
سر پر ہمارے یارو قاتل نہیں تو کیا ہے

حلقِ بریدہ کی سب نکلی ہے اس میں صورت
یہ لالۂ شہیدی بسمل نہیں تو کیا ہے

لیلیٰ کے نام سے بھی ہوتی ہے اس کو وحشت
مجنونِ عشق پیشہ جاہل نہیں تو کیا ہے

جانا تو اس گلی میں آساں ہے پر ادب سے
پانو کو سر پہ رکھنا مشکل نہیں تو کیا ہے

یہ رنگ تھا کب اس کا تم غور سے تو دیکھو
مہندی میں خون میرا شامل نہیں تو کیا ہے

ہر صبح کاسہ بر کف نکلے ہے مُو پریشاں
خورشید اس کے در کا سائل نہیں تو کیا ہے

خورشیدِ معرفت کو ہم کس طرح سے دیکھیں
مشتِ غبار اپنا حائل[1] نہیں تو کیا ہے

گر حق پرست ہے تُو تو دل لگا نہ اس سے
یہ نقشِ زندگانی باطل نہیں تو کیا ہے

گر چشمِ شوقِ مجنوں ہو خوب کار فرما
ہر گرد بادِ صحرا محمل نہیں تو کیا ہے

موجِ خطر کو ساحل سمجھے ہے عشق پیشہ
دریائے عشق کا یہ[2] ساحل نہیں تو کیا ہے

ہم شمع ساں کھڑے ہیں اور مصحفی رواں ہیں
ان پر قدم ہی اپنا منزل نہیں تو کیا ہے

429

عارض اس ماہ کا کم نہیں حور سے
کہتے ہیں یہ ملک دیکھ کر دور سے

آہ کی برق بھی شوخ ہے اس کی اب
آنکھ کب جھپکے ہے مشعلِ طور سے

خاک کے پُتلے کا اور ہی حسن ہے
نار سے گو بنے یا کوئی نور سے

وجد میں آن کر قیس نے غل کیا
دشت میں ناقے کو دیکھ کر دور سے

عشق کا راہ زن گو کہ ہے پُر جفا
لے سکے کپڑے کب عاشقِ عور سے

1۔ اصل اور دیگر نسخوں میں: ہائل 2۔ اصل اور دیگر نسخوں میں 'یہ' ندارد

جوں بنے دے کے دم[1] مصحفی، یار کو
لائیے اپنے گھر مکر سے زُور[2] سے

430

هم صنم دم ترے عشق کا بھر گئے جل گئے، بُھن گئے، کٹ گئے، مر گئے
زہر کھا دیکھیو جاویں گے ہم تو مر گر سنا ہم نے تم غیر کے گھر گئے
دم بہ دم ہم سے تم بگڑو ہو کس لیے آپ کے غصے سے ایسے ہم ڈر گئے
کشتۂ ناز کا دل ہوا کتنا خوش خاک پر اس کی تم جب قدم دھر گئے
تیز تر تیغ سے اس کا جو جادہ تھا عشق کے کھیت میں سیکڑوں سر گئے

رات دن مصحفی رووے ہے ہجر میں
اس پہ تم یہ میاں کیا ستم کر گئے

431

ازبسکہ جی ہے تجھ بن بیزار زندگی سے بہتر ہے مجھ کو مرنا اے یار زندگی سے
مر جاؤں میں تو رونا میرا تمام ہووے شاکی ہیں میری چشمِ خونبار زندگی سے
اس شاہدِ نہاں کا کشتہ ہوں میں کہ جس نے کھینچی ہے درمیاں میں دیوار زندگی سے
مرتے تو چھوٹ جاتے رنج و محن سے یاں کے مانندِ خضر ہم ہیں ناچار زندگی سے
یاں کی اذیتوں سے ازبسکہ آگہی تھی کرتے تھے ہم عدم میں انکار زندگی سے
جیتے اگر نہ ہم تو کیوں ذلتیں اٹھاتے کھائی ہے دل پہ ہم نے تلوار زندگی سے

سچ ہے اٹھائے کب تک ہر اک کی بے ادائی
آتی ہے مصحفی کو اب عار زندگی سے

1۔ دم دینا = فریب دینا 2۔ زُور = فریب

432

لٹ رخ پہ ہے وہ زلفِ گرہ گیر دھوئیں کی
یا گرد ہے آتش کے یہ تحریر دھوئیں کی

کوچے میں ترے آہِ نفس سوختگان سے
ہر موجِ ہوا بن گئی شمشیر دھوئیں کی

اس چہرۂ گل رنگ سے خط جس نے نکالا
کھینچی ورقِ شعلہ پہ تصویر دھوئیں کی

جھٹ جا ہی گھسا مغز میں نمرود کے پشّہ
کچھ پیش گئی اس سے نہ تدبیر دھوئیں کی

جوں خس سے سبک بسکہ تنِ لاغرِ مجنوں
لوہے میں اسے رکھتی ہے زنجیر دھوئیں کی

جھونکے سے ہوا کے جو ہوئی شمع گل اس دم
کیا ظلم کیا، تھی یہی تقصیر دھوئیں کی

آنکھوں سے نکالے ہے لہو اشک کی جاگہ
ہے مطبخِ خوباں میں یہ تاثیر دھوئیں کی

زندانیِ الفت کو ترے شامِ جدائی
پھر آئے میاں دینے کو تعذیر دھوئیں کی

بس دم نہ چرس کا تو لگا مان کہے کو
لاوے گا نہ تاب اے بتِ بے پیر دھوئیں کی

اے مصحفی آتش نفسی اپنی تو دکھلا
کر ایک غزل اور بھی تحریر دھوئیں کی

433

جالی ہے ترے رخ پہ یہ بے پیر دھوئیں کی
یا جرمِ قمر پر ہے یہ تسخیر دھوئیں کی

ہمسائے نے گریاں ہی رکھا ہم کو ہمیشہ
کچھ ہو نہ سکی ہم سے تو تدبیر دھوئیں کی

برباد گئی یوں ہی تو اے آہِ پریشاں
سیدھی نہ کھنچی تجھ سے بھی تصویر دھوئیں کی

سر کرتے ہیں توپوں کے تئیں جب کہ نصاریٰ
خود شکلِ ہوا بنتی ہے تعمیر دھوئیں کی

قیدِ خمِ ابرو میں موا میں تو پس از مرگ
تربت سے مری نکلے ہے زنجیر دھوئیں کی

بجھ کر ترے مجرم کا چراغِ سرِ تربت
دیتا ہے لحد میں اسے تعذیر دھوئیں کی

چھوڑوں نہ دھواں رخ پہ ترے بن کے میں قلیاں
ہوتی ہے فزوں گال سے توقیر دھوئیں کی

نامہ تو میں لکھتا تھا اسے لیک قباحت[1]
تھی دل میں مصور دمِ تحریر دھوئیں کی

1۔ ل ، ب : صاحب (ممکن ہے یہاں لفظ قیامت ہو)

دیکھا ہے دھواں خواب میں اک گھر سے ہے اٹھتا ساگا ہی کروں، ہے یہی تعبیر دھوئیں کی
کچھ بکتے ہوئے گھر مرے آیا تھا وہ کافر دم کرنے لگی بند جو تاثیر دھوئیں کی
ملتا ہوا آنکھوں کے تئیں اٹھ کے وہ بھاگا کیا اس سے فزوں ہووے گی تقصیر دھوئیں کی
اے مصحفی گر شوخی مری عفو ہو اس دم
پھر شعلہ زبانی ہے گلوگیر دھوئیں کی

434

اے یارو کرو آہ کے توقیر دھوئیں کی کیوں عرش سے لٹکے ہے یہ زنجیر دھوئیں کی
سر روزنِ زنداں سے مری آہ نے کھینچا اس پر بھی نہ سمجھا کوئی تقریر دھوئیں کی
مِسّی کی دھڑی سے تری دل خون میں لوٹے رکھتی ہے غضب کاٹ یہ شمشیر دھوئیں کی
یوں آہ ہی پیچیدہ مرے مدِّ نفس ہے صنعت سے ہو جوں کلک پہ تحریر دھوئیں کی
دیوانہ ملک کون ہے اس شعلہ جبیں کا جو رُو بہ فلک جاوے ہے زنجیر دھوئیں کی
آنکھیں جو کوئی آتشِ دیدار سے سینکے یاں اس کے تئیں دیتے ہیں تعزیر دھوئیں کی
اس اصطبلِ یاس کا قیدی ہوں کہ جس میں بو آئے سدا لید کے بے پیر دھوئیں کی
یہ آہ لگی ان کو میاں کس کی جو صورت رکھتے ہیں ترے جوہرِ شمشیر دھوئیں کی
اے مصحفی وہ خط نہیں سورہ[1] ہے دخاں کا
واجب ہے مجھے اس لیے توقیر دھوئیں کی

435

فانوس میں ہے کچھ جو یہ تاثیر دھوئیں کی شعلہ کی شرارت ہے نہ تقصیر دھوئیں کی
جوں شعلہ جو وحشت پہ کبھی آئے ہے مجنوں بیڑی کے تئیں سمجھے ہے زنجیر دھوئیں کی
مضمونِ دلِ سوختگاں گر کوئی سمجھے پیدا ہے لبِ شعلہ سے تقریر دھوئیں کی

1۔ ب : سودائی دخاں کا

کیا جی کو جلایا مرے مانی کے قلم نے
کچھ بات جو نکلی دمِ تحریر دھوئیں کی

چہرے کی جگہ آتشِ بے دُود بنائی
زلفوں کی جگہ کھینچ دی تصویر دھوئیں کی

کس تیغِ سیہ تاب سے ہے اس کو تقابل
ہے ہاتھ میں شعلے کے جو شمشیر دھوئیں کی

گر آتشِ بے دود میں کودوں میں تو واں بھی
خامی مری دیوے مجھے تعذیر دھوئیں کی

اس زلف کو چاہوں میں تو پھر خواب میں ہرگز
صورت نہ دکھاوے مجھے تقدیر دھوئیں کی

ہیں لاکھ مکاں چرخ میں دورے کے سبب سے
شب کو نظر آتی ہے یہ تعمیر دھوئیں کی

کیا بھاگے ہے اے مصحفی گل شمع کا لے کر
لاتا ہی نہیں تاب جو گل گیر دھوئیں کی

436

مجھ کو دیکھ اس نے اگر بھوں نہ چڑھائی ہوتی
بات کوئی تو زباں پر مری آئی ہوتی

اس کے دامن سے تو ہوتا نہ جدا موسمِ گل
گو مرے ہاتھ کو پہنچے سے جدائی ہوتی

اپنے یوسف پہ نہ مرتی وہ اگر صانع نے
تیری تصویر زلیخا کو دکھائی ہوتی

تیغِ ابرو تری سفّاکی پر آتی تو وونہی
آج دو چار محلّے کی صفائی ہوتی

تیرے دانتوں کی چمک نے نگہِ خندۂ ناز
آبِ گوہر پہ تو بجلی نہ گرائی ہوتی

قدرتِ حق نظر آتی ہی گل اندامو‌ں کو
قادری[1] تو نے جو پھولوں کی بسائی ہوتی

منع لب میں جو نہ کرتا تو غضب لایا تھا
رات نالے نے مرے آگ لگائی ہوتی

کیوں نہ لایا تو مرے خط کا جواب اے قاصد
کچھ نہ کچھ تو نے تو واں بات بنائی ہوتی

جس سے ہم نغمۂ منصور نہ لب پر لائے
کاش ساقی نے وہ دارو نہ پلائی ہوتی

بے دہن کیوں تری تصویر کو لکھتا نقّاش
لب میں گر موجِ تبسّم کی سمائی ہوتی

گر اجل داد کو میری نہ پہنچتی تو بھلا
کس طرح دامِ تعلق سے رہائی ہوتی

پنجۂ خار کے دامن کے کیے دو ٹکڑے
قہر تھا جیب پہ گر اس کے رسائی ہوتی

1۔ قادری = ایک قسم کا سینہ بند

مصحفی دیکھ تو عالم غزلِ ثانی کا
خرچ کیا اس سے سوا تازہ ادائی ہوتی

437

اپنی وحشت نے اگر خاک اڑائی ہوتی گرد آلود صبا باغ میں آئی ہوتی
طبع اپنی بھی جو فریاد پہ آئی ہوتی جوئے خوں شہر کی گلیوں میں بہائی ہوتی
ہم نے شیریں کی جو تصویر بنائی ہوتی دستِ فرہاد کی طاقت نظر آئی ہوتی
عکس تیرا تجھے آئینے میں یوں گھورے حیف بے خبر اس کو ذرا آنکھ دکھائی ہوتی
کفکِ پا کا تصور ترے کرتے جو کبھو قتلی [1] لوحِ زمرّد بھی حنائی ہوتی
خوب سمجھا جو اسیری میں موا مرغِ چمن بن دیے جان کے اس کی نہ رہائی ہوتی
دیتا غمزے کو وہ بت خدمتِ سفا کی اگر سر بریدہ ابھی اک دم میں خدائی ہوتی
مصحفی خوں سے مرے ہوتا نہ دامن افشاں
ہٹ کے قاتل نے جو تلوار لگائی ہوتی

438

خارساں خشک زبانی ہے جو دے آب مجھے کیوں کرے ابرِ کرم تشنۂ سیلاب مجھے
بخت رکھتا ہے نت آئینہ، بے آب مجھے دور بھاگے، ہو اگر خواہشِ سیماب مجھے
وہ نمازی میں ازل کا ہوں کہ طفلی میں مدام ناخنِ شیر رہا حلقۂ محراب مجھے
سرخیِ رنگِ حنا کا میں مزہ کب لوٹا خوں میں نہلائے ہے کیوں لالۂ سیراب مجھے
صورتِ دیدۂ تصویر ہوں میں وارفتہ سچ جو پوچھو مری بیداری ہی ہے خواب مجھے
کم فروغی پہ جو پیری کے گئی میری نظر آ گئی یاد وونہی صبح کی مہتاب مجھے
گریہ آلودہ میں سرگشتہ ہوں کچھ دور نہیں آوے چکر میں اگر دیکھ کے دولاب [2] مجھے

1۔ قتلی = قاش؟ 2۔ دولاب = رہٹ

غم سے میں کس دہنِ تنگ کے لاغر ہوں کہ ہاے دیدۂ مور ہوا حلقۂ گرداب مجھے
اس کے جگنو کی چمک دل سے ابھی بھولی تھی کیوں جلاتا ہے تو اے کرمکِ شب تاب مجھے
اشک اس لطف سے چمکے ہیں کہ آتے ہیں نظر پردۂ دیدہ پہ کرمکِ شب تاب مجھے
اس سکونت کا تو خاطر سے خلل مٹ جاوے کاش سیماب بناوے دلِ بیتاب مجھے
میں صفا بحر کی اب مصحفی کب پاتا ہوں
تیرہ بختی نے دیا رتبۂ سیلاب مجھے

439

جس کے شریاں میں فرونشترِ مژگاں ہووے اس کا ہر قطرۂ خوں کیونکہ نہ رقصاں ہووے
کیا زمیں پر یہ تنِ زار نمایاں ہووے دیدۂ مور کا جب سایۂ مژگاں ہووے
میں ترے پاس سے جیتا ہوں وگرنہ اسی دم تیغ گردن پہ مری چاکِ[1] گریباں ہووے
شیشۂ دل ہے مرا مثلِ حبابِ لبِ جو کیوں نہ پھر بوند کا لگنا اسے پیکاں ہووے
چشم پوشی تو کرے مجھ سے تو کچھ باک نہیں پر تری تیغِ تغافل تو یہ عریاں ہووے
کیا ضیافت میں کروں اس کی بغیر از خس و خار آشیانے کی مرے برق جو مہماں ہووے
آتشِ عشق جلا کر تو اڑا دے مجھ کو تا مری خاک نہ بازیچۂ طفلاں ہووے
کہیں پردے سے نکل شاہدِ یک رنگی تو کب تلک عربدہ جو گبر و مسلماں ہووے
رزق کانٹوں کا ہوئے آبلۂ پا میرے داغِ خوں بھی تو کوئی قسمت داماں ہووے
وقتِ خط لکھنے کے آتا نہیں یاد اپنا نام اتنا غالب نہ کسی شخص پہ نسیاں ہووے
نیش تیشے کا جو ہے صورتِ شیریں سے خجل چاہتا ہے کہ رگِ سنگ میں پنہاں ہووے
لعب و بازی سے کبھی ہاتھ اٹھاوے نہ وہ طفل تا نہ گوے فلک اس کے تہِ چوگاں ہووے
میری تربت کی تو تعمیر محرم میں نہ کر یوں ہی رہنے دے کہ تا خاک سے یکساں ہووے
طعنہ زن کیونکہ نہ ہوں اپنی سیہ بختی پر خال جب بوسہ ربا ہے لبِ جاناں ہووے

1۔ اصل : میرا گریباں

آخرش شاہ و گدا خاک میں ہو جاتے ہیں ایک
آدمی حشمتِ ظاہر پہ نہ نازاں ہووے

حسنِ چالاک چھپائے سے کہیں چھپتا ہے
شعلہ فانوس سے ممکن نہیں پنہاں ہووے

اس پہ رکھ دوں جو ذرا دیدۂ خونبار اپنے
سنگِ دہلیز ترا لعلِ بدخشاں ہووے

ایسے مجروح[1] کو کرتا ہے کوئی شمع و چراغ
جس کا زخموں سے بدن سروِ چراغاں ہووے

دامنِ زیں کا بھی کچھ پاس ہے اے موجِ ہوا
نہ غبارِ سُمِ رخش اس کا پریشاں ہووے

تیرہ بختی جسے دے غوطہ خُمِ ظلمت میں
مردمِ دیدۂ شب کیوں نہ وہ افشاں ہووے

مصحفی ایک غزل اور تو لکھ رنگیں سی
تا ذرا صفحۂ قرطاس گلستاں ہووے

440

زلف عارض پہ تری گر نہ پریشاں ہووے
کیوں ہوا موج کی پھر سلسلہ جنباں ہووے

اتنی عشرت کا روادار نہیں چرخ افسوس
زخم تن پر مرے شکلِ لبِ خنداں ہووے

چاہتا وہ دہنِ تنگ نہیں عالم میں
مشکل بستہ کسی شخص کی آساں ہووے

یہی خطرہ ہے دمِ ذبح کہیں خوں میرا
چمکے خنجر پہ نہ رنگِ گُلِ حرماں ہووے

شرم دیتی نہیں عاشق کو ترے کوچے میں
اتنی رخصت کہ دو چار سگ و درباں ہووے

دل میں صد داغ لیے جاؤں ہوں میں دنیا سے
کیا عجب اس کا تہِ خاک چراغاں ہووے

زخم کھانے کی ہوس ہے مجھے اس قاتل کے
جوہرِ تیغ ہر اک جس کا نمک داں ہووے

روزِ محشر کو تو اے تیرگیِ بختِ سیاہ
اتنا کیجو کہ رخِ مہر نہ عریاں ہووے

ایسے دیوانے سے پرہیز ہی بہتر جس کا[2]
لبِ افسوس کسی کا تہِ دنداں ہووے

مجھ کو مرنے کی نہیں اپنے خوشی کیا حاصل
جادۂ راہِ فنا چاکِ گریباں ہووے

شمع کی طرح بٹھا دیوے گلا کر مجھ کو
داغ سینے کا نہ اتنا بھی تو سوزاں ہووے

1۔ نسخہ بنارس میں یہاں ترتیب غلط ہو گئی ہے 2۔ اصل: جس پہ

مصحفی قافیے میں اس کے بہت دور نہیں
اس زمیں میں تو اگر پھر بھی غزل خواں ہووے

441

ناخنِ دستِ جنوں فتنہ گری سے تیری
کیا عجب صورتِ زنجیر گریباں ہووے

ضعفِ مجنوں کے تئیں دے تو خدایا ہمت
کب تلک ناقہ رواں سوے بیاباں ہووے

ناتواں ایسے کو کیا فائدہ کرنا زنجیر
جس کو ہر نقشِ قدم خانۂ زنداں ہووے

سایۂ بید میں جا بیٹھے جو مجنوں سا نزار
برگِ بید اس کو ہر اک خنجر براں ہووے

اپنے مجروح کو کہہ[1] کہ وہ مژہ چاہے ہے
ساکنِ کوچۂ الماس فروشاں ہووے

ناتواں مجھ سا جو صحرا میں رکھے جا کے قدم
جادہ پانو میں مرے افعی بے جاں ہووے

اپنے مکھڑے سے جو پردے کو اٹھادے جوں تیر
چشمۂ آئینہ تا دیدۂ حیراں ہووے

ہو کے شبنم سے گل آزردہ یہ کہتا تھا سحر
زخمِ دنداں یہ نصیبِ لبِ دنداں ہووے

مر گیا ہو جو تری حسرتِ دیدار کے بیچ
اس کی تربت سے ہرا سبزۂ مژگاں ہووے

آتشِ عشق نے سب پھونک دیا جسمِ نزار
کیا خس و خار کا یہ شعلہ نگہباں ہووے

میں نہ[2] سمجھا تھا ترے کوچہ میں رکھتے ہی قدم
نیم نظارہ مری جان کا خواہاں ہووے

سچ ہے یاں عرش پہ ہے حشمتِ شاہی کا دماغ
دعوتِ مور پہ کیا شاد سلیماں ہووے

مصحفی کو جو ہو دُر ریزیِ معنی کا خیال
رشتۂ نالِ قلم خود گُہر افشاں ہووے

442

ہر ایک گل ہے دیدۂ خونبار دیکھ لے
بلبل ذرا تو رونقِ گلزار دیکھ لے

ڈرتا ہوں میں نہ عرصہ کرے کوہ کن پہ تنگ
پاے جنوں اگر رہِ کہسار دیکھ لے

1۔ غالباً ''گہہ کر'' (گہنا = پکڑنا، قید کرنا) 2۔ ل، ب: میں یہ سمجھتا تھا

قیدِ حیات سے نہ رہائی ابھی تو مانگ — لطفِ قفس تو مرغِ گرفتار دیکھ لے
جان بہ لب رسیدہ[1] یہ کیا اضطراب ہے؟ — رہ ٹک تُو راہِ قاصدِ دلدار دیکھ لے
بلبل ابھی نہ میری فغاں کی حریف ہو — دو چار نالے کر کے تو منقار دیکھ لے
مرجائے زہر کھا کے ترے جعد کی لٹک — بانبی[2] سے سر نکال کے گر مار دیکھ لے
تڑپیں ہیں خاک وخوں میں ترے روبرو صنم — کیا کیا شہیدِ حسرتِ دیدار دیکھ لے
اہلِ قلم کا کام نہ بے کفر چل سکے — مسطر میں بھی ہیں رشتۂ زنار دیکھ لے
تو عاشقوں کو اپنی نگاہوں میں قتل کر — حاکم نہ تجھ کو کھینچتے تلوار دیکھ لے
کچھ ماجرائے دستِ جنوں ہم نشیں نہ پوچھ — ہر ایک آبلے میں جدا خار دیکھ لے
موقوف اپنا کام نہ رکھ دستِ غیر پر — آپ اپنی نبض تو دلِ بیمار دیکھ لے
رکھتا ہے رنج ہی میں فلک موشگاف کو — شانے کے پہلو میں ہیں چبھے[3] خار دیکھ لے
دو چار دن تو اے رگِ گل رہ چمن کے بیچ — روے کمر کا اس کے بھی اسرار دیکھ لے
چلنے میں تیغ کے بھی یہ خونریزیاں نہیں — کبکِ اجل گرفتہ یہ رفتار دیکھ لے

وہ شوخ پھر گیا ہے اگر تجھ سے مصحفی
چل تو بھی کوئی اور طرح دار دیکھ لے

443

عاشق پہ ترے آج بڑی بھیڑ پڑی ہے — لے فوجِ الم گردِ اجل اس کے کھڑی ہے
کیا پانو کا کانٹا ہے جو میں اس کو نکالوں — سینے میں مرے نوکِ نگہ سخت گڑی ہے
کھینچا ہے جو سر شمع کے شعلے نے تو ووں ہی — گل گیر نے آپیچھے سے اک دَھول جڑی ہے
کیا سختیِ گریہ میں کہوں اشک کی میرے — جو بوند ہے ہیرے کی کنی سے بھی کڑی ہے

1۔ اصل اور دیگر نسخوں میں: رسیدہ ہوں 2۔ بانبی = سانپ کا بل: اصل اور دیگر نسخوں میں ماہی (غالباً سہوِ کتابت) 3۔ اصل اور دیگر نسخوں میں: پُھنے (سہوِ کتابت)

کیا جینے کا مدفوں کے ترے اس کو گماں ہے　　یوں لوحِ مزار اس کے سرا اوپر جو کھڑی ہے
بے وجہ نہیں دوستیِ آئینہ اتنی　　شاید کہیں تجھ سے ہی تری آنکھ لڑی ہے
اے مصحفی ساکن ہوں میں اس دہرِ فنا کا
جس دہر میں گھڑیال ہے ہرگز نہ گھڑی ہے

444

ہے شاعری اے شیخ وہ تلبیس کی ٹوپی　　مجرائی [1] ہے جس کی سر ابلیس کی ٹوپی
خونخوار بنائے ہوئے شکل آوے جو وہ شوخ　　حمرا کی کلہ چھین لے انکیس کی ٹوپی
سرکش ترے کوچے سے کوئی بچ کے نہ آیا　　واں روز اترتی رہیں دس بیس کی ٹوپی
لے لے کے مری نثر کے پرزوں کو فلاطوں　　چاہے ہے سیے فرقِ نوامیس کی ٹوپی
اے ماہ میں آگے تری ترکانہ کلہ کے　　کج ہوتے نہ دیکھی کبھی برجیس کی ٹوپی
یارانِ سخن گو کی [2] ہے وہ کمپنی اپنی　　نت جس کی سلامی ہے فرانسیس کی ٹوپی
اے مصحفی ہے یہ وہ غزل صنع سے معمور
جوں سوختہ ہو سوزنِ ادریس کی ٹوپی

445

خامشی دیتی رہی تعلیمِ لسانی [3] مجھے　　آہ کام آئی نہ کچھ اپنی زباں دانی مجھے
کس کی تیغِ ناز کے کشتے ہیں یہ لگتی ہے کیوں　　خوش سواد اتنی بیاضِ چشمِ قربانی مجھے
بزمِ معشوقاں میں پہنچا تیرے باعث آئنہ　　کچھ تو دکھلا دیتی جوہر تو بھی حیرانی مجھے
خوگرِ عریاں تنی ہوں تیرے دیوانوں کے بیچ　　ایک دن رسوا کرے گی بے گریبانی مجھے
تا ذرا چاکِ قفس سے گل کو دیکھوں سر نکال　　اتنی فرصت بھی نہیں دیتی پَر افشانی مجھے
میں تو تھا آزاد دامِ عشق سے پر کیا کروں　　پیچ میں لائی ترے بالوں کی پیچانی مجھے

1۔ ل، ب: ہمراہی　　2۔ل، ب: یارانِ سخن کی بھی ہے　　3۔ ب: نسیانی

اہلِ جوہر کے تئیں پوشش کی کیا ہے احتیاج تیغ ہوں میں، سرخرو کرتی ہے بڑانی مجھے
صرع والے کی طرح طاری ہو مجھ پر بے خودی تشنہ کامی میں نظر آوے[1] اگر پانی مجھے
بعدِ مُردن بھی نہیں رتبے سے گرتے اہلِ جاہ تختہ گاہِ قبر ہے تختِ سلیمانی مجھے
مثلِ گردِ راہ ہوں میں راکبِ رخشِ نسیم دوش پر اپنے لیے پھرتی ہے ویرانی مجھے
ملتفت ہوتا ہے کب صیاد میرے حال پر جاں فشانی اس کے آگے ہے پرافشانی مجھے
خون ٹپکے ہے مرے نوکِ قلم سے مصحفی
کیا دکھاوے اپنی صورت خامۂ مانی مجھے

446

سرگندھا اس کا زبس کفر میں لاثانی ہے مانگ جو اس پہ ہے زنّارِ سلیمانی ہے
لختِ دل اشکوں میں بہتا ہوا آنکھوں سے گیا کیوں کہ کہیے نہ اسے لعل یہ سیلانی ہے
عقدہ ہے ہستیِ موہوم سے کام اپنے میں جب بتدریج گیا ژالہ پگھل پانی ہے
چشم معشوق کے رونے نے ڈوبایا مجھ کو آبِ بادام میں کشتی مری طوفانی ہے
طائرِ روح نے کترے نہیں صیاد کے پَر امرِ حق سے قفسِ تن میں یہ زندانی ہے
جادۂ راہِ فنا ہے دمِ شمشیر سے صاف سنگِ رہ اپنا مگر اپنی گراں جانی ہے
مجھ کو کعبے میں نہ لے جاؤ میں ہوں کافرِ بخت سجدۂ بت ہی سے خوگر مری پیشانی ہے
شمع ساں گرم زبانی سے نہ باز آئیں ہم نفسِ گرم کی تا سلسلہ جنبانی ہے
مصحفی کوئی تو ہے گوہرِ مقصد کا چراغ
کوے مطلوب کی خاک اس نے بہت چھانی ہے

447

حشر کو آئے عرصے میں تو میرے نوشتے بھول گئے حسن اسے کہتے ہیں جس کو دیکھ فرشتے بھول گئے

1۔ب :اگر آوے نظر

حد سے تجاوز کر گیا آخر رنگِ فندق ہجر کی شب آپ مگر پوروں پر اپنی باندھنے دستے بھول گئے
کچھ تو مزہ گل کھانے کا داغوں سے پایا ہووے گا لالہ ستاں کی سیر جو تیرے غم کے برشتے بھول گئے
پھول چڑھانے دونے لائے گور غریباں پر اِلّا کشتہ نازنہاں کی تیرے قبر فرشتے بھول گئے
بے سررشتہ اکثر باتیں اب جو نظر آتی ہیں یہاں
مصحفی کیا خدامِ فلک اگلے سررشتے بھول گئے

448

ہم محوِ محبت تھے، اجل یاد کسے تھی مرنے کی خبر اے دلِ ناشاد کسے تھی
ویرانے میں لاکر ہمیں وحشت نے بٹھایا سچ ہے ہوسِ خانۂ آباد کسے تھی
زانو پہ جھکائے ہوئے ہم بیٹھے تھے سر کو پروا تری شمشیر کی جلّاد کسے تھی
تو قتل بھی کرتا تو نہ دم مارتے ہم تو فرقت میں تری طاقتِ فریاد کسے تھی
رکھا تھا ہمیں اس نے گرفتارِ قفس کر اے ہم وطناں الفتِ صیاد کسے تھی
کیوں دشت سے تو ہم کو گلستاں میں لے آیا اے عشق ہوائے گل و شمشاد کسے تھی
بیداد کیا اس نے گر اے مصحفی ہم پر
کون اس سے کہے حسرتِ بیداد کسے تھی

449

پھر میری اس کی یارو بیزاری ہوگئی ہے پھر عشق کی زیادہ بیماری ہوگئی ہے
سینے کے زور سے بھی مُو بھر نہیں اُکستی[1] ان روزوں ہجر کی سل یہ بھاری ہوگئی ہے
گر گاہے چوری چوری پہنچے ہیں ہم پلنگ تک یک بار سارے گھر میں بیداری ہوگئی ہے
مسمومِ غم کو اس نے مارا ہے شاید اس نے جو آبِ تیغِ قاتل زنگاری ہوگئی ہے
اس آفتابِ رخ کے نکلی ہے روبرو گر آنسو کی بوند اپنی زنگاری ہوگئی ہے

1۔ اُکسنا = اٹھنا

اپنا بھی مصحفی دل اس سے کنارہ کش ہے
جس دن سے دخترِ رز بازاری ہوگئی ہے

450

جو کوٹھے پر وہ پایانِ شبِ مہتاب پھرتا ہے ستارہ صبح کا پھر شام تک بیتاب پھرتا ہے
کہے خبطی لکھے ہے مجھ کو وہ گل گاہ سودائی بوقتِ خط نویسی دم بدم القاب پھرتا ہے
دلِ بے تاب ہے صیقل نمائے حسنِ سنگیں دل صفا شیشے پہ تب آتی ہے جب سیماب پھرتا ہے
شرابِ خشک میں کشتی ہوئی ہے اپنی طوفانی نہ موجوں کا تلاطم[1] ہے نہ واں گرداب پھرتا ہے
تو اے رُو کردہ پنہاں از دو عالم ہے کدھر سچ کہہ تمنا میں تری ہر ایک شیخ و شاب پھرتا ہے
رہے گی کوزۂ دولاب وش ہم کو بھی اک گردش ہمارے سر پہ جب تک چرخ کا دولاب پھرتا ہے
قیامت لاگ ہے اس کو تصور اس پری رو کا مری آنکھوں کے آگے ہے جو وقت خواب پھرتا ہے
معاذ اللہ کہ کوئی سیر ان کی دیکھے کوٹھے پر کہ رنگِ چہرۂ خوباں شبِ مہتاب پھرتا ہے
کسی کا لختِ دل ہے یہ کہ برگِ لالۂ رنگیں جو یوں پانی میں گردِ نرگسِ سیراب پھرتا ہے

بلا کر مصحفی پر پھر نوازش کیجیے صاحب
پریشاں حال ہے وہ اور بے اسباب پھرتا ہے

451

سمجھے ہے سواروں میں رستم کو بھی پرواہی جس وقت کہ مرکب پہ بیٹھے ہے وہ اک واہی
تا بازوے قاتل کو ایذا نہ ہو اس باعث مذبوح ہوئے پیدا ہم خلق میں جوں ماہی
یارب تو نہ اس گل کو تاراجِ خزاں کیجو جس گل میں نکلتی ہو بلبل کی ہوا خوری
دم اولِ شامِ وصل ہونٹوں پہ مرا آیا کیا کہیے کہ کیا بے وقت کی عمر نے کوتاہی
طے راہِ عدم اس کے باعث سبھی کرتے ہیں تیغا جو کمر میں ہے اس شوخ کی تراہی[2]

1۔ اصل اور دیگر نسخوں میں: طلاطم 2۔ تیراہی = تراہی (شہر تراہ سے منسوب)

کیونکر نہ فنِ تاریخ مقبولِ بزرگاں ہو احوالِ سلاطیں سے ہوجاتی ہے آگاہی

گر چشمِ حقیقت سے اے مصحفی تو دیکھے

ہر فرد کے سر میں ہے یاں دعویِ جم جاہی

452

یار سے حلقۂ آغوش ہے میرا خالی ورنہ دیکھا نہ کبھی ماہ سے ہالا خالی

کوئی دم دل تو وہاں بیٹھ کے کرتا خالی پاس ہمسایہ کے گر گھر کوئی ملتا خالی

رنگ کیوں چہرۂ یوسف سے اڑا جاتا ہے ہے ابھی تو تری تصویر کا خاکا خالی

میں ہی خود رکھتا نہیں بزمِ خموشاں میں قدم ورنہ ہر گام پہ ہے میرے لیے جا خالی

خاک سر کشتوں کی واں بسکہ رہی چکر میں نہ بگولوں سے ہوا دامنِ صحرا خالی

ننگ وہ سادہ رخوں کا ہوں میں اس مجلس میں نام کو جس کے نگیں کرتی نہیں جا خالی

کس کے جانے سے ہوا ہائے یہ میخانہ خراب لنڈھتے پھرتے ہیں سبو و خم و مینا خالی

ہم کو جیتوں میں نہ سمجھو کہ بدن سے یاں ہے پیرہن مثلِ حبابِ لبِ دریا خالی

گھن لگا اس کو کچھ ایسا کہ طرح نے کی ہوا اندر اندر ہی مرا نخلِ تمنا خالی

نیم بسمل ترے محشر میں ترستے پھرتے داد خواہوں سے وہاں پاتے جو عرصا خالی

اے اجل پھر تجھے آنے میں تامل کیا ہے میرے مرنے سے نہ ہو جاوے گی دنیا خالی

زور یہ یار نے لکھا مرے نامے کا جواب کہ عوض خط کے دیا بھیج لفافا خالی

اینڈنا بحر کا ہے ابر کی بارش کے سبب یا الٰہی نہ کریموں کا ہو کیسا خالی

مجھ سے افتادہ بھی قُم سے کبھی اٹھتے دیکھے سر کو بک بک کے نہ کر اپنے مسیحا خالی

مصحفی جس میں نہ ہو شانِ ادب وہ خوش پوش

حسنِ معنی سے ہے جوں صورتِ دنیا خالی

453

خار اور گل گر مرغ چمن کے تیغ دو دھاری مارے ہے غنچہ کیوں اس بات کے اوپر پیٹ کٹاری مارے ہے

کاجل دونوں پلک کا اس کی تیغ دودھاری مارے ہے　اور کوتاہی مدِ نگہ کی دل میں کٹاری مارے ہے
کس کو نافرمانی جوڑا پہنے چمن میں دیکھا تھا　برق سے سر پر ہاتھ اپنے کیوں ابر بہاری مارے ہے
میر کا دلبر لڑنے میں گو سب کا معلّم ہے بیشک　مرغ فصاحت اپنا بھی پر اور ہی کاری مارے ہے
نرگس سر کو جھکا دیتی ہے اپنے حیا سے اس ساعت　گل کے ساتھ جو چشمک اس کی چشم خماری مارے ہے

تم نے بے تقصیر و خطا جو مصحفی سے یہ سلوک کیا
کوئی بھی عاشق کو بااین ذلت و خواری مارے ہے

454

یہ آرسی جو محوِ دل آرام ہوگئی　اس چشمِ مے پرست کے کیا رام ہوگئی
کچھ تو سبب ہوا جو پھرا اب تلک نہیں　قاصد کے انتظار میں یاں شام ہوگئی
مجنوں سے کہیو بادِ صبا کچھ بھی ہے خبر　لیلیٰ تو تیرے عشق میں بدنام ہوگئی
وے زمزمے چمن کے رہے کچھ نہ اس کو یاد　بلبل خموش آ کے تہِ دام ہو گئی
بے قرب اس کی بزم میں ہم اس سبب ہوئے　عزت ہماری اَوروں کو انعام ہو گئی
تھا جس پری کے واسطے زانو پہ سر مرا　سو بار آ کے وہ تو لبِ بام ہو گئی
کوچے میں یار کے جو کبھی پھر نہ چل سکے　ہم ناتوانوں کو تو زمیں دام ہو گئی
اب شکوہ و شکایتِ بیجا سے کیا حصول　ہونی جو تھی سو اے دلِ ناکام ہو گئی

غصے کے وقت اس کے کہوں کیا میں مصحفی
جو بات لب تک آئی سو دشنام ہوگئی

455

شخص ظالم کا تنِ لاغر بنے اور ٹوٹ جائے　خاک سے جیسے گلی خنجر بنے اور ٹوٹ جائے
وائے نومیدی کہ میرا نالۂ گردوں خرام　جبرئیل آہ کا شہپر بنے اور ٹوٹ جائے
وصل کی شب سے گلہ گر ہے تو اتنا ہے مجھے　تازہ پھولوں کا ترے زیور بنے اور ٹوٹ جائے

جاے حیرت ہے کہ ایسی وادیِ بے خار میں پانو کا ہر آبلہ پتھر بنے اور ٹوٹ جائے
بے نصیبی تیرے دیوانے کی ہے جو فصل میں نوکِ خارِ خشک یوں نشتر بنے اور ٹوٹ جائے
کام نازک ہے بڑا اس کارگاہِ صنع کا قطرۂ شبنم جہاں گوہر بنے اور ٹوٹ جائے
ہستیِ فانی کی اپنے مصحفی ہے یہ مثال
جوں حبابِ بحر کا ساغر بنے اور ٹوٹ جائے

456

کرے نہ متصلِ گوشِ گل فغاں کوئی نہ شاخِ گل پہ رکھے اپنا آشیاں کوئی
نکل نکل کے جو رہ رہ گئی نیام سے تیغ مگر ملا نہ سزاوارِ امتحاں کوئی
فضاے گلشنِ تصویر ہے طلسمِ جہاں کہ غیرِ خامہ نہیں جس کا باغباں کوئی
ستم تو یہ ہے کہ ہے باغباں کی یوں مرضی نہ فصلِ گل میں کرے سیر بوستاں کوئی
خموش رہ تو کہ بزمِ بتاں ہے جاے سکوت اسی پہ برق پڑی بول اٹھا جہاں کوئی
کچھ آج ناقۂ لیلیٰ کے پانو اٹھتے نہیں نہ رہ گیا ہو بہ دنبالِ کارواں کوئی
لحد میں بھی مری چھاتی کی سِل رہا غمِ عشق کسی کے دل پہ نہ اتنا بھی ہو گراں کوئی
مگر ہے گورِ غریباں کی آج پامالی جو اس مقام میں لیتا نہیں عناں کوئی
خیال میں بھی وہ صورت نظر نہیں آتی کسی کی چشم سے اتنا نہ ہو نہاں کوئی
جلا دیا مرے لاشے کو بعدِ قتل اس نے زمیں پہ تا نہ رہے اس کا استخواں کوئی
میں خاک مشقِ سخن مصحفی کروں کہ مرا
رہا نہ زندہ زمانے میں ہم زباں کوئی

457

ہم سے الگ ہو غیر سے دل کو لگا چکے تب چیتے ہم کہ ہاتھ سے اپنے وہ جا چکے
مہلت ملی نہ سوزنِ عیسیٰ کو ایک دم پھر سینہ پھٹ گیا جو گریباں سلا چکے

اے وائے ضبطِ گریہ کو اس دم ہوئی خبر[1] دو چار اشک جب سرِ مژگاں پہ آ چکے
آئی نہ کچھ قضا ہی مری ورنہ ہم طعام الماس سودہ تک تو نمک میں ملا چکے
بوسے کی گفتگو سے نہ باز آئے گرچہ ہم ہاتھوں سے اس کے منھ پہ بھی تلوار کھا چکے
دی کف میں اس کے نقش کشانِ قضا نے تیغ وقتیکہ تا گلو مرا چہرہ بنا چکے
ہم چھوٹ کر قفس سے ہوئے راہ میں اسیر اب چھوٹے بھی تو بس چمن آباد پا چکے
عالم اگر یہی ہے تمھارے خرام کا تو خفتگانِ خوابِ عدم سر اٹھا چکے
کیا فائدہ ہے اتنی کشاکش نہ کیجیے اب آپ میرے ہاتھ سے دامن چھڑا چکے
بس بس زیادہ برق سے پنجہ نہ کر ٹھہر ہم تجھ کو بے قراریِ دل آزما چکے

قاتل کے آبِ تیغ کے ممنوں نہ کیوں کے ہوں
ہم گھر میں بیٹھے مصحفی گنگا نہا چکے

458

رزقِ مقسوم پہ یک چند قناعت کیجیے نیم ناں کے لیے کس کس کی سماجت کیجیے
بادِ صرصر سے بچا رکھیے چراغِ رہِ دیر پیش رو اس کے اگر دست حمایت کیجیے
ہیں خلش دوست بہت آبلۂ پا اپنے جی میں آتا ہے کہ کانٹوں کی زراعت کیجیے
آیئے جلد کہیں پردے سے باہر آخر صبر پر میرے نظر صبح قیامت کیجیے
تشنگی سینہ جلاتی ہے، ادب مانع ہے کیوں کہ ساقی کو دمِ نزع اشارت کیجیے
چاکِ جیب اپنا نہ دکھلایئے اس کو صاحب خندۂ صبحِ قیامت پہ رعایت کیجیے
بختِ بد اپنے بھی فرصت نہیں دیتے ہم کو کہ کہیں جایئے اور سیر و سیاحت کیجیے
مصحفی گو وہ کہیں آپ کو صاحب خرمن ق خوشہ چینوں سے تو کیا حرف و حکایت کیجیے

ہاں مگر شیخ کی خدمت میں یہ ہے اپنا سوال
پڑھ چکے ہم تو کچھ اب آپ عنایت کیجیے

1۔ اصل: خبر ہوئی

459

خوابِ غفلت سے جو وا دیدۂ عبرت کیجے
سالہا اپنے تئیں آپ ملامت کیجے

آہ میخانے میں بے واسطہ ملتی کب ہے[1]
کیجے کیا پیرِ مغاں کی جو نہ بیعت کیجے

طرفِ سلسلۂ زلف کھنچا جائے ہے دل
کیوں کہ پھر دستِ حنابستہ کی بیعت کیجے

اس سے بہتر نہیں دنیا میں کوئی اور ثواب
راہِ قاتل میں جو مقتول کی تربت کیجے

محتسب غیر سے ہوتا نہیں کچھ کام اپنا
بھاگیے رُو بعدم، آپ سے وحشت کیجے

سو جفائیں سہیں پر ہو نہ سکا ہم سے یہ کام
جی میں ہر چند کہا ترکِ محبت کیجے

کوئی واماندہ پسِ قافلہ آتا ہے چلا
کہہ صبا قافلے والوں سے کہ مہلت کیجے

تلخ گوئی ہے بہت وضع تمھاری ڈر ہے
رفتہ رفتہ کہیں گالی سے نہ عادت کیجے

مصحفی قاتل و مختار وہی ہے تو بھلا
تو ہی بتلا ہمیں پھر کس سے شکایت کیجے

460

مجھ کو زنجیر بنے ہیں دمِ رفتار کڑے
یاد آتے ہیں جب ان بالوں کے خم دار کڑے

ان دبے پانو کا رکھنا یہ بلا کیا لایا
پہلی آمد میں بجے جیسے کئی بار کڑے

دیکھیے آگ لگاویں گے یہ کس کس گھر کو
سیمی تن نے مرے پہنے ہیں طلاکار کڑے

اپنی شوخی پہ جو آتے ہیں تو چپکے چپکے
فتنۂ خفتہ کو کر جاتے ہیں بیدار کڑے

اک تو اندازِ خرام اس کا ہے برقِ دل و دیں
آگ دیتے ہیں لگا تس پہ دھواں دھار کڑے

دیکھو چھپر میں مَیں بے ہوش پڑا سوتا تھا
اپنی گھن گھن سے مجھے کر گئے ہوشیار کڑے

ان کو ہونا تھا گلوگیر کسی عاشق کا
ساقِ سیمیں کے گلے کے ہوئے کیوں ہار کڑے

حشر اموات نہ ہو کیوں کہ گلی کوچوں میں
قُم باذنی کی صدا دیتے ہیں ہر بار کڑے

1۔ ح، ب، ل: راہ میخانے کی بے واسطہ ملتی کب ہے

شیخ صنعاں نہ ہوا دور میں ان کے ورنہ اس کو بندھواتے پھر ایک بار تو زنار کڑے
غش کرے کبکِ دری وجد میں آئے طاؤس گر کبھی اپنی سناویں انھیں جھنکار کڑے
نہ چھڑی اور نہ کٹاری نظر آئی مجھ کو اک صفائی سے فقط کر گئے افگار کڑے
ایڑیاں مار کے مر مر گئے ہیں رستے میں دیکھ کر تیرے صنم کافر و دیندار، کڑے
ارتھی دو چار نکلتی نظر آتی ہیں مجھے اس محلے میں ہیں سو جی کے خریدار کڑے
مصحفی گر یہی جھنکار ہے ان کی تو میاں
خاک کے سوتوں کو کر جاویں گے بیدار کڑے

461

نوکِ مژگاں سے مری یاس کا خوں جاری ہے پھر مگر دل کو تمنائے دل آزاری ہے
قطرہ قطرہ مری آنکھوں سے جو خوں جاری ہے جائے شبنم مرے ہر خار پہ چنگاری ہے
زیرِ آرہ انھیں رکھتی ہے شبِ ہجراں میں دردمندوں کی ترے نبض جو منشاری[1] ہے
چار دستے صفِ مژگاں کے ہوئے ہیں تیار علمِ آہ ترا وقتِ نگونساری ہے
غنچۂ فندق سے ہے آلودہ بخوں شاخوں پر لالہ آتش زدہ اک چہرۂ گلناری ہے
یاد میں سبزۂ خط کی وہ موا تھا شاید سائباں تربتِ عاشق کا جو زنگاری ہے
خفتہ بختانِ ازل کی نہ کھلی آنکھ کبھی خوابِ مخمل کے تئیں کب سرِ بیداری ہے
پہنچ اے برق کہ سینے میں مرے ان روزوں نفسِ سوختہ خواہانِ مددگاری ہے
مصحفی چاہیے انساں کے تئیں عقلِ معاش
رات دن فکرِ سخن فکرِ زیاں کاری ہے

462

کس کی زلفوں کی سر اُس کے میں ہواداری ہے تاک ہم سلسلہ دامِ گرفتاری ہے

1۔ منشاری (طب کی اصطلاح) نبض کی ایک قسم

پشتِ پا پر تری تیری ہی نگہ بھاری ہے　　کب تجھے اس کی نزاکت سے خبرداری ہے
قطع کرنے کے تئیں نخلِ حیاتِ عاشق　　زلف آرا ہے تو ابرو بھی تری آری ہے
آہ کس کے مژہِ تیز نے نشتر مارا　　نخلِ مرجاں کی رگوں سے جو لہو جاری ہے
رہتے ہیں لختِ جگر سے جو مرے روغن کش　　مردمِ چشم کو کیا خدمتِ عصاری[1] ہے
لے لے تو اے دمِ شمشیرِ اجل سر میرا　　اس مسافر پہ تو گٹھری یہ بہت بھاری ہے
کیوں کہ بے جرم کہاویں کہ نسب میں اپنے　　مندرج خلقت آدم سے گنہگاری ہے
لاکھ انداز سے تڑپے ہے ترا کشتۂ ناز　　گر تو اک وقفہ کرے جائے[2] عناں داری ہے
کس کے دامن کی طرف اس کا خیال آیا آہ　　جو گریباں سے مرے ہاتھ کو بیزاری ہے

دردِ دل کا نہیں ہوتا ہے مسیحا سے علاج
مصحفی یہ بھی عجب طرح کی بیماری ہے

463

ہر شعر ترا روکشِ دیوانِ ولی ہے　　اے مصحفی اپنے تو نصیبوں کا بلی[3] ہے
بیمار ہوں کس مورچہ[4] بے خط کا جو یارو　　رفتار مری نبض کی اب تک نملی[5] ہے
آنکھوں میں پھرے ہے مری کم بخت کا رونا　　میں کیا کہوں کس داغ سے شب شمع جلی ہے
ان سوزنِ مژگاں کا میں ممنوں ہوں کہ جن کی　　کھودی ہوئی سینے پہ مرے ''نادِ علی'' ہے
معراج کو جنازۂ لیلیٰ نہ گیا ہو　　یہ ماہ نہیں پانو کی اشتر کے تھلی ہے
معشوقۂ مجبوب کا نقشہ ہے بعینہ　　سر ڈالے گریباں میں جو لالے کی کلی ہے
نرگس سے یہ کہہ دو کہ طرف اس کی نہ دیکھے　　بادام کے سائے میں تری آنکھ پلی ہے
آیا تھا نہانے کو جو دریا پہ وہ بانکا　　لہروں میں بہم کہتے ہیں تلوار چلی ہے
سجدے سے پری کے اسے سب دیتے ہیں نسبت　　ابرو کی ترے تیغ بھی گویا عملی ہے

1۔عصاری = تیلی　2۔ ب: جاں　3۔بلی = طاقتور　4۔ب: مورچۂ خطہ (''بے'' لکھ کو قلم زد کر دیا)
5۔ نملی = (طب کی اصطلاح) نبض کی ایک قسم

بھاگا ہے دبے پانو وونہی بزم سے فتنہ　اُس گل نے جو سوتے میں کبھی آنکھ ملی ہے
سینے سے نفس نزع کے دم چل نہیں سکتا　ٹک کچھو نظر اس کو یہ کیا تنگ گلی ہے
آنسو نہیں، سینے سے نکالوں ہوں میں روغن　ہر چشم مری نیل کی گویا کہ بلی ہے
کیا مصحفیِ خستہ سے مانگو ہو کہ اس پاس
ترشا ہوا دل جیسے سپاری کی ڈلی ہے

464

بے چارے دل پر اپنے کیا کیا بلا نہ آئی　حسرت رہی کہ ہے ہے اس پر قضا نہ آئی
کیا موجِ گل نے اس کو زنجیر کر رکھا ہے　گلشن سے جو قفس تک بادِ صبا نہ آئی
ہم سے ہی ہر طرح کا پردہ رکھا کیے تم　اَوروں کو منھ دکھاتے تم کو حیا نہ آئی
اس گل کا جو تصور شب بندھ گیا کہو کیا　تا صبح نیند مجھ کو بادِ صبا نہ آئی
پتھرا گئیں چمن میں نرگس کی گرچہ آنکھیں　پرسش کو اس کی تو بھی بادِ صبا نہ آئی
دیکھ اس کی تنگ پوشی کہتے ہیں اہلِ گلشن　غنچے کے بر میں ایسی چسپاں قبا نہ آئی
کل بزمِ زاہداں میں وہ مُغ بچہ گیا تھا　اس کی نگاہ کس کو تہمت لگا نہ آئی
ہستی سے جانے والے ایسے گئے کدھر کو　اس قافلے کی ہرگز بانگِ درا نہ آئی
دامن دراز میرے، طرزِ خرام تیری
پھولوں کے کب چمن میں تختے بچھا نہ آئی

465

تا زیست آشنا نہ ہوئے عرضِ حال کے　جوں غنچہ[1] بستہ یاں بھی رہے لب سوال کے
ہم مثلِ موج صرف ہوں کیا عرضِ حال کے　لب ہی نہ ہوں جب اپنے زبانِ سوال کے
مردہ مرا گراں ہے زمیں پر عجب نہیں　دے پھینک استخواں جو لحد سے نکال کے

صیاد تھا وہ دشتِ محبت کہ واں لگے — کانٹے ہمارے پانو میں تیروں کے بھال کے
لاتے نہیں زباں پہ ہم اس کی کمر کا ذکر — بن بن کے دل میں مٹتے ہیں نقشے خیال کے
تیغِ نگاہِ شوق نے جاتے ہی باغ میں — کیا کیا ورق اڑائے نہ پھولوں کی ڈھال کے
کیا اس کمر سے پھر رگِ گل روکشی کرے — مغرور ہو جو بارِ نزاکت سنبھال کے
کشتے کی تیرے خاک پہ ہولی کا ہے[1] سماں — ذرے چمک رہے ہیں عبیر و گلال کے
قصّے رہے ہیں ایسے ہی ہمراہ عاشقاں — جھگڑے چکے بھی ہیں کہیں ہجر و وصال کے
وحشت شبِ فراق کی کس سے بیاں کروں — تارے ہی ہم کو ہو گئے دیدے غزال کے

دلچسپ ہے ذرا یہ زمیں اس میں مصحفی
دو چار شعر اور بھی لکھ حسب حال کے

466

بوٹے سیاہ شوخ یہ ہیں اس کی شال کے — جن پر سے صدقے کیجیے دیدے غزال کے
نقاش اس کا خاکۂ ابرو نکال کے — کرتا تھا شام عید مقابل ہلال کے
مدفن ہے جس جگہ ترے دیوانے کا وہاں — یاروں نے تودے دیکھے ہیں سنگ و سفال کے
اللہ رے بدگمانی کہ عاشق شبِ فراق — جوں سایہ پیچھے پیچھے پھرا کوتوال کے
جگنوں کو دیکھ کر ترے لاتے ہیں وقتِ شام — جگنوں سپند واسطے عین الکمال[2] کے
پیکانِ تیر اس کا ہوا یوں برونِ زخم — پانی سے سانپ جھانکے ہے جوں سر نکال کے
پیری کے باعث اپنے قویٰ ہیں خلل پذیر — پاتے ہیں ہم کمال میں نقصاں زوال کے
اس آفتاب رُو کے مقابل جب آوے ہے — چشمِ نظارہ بنتے ہیں روزن بھی ڈھال کے
ان سے بھی میرا وادیِ وحشت نہ طے ہوا — رہ رہ گئے غزال زبانیں نکال کے
گزرا ہے میری خاک سے شاید وہ شہسوار — ہیں دامنِ زمین میں تودے ہلال کے

1۔ پ: خاک پہ ہے ہولی کا سماں 2۔ عین الکمال = نظر لگنا (انیس عین الکمال سے تجھے بچّے خدا بچائے)

حاصل ہے یاں جنھیں انا لیلیٰ کا مرتبہ اپنے گلے میں سوتے ہیں بانہیں وہ ڈال کے
اے مہر پھینک دے اسے ہے شرطِ منصفی کس ہاتھ کے ہیں صدمہ رساں زخم ڈھال کے
ہشیاری میری خاک کے ذروں سے تھی عیاں جس دم قدم رکھیں تھے ہوا میں سنبھال کے
ہے اِن دنوں یہ حال کہ زنہار خرمی آتی نہیں قرین دلِ پُر ملال کے
کیا جانے ڈال رکھی ہے کس رشک مہر نے زنجیرِ زلف پانو میں روزِ وصال کے
کیا کام ہم کو ریختہ گوئی سے مصحفی
اب ہم ہیں صرف اَور ہی قال و مقال کے

467

ہم تیرہ بخت پاس گئے جس نہال کے پتّے نکالے اس نے زبانِ غزال کے
چاکِ جگر نہ اپنا سیا منفعل نہ ہو گندم ہمارا خاک سے سوزن نکال کے
کیوں عندلیب نے نہ سیا چاکِ جیبِ گل آئی تھی یہ تو باغ میں سوزن نکال کے
تنگِ چمن میں وہ ہوں کہ تربت سے میری آہ جاتی ہے بادِ صبح بھی دامن سنبھال کے
تڑپا اسیر ہو کے میں اتنا کہ ہو گئے مچھلی کی طرح جزوِ بدن حلقے جال کے
ہم کاٹ کاٹ کھاتے ہیں دانتوں سے اپنا گوشت طعمہ ہوئے جنوں میں نہ گرگ و شغال کے
وہ ناقبول ہوں میں کہ لاشے کو میرے آہ ساحل پہ پھینک دیوے ہے پانی اچھال کے
نقطوں سے خالِ لب کے ترے دیکھتے ہیں فال اس فن میں معتقد نہیں ہم دانیال کے
صحرا میں جذبِ خونِ شہیدانِ عشق سے ریگِ رواں کے ڈھیر ہیں تودے گلال کے
اے مصحفی ہے نقطہ و خط ہم کو خط و خال
ہم کس لیے فریفتہ ہوں خط و خال کے

468

لشکرِ گل پہ جو فوجِ دے و بہمن ٹوٹے کیوں نہ غم سے کمرِ مالکِ گلشن ٹوٹے

گو کشاکش میں دلِ شیخ و برہمن ٹوٹے — اے صنم پر نہ ترے ہاتھ کی سمرن ٹوٹے
شیشۂ آبلہ جوں توڑے ہیں تو نے اسی طرح — خارِ صحرائے جنوں تیری بھی گردن ٹوٹے
بادِ رختی سے ووں ہی لیوے مکافات صبا — گر الجھ کر ترا تار زہِ دامن ٹوٹے
موج دریا میں کرے بادِ صبا کو زنجیر — کبھی اس گل کا جو موے دمِ توسن ٹوٹے
تب جگہ پاوے تو صحبت میں خدادانوں کی — جب یہ خود بینی کا بت تجھ سے برہمن ٹوٹے
منتشر کیوں نہ ہوں درہائے معانی جس دن — رشتۂ نظم کلامِ بتِ الکن ٹوٹے
دخل بیجا کی نہیں اہلِ صفا کو برداشت — وہ ہی نازک ہے جو موتی دمِ روزن ٹوٹے
ہیں مرے آبلۂ پا یہ الم دوست کہ ہائے — خار اگر اس سے نکالوں سرِ سوزن ٹوٹے
آوے تب راہِ درستی میں فلک کی نقصاں — صدمۂ مشت سے جب بیضۂ آہن ٹوٹے

مصحفی اب وہ غزل پڑھ تو کہ جس کو سن کر
دوست سب شاد ہوں اور خاطرِ دشمن ٹوٹے

469

جس کے رخ سے ورقِ عصمتِ گلشن ٹوٹے — مسّیِ لب سے نہ کیوں روزۂ سوسن ٹوٹے
آرزو ہے کہ پس از مرگ مرا کاسۂ سر — اسی سفّاک کے زیرِ سمِ توسن ٹوٹے
ایک شیشے کا گلا اس نے نہ رکھا ثابت — یا رب اس محتسب شہر کی گردن ٹوٹے
مر رہے کیوں تری دیوار کے پیچھے نہ کوئی — دل میں جب حسرتِ نظارہ و روزن ٹوٹے
وائے قسمت کہ مرے قتل کو وہ برق انداز — چھید پیالے کا اگر کھولے تو سوزن ٹوٹے
سخت دشوار ہے پاسِ دلِ شوریدۂ عشق — تجھ سے یہ شیشہ مبادا بتِ پُرفن ٹوٹے
کیوں نہ مرتی مری روح جو ماتم میں مرے — ہار اس گل کے گلے کا دمِ شیون ٹوٹے

مصحفی یار کا کوئی بھی گلہ کرتا ہے
کیوں غضب تجھ پہ نہ اے عقل کے دشمن ٹوٹے

470

دم اسیروں کا نہ کیوں کر دمِ شیون ٹوٹے
ان کے آگے جو پرِ طائرِ گلشن ٹوٹے

نالۂ ساکنِ بت خانۂ الفت جو سنے
سرِ بت بر سرِ ناقوسِ برہمن ٹوٹے

ہاے رے لعل سی زیب کے بوسے کی صدا
اس لطافت سے نہ شاخِ گلِ سوسن ٹوٹے

کیا قباحت ہے کہ ہو تختۂ گل یوں تاراج
اک کلی تجھ سے نہ اے مالکِ گلشن ٹوٹے

حسرتِ شربتِ دیدار پسیں کی مت پوچھ
یوں نہ پیمانہ کسی کا دمِ مُردن ٹوٹے

دلِ مجنوں سے گزر جائے وونہی نشترِ تیز
پاے جمازہ میں گر خار کی سوزن ٹوٹے

نوکِ خنجر سے مرا زخم تو سی، اے جراح
لطف کیا اس کا جو سوزن پسِ سوزن ٹوٹے

مصحفی ہم کو گدا نکبتِ طالع نے کیا
اب یہ کنٹھا ہے فقیری کا، نہ سمرن ٹوٹے

471

جب دَورِ چرخ اہلِ مصیبت سے باج لے
کیا نام عشق ہر کوئی عاشق مزاج لے

مستغنی المزاج ہیں وے ہم کہ عمر بھر
حاتم کے سامنے نہ گئے احتیاج لے

جاوے اگر چمن میں ترے پیرہن کی بو
چاہے تو وہ نسیم و صبا سے خراج لے

آوے ملائمت پہ اگر طبعِ روزگار
کیا دور ہے جو سنگ سے کارِ زجاج لے

کیا جانے کل جیوں نہ جیوں تیرے ہجر میں
لینا ہے دل تو اس کو مری جان آج لے

لشکر کشی پہ آوے اگر بادشاہِ عشق
دارا سے تخت اور سکندر سے تاج لے

خواہانِ نقدِ دل نہ رہا کوئی مصحفی
جاؤں کدھر میں یہ درمِ بے رواج لے

472

جو روزِ بد کہ چاہے فلک تُو دکھا مجھے
ہے سچ تو یہ کسی سے نہیں کچھ گلا مجھے

جا کر صدف میں قطرۂ نیساں گہر ہوا زنداںِ تن نے اور بھی بخشی صفا مجھے
تختِ شہی سے کم بھی نہیں فرشِ بوریا درکار کیا ہے سایۂ بالِ ہما مجھے
رنجِ سوال سے تو کوئی دم اماں ملے سونے دے اپنی نیند تو[1] دستِ دعا مجھے
سیرِ چمن سے کام ہے کیا مجھ اسیر کو آئی ہے ساز وار قفس کی ہوا مجھے
آنے کا بندھ رہا ہے تصور یہ کس کے آج[2] جنبش سے دل کی آتی ہے آوازِ پا مجھے
کشتہ ہوں اس کے دستِ حنائی کا کیجیو مدفوں بہ زیرِ سایۂ نخلِ حنا مجھے
حسرت شہید ہوں نہ مرا ذکر تم کرو وہ کشتہ میں نہیں کہ ملے خوں بہا مجھے
اٹھنے کا گر زمیں سے کروں قصد میں ضعیف تو پائے مور ہی بس ہے برائے عصا مجھے
جاگا ہوں کتنی راتیں میں اے شورِ روزِ حشر سونے دے نیند بھر کے ابھی مت جگا مجھے
یارانِ رفتہ دور نکل گئے تو کیا ہوا پیچھے نہ چھوڑ تُو تو صدائے درا مجھے
تبرید نے کیا جو اثر زہر مار کا پچھتائے میرے یار پلا کر دوا مجھے

وہ قدر دانِ ظلمِ بتاں ہوں کہ مصحفی
زخمِ دگر ہے تیغ کا مرہم بہا مجھے

473

گلشن کی آرزو نہ چمن کی ہوا مجھے میں خاکِ رہ ہوں چھیڑ نہ بادِ صبا مجھے
اس راہِ ہولناک میں میرا گزر ہوا جس راہ میں کہیں نہ ملا نقشِ پا مجھے
میں وہ نہ تھا اجل بھی جو خالق سے مانگتا دوں ہمّتی نے میری بنایا گدا مجھے
یہ راہ وہ کٹھن ہے کہ جس میں ہر ایک گام ہادی کرے ہے اپنا مرا[3] رہنما مجھے
صدقے گیا میں بے ہنری کی تلاش کے جس نے لباسِ جہل میں رکھا چھپا مجھے
پھر چھوڑنا پڑے گا چمن تجھ کو بات مان اے عندلیب نغمہ سرا مت ستا مجھے
ویران کر کے خود کو بنا مشتِ استخواں ہے اس قدر تو خاطر چغد و ہما مجھے

1۔ ب : جو 2۔اصل: آہ 3۔ب : بڑا

اتنا گیا ہوں دور میں خود سے کہ دم بدم
کرنی پڑے ہے اپنی بھی[1] اب التجا مجھے

آپھی کمان و تیر ہوں آپھی نشان ہوں
کس نے کیا نشانۂ تیرِ بلا مجھے

اس شرگیں کا تا میں نہ ہوں باعثِ ملال
لاویں نہ کاش عرصے میں روز جزا مجھے

دنبالِ رخش اس کے دواں جوں غبار ہوں
لگتی نہ کاش دامنِ زیں کی ہوا مجھے

بیگانہ خوئیوں سے تری ہوں جو میں حقیر
دن رات دو کھتے ہیں مرے آشنا مجھے

خوابِ عدم میں دیدۂ نرگس صفت میں تھا
ناحق گئی جو بادِ بہاری جگا مجھے

معنی ہیں اس کے خاص ہم الفاظ مصحفی
کم ہے تو اس غزل کا جو دیوے صلا مجھے

474

دامن میں لختِ دل کی شمار آج ہو چکی
سمجھا میں یہ کہ فصل بہار آج ہو چکی

اس بت نے دیکھتے ہی ہمیں منھ چھپا لیا
ہم سے وداعِ صبر و قرار آج ہو چکی

ہے صدمۂ فراق سے شیریں کو دردِ سر
وہ بہر جوے شیر سوار آج ہو چکی

سرخی کا ہے یہ رنگ کہ ٹپکے ہے جس سے خوں
یہ آنکھ آرسی سے دوچار آج ہو چکی

توسن نے اس کے ٹاپوں سے مدفن مٹا دیا
برباد اپنی خاکِ مزار آج ہو چکی

مشاطہ اس قدر تو نہ رہ صرفِ سرمہ داں
بس مِیلِ سرمہ مَیلِ غبار آج ہو چکی

یہ نازکی ہے ہاتھ میں اس کے تو پھر سناں
سینے سے دردمندوں کے پار آج ہو چکی

پھر ہنستی آئی برق ادھر از برائے سیر
کھیتی ہمارے دل کی جو تاراج ہو چکی

وحشت نے میرے آبلۂ پا بہا دیے
شیخی تری بھی نشترِ خار آج ہو چکی

تیغ نگہ سے قتل ہوا اس کی مصحفی
قطعِ امیدِ بوس و کنار آج ہو چکی

کیا تجھ سے حالِ دل کہوں مت پوچھ ہم نشیں
اپنی کسی پہ جان نثار آج ہو چکی

1۔ پ: آپ ہی آپ

475

وحشت سرا میں دہر کی ہم دیر کب رہے سو سال بھی رہے تو بس اک شب کی شب رہے

تیغِ نگاہِ تیز ہے اس تند خو کی آج پیغامِ نامہ بر نہ کہیں زیرِ لب رہے

وہ ریگ زار بادیۂ عشق ہے جہاں صرصر سوار آتے ہی پھوڑوں[1] میں دب رہے

تھی نزع کی سی شب مری حالت جو تا سحر بالیں پہ میری جمع مرے دوست سب رہے

شاید کہ بعد مرگ ہو روزِ شبِ وصال ہم جیتے جی تو دشمنِ عیش و طرب رہے

از خویش رفتگاں کو ترے کیا ہے امتیاز ان بے کسوں پہ لطف رہے یا غضب رہے

لیلیٰ کا جیتے جی جو نہ اس سے ہوا نکاح قسمت میں یہ لکھا تھا کہ مجنوں عذب رہے

حسنِ سعاد[2] ہووے جو حورا پہ طعنہ زن مشتاقِ دید کیوں نہ ہر اہلِ طرب رہے

صیحہ کے جن کے کم نہیں یہ بانگ ہولناک عاشق کا نالہ سن کے نہ جیتا حرب رہے

مالی ہو گو بخیل پہ گل کے قلم کی طرح دستِ بریدہ چاہیے دستِ طلب رہے

پایا نہ بزمِ قرب میں وصل اس کے ایک نے بیرونِ در ہی سیکڑوں حرمت طلب رہے

قاتل نے تیغِ ناز کو رکھا ہے سان پر ہم کو یقیں ہوا یہ کہ ہم ٹھور اب رہے

اس باغ کی ہوا کا نہیں مجھ کو اعتماد تب جانو آبروگل و شبنم کی جب رہے

گستاخیوں سے اپنی نہ ہو کیوں کہ منفعل وہ جو ترے خیال سے شب لب بلب رہے

ہم صاحبانِ صبر سے ڈھونڈو نہ اختلاط عاشق سے ہو سکے ہے کہ پاسِ ادب رہے

کیا زندگی کا لطف ہے پھر ہم پہ مصحفی
قہرِ خدا نہ ہو تو بتاں کا غضب رہے

476

تکیے تلے جو جعد سے بال اس کا دب رہے صدمے شبِ وصال بھی ہم پر عجب رہے

1۔ ب : گھوڑوں 2۔ سعاد = ایک خوبصورت عورت

میں تو شبِ وصال نہ لوں اس کے چٹکیاں اپنی شرارتوں سے مرا ہاتھ جب رہے
پنڈے سے اپنے خاک ملیں کیوں نہ خوب رو اس مہہ کا زیبِ تن جو لباسِ قصب رہے
مضمونِ ضعفِ دل کو میں کیوں کر بیاں کروں نوکِ زباں تک آوے تو پھر زیرِ لب رہے
اٹھتے ہی میرے اٹھتے ہیں مجلس سے اہلِ بزم بزمِ نگاہِ ناز میں وہ سب کے سب رہے
شورِ جرس کی تاب نہ تھی دل کو کیا کریں ہم قافلے سے دور نہیں بے سبب رہے
ساقی خدا کے واسطے صرفہ ضرور ہے تلخی کے وقت بھی تو کچھ آبِ عنب رہے
وہ مست میں چلا ہوں جہاں سے کہ جس کا ہاتھ کنجِ لحد میں چاہیے ساغر طلب رہے
دیکھے تجلیِ رخِ جاناں جو مصحفی
موسیٰ[1] ابھی تو ہوش میں پھر ان پہ کب رہے

477

کسی کا تیغِ تغافل سے کام ہوتا ہے تڑپ تڑپ کے یہ بسمل تمام ہوتا ہے
صدائے نالہ یہ اس کی گلی سے آتی ہے کہ مجھ کو راتوں کو سونا حرام ہوتا ہے
اٹھاوے منھ سے تو اے رشکِ مہ اگر پردہ تو اک نگاہ میں یوسف غلام ہوتا ہے
کھڑے رہے ہیں وہاں چوبدار مژگاں کے ہمیشہ بر درِ چشم اہتمام ہوتا ہے
شبِ فراق بھی مجھ کو تو دکھ دہند ہوئی
کسی کا روزِ سیہ کیوں کہ شام ہوتا ہے

478

حیلے سو آپس میں ہوتے ہیں دلوں کی لاگ کے ہم تلک تو تم کبھی آتے بہانے آگ کے
موسمِ ہولی ہے دن آئے ہیں رنگ اور راگ کے ہم سے تم کچھ مانگنے آؤ بہانے پھاگ کے

1۔ نسخوں میں اشعار کی ترتیب غلط ہے۔ قیاس سے درست کی گئی۔ نسخہ پٹنہ میں یہ غزل حاشیے پر ہے۔ اکثر اشعار کٹ گئے ہیں۔

عشق کے ہاتھوں سے نالاں ہیں سبھی خورد و بزرگ ہیں کلیجے سیکڑوں کھائے ہوئے اس ڈاگ کے
دیکھ کر چوٹی کو اس کی اہلِ دانش نے کہا کس طرح بچتے ہیں کاٹے ایسے کالے ناگ کے
کان[1] سے آویں نہ پھگوا ماگنے کیا گوالنیں شورش و مستی کے رت ہوتے ہیں دن یہ پھاگ کے
لال لال آنکھیں شفق سے شام کے سر پر جٹا ہم ہیں پیرِ چرخ دیوانے ترے بیراگ کے
ہاتھ سے میرے چھڑا مت ورنہ کر ضد آ چڑھی ٹکڑے کر ڈالوں گا میں گھوڑے کی تیرے باگ کے
بازیِ پیرِ آسماں سے ہم تو پا سکتے نہیں کیوں مقابل کر دیا طالع نے ایسے گھاگ کے

پینڈیوں بن میٹھی کے آتا نہیں اب ان کو چین
کھانے والے مصحفی جو تھے چنے کے ساگ کے

479

تیغِ ابرو کے تصور میں جو خوں جوش کرے موت کو اپنی کوئی کیوں کہ فراموش کرے
مار کیونکر نہ بھلا مار کے شانہ مرجائے جب کہ کاکل کو رہا وہ بسرِ دوش کرے
وائے قسمت رہوں میں کم بختِ ازل ساقیِ بزم کاش شیشے میں کوئی جرعہ فراموش کرے
باز آنے کے نہیں نالہ و فریاد سے ہم جس قدر چاہے تجھے ناز گراں گوش کرے
شعلۂ شمع سے کچھ کم بھی نہیں آتشِ عشق دن کو مہلت دے تو آ شب کو بدن نوش کرے
ربطِ صحبت ہی نہ رندوں کو رہا ساتھ اس کے کون اب پرسشِ یارانِ کفن پوش کرے
دوست رکھتا تھا میں پھولوں کے تئیں بعد از مرگ میری تربت کو صبا چاہیے گل پوش کرے
حشر کے دن بھی نہ تربت سے اٹھے وہ مردہ بیہشی سبزۂ خط کی جسے بے ہوش کرے

مصحفی ایک غزل اور بھی میں لکھتا ہوں
اس زمیں میں، جو توجہ سے کوئی گوش کرے

480

گردِ ہستی کا جو خورشید کو روپوش کرے چاہیے نطق بہ مُہرِ لبِ خاموش کرے

1۔ ہر نسخے میں اس طرح ہے۔

جلوہ جب مانگ کا وہ صبح بنا گوش کرے　　کیوں نہ رہ قافلۂ صبح فراموش کرے
بارِ منت کشیِ خلق ہے اک کوہِ گراں　　کاش اجل آکے مجھے اس سے سبک دوش کرے
مے سے تھا عشق بہت مجھ کو خُمِ مے کا کلال　　کاسۂ سر کو مرے چاہیے سرپوش کرے
تیغِ ناز اس کی میں ہیں دوست کُشی کے جوہر　　نہیں اچھا کہ عزیزوں کا لہو جوش کرے
دوستاں یہ بھی مقدر میں لکھا تھا میرے　　جس کو میں یاد کروں مجھ کو فراموش کرے
مصحفی یہ تو گرے پڑتے ہیں پھر پیرِ مغاں
تابکے خاطرِ رندانِ سبو نوش کرے

481

لگ سکی جس کی کٹاری نہ چھری آنکھوں سے　　مجھ کو دیکھے ہے وہ کچھ ایسی بُری آنکھوں سے
برگِ یاقوت بنے ہیں مرے مژگاں اس میں　　اُبلی پڑتی ہے زبس خوں کی پری آنکھوں سے
دم شمشیر سے کچھ کم نہیں کاجل کی دھنک　　کیوں نہ وہ شوخ کرے شیشہ گری آنکھوں سے
آکھلے[1] کے جو وہ صدمے سے کبھی جاوے ٹوٹ　　میں بناؤں تری گاڑی کی دھری آنکھوں سے
پیر استاد کی اپنے نہیں عزت رکھتیں　　الاماں مانگیے ایسی نگری آنکھوں سے
جس کے پانو میں لگی وادیِ مجنوں کی ہے گرد　　لیلیٰ پونچھے ہے وہ آہو کی کھری آنکھوں سے
مصحفی موذی کے چنگل میں نہ آجاوے کہیں
ہے عیاں شوخ کی لیکن شتری آنکھوں سے

482

آتی ہے ریاکاریِ زُہّاد ہمیں بھی　　پاکھنڈ بہت ایسے تو ہیں یاد ہمیں بھی
کہتی تھی بگولے سے یہی خاکِ غریباں　　ساتھ اپنے کیا تو نے تو برباد ہمیں بھی
کیا شکوہ کریں چاہِ زنخداں میں کسی کے　　تو نے تو ڈُبایا دلِ ناشاد ہمیں بھی

1۔ آکھلے (آکھلاپن = گھوڑے کی اچھل کود)

صد شکر موے قید میں ہمراہِ اسیراں کرنی نہ پڑی منّتِ جلاّد ہمیں بھی
کچھ اتنا بڑا کام نہیں سر سے گزرنا دیوے جو خدا ہمتِ فرہاد ہمیں بھی
گر کوئی شناسا ہے مرقع ہو تو اب تک ہے یاد قلم کاریِ بہزاد ہمیں بھی
ہوویں گے ہم آواز ترے موسمِ گل میں رہنے دے یہاں مرغِ چمن زاد ہمیں بھی
اے مرغِ گرفتار نہ کر شور قفس میں کرنے دے کوئی زمزمہ بنیاد ہمیں بھی
گو چھوڑے اسیروں کو گماں یہ نہیں ہوتا صیّاد کرے فصلِ گل آزاد ہمیں بھی
اب ذبح تو کرتا ہے ولے یاد کرے گا اک عمر تلک دشنۂ فولاد ہمیں بھی
سب کہہ چکے احوال کسی روز ملے گی سرگوشی کی رخصت ستم ایجاد ہمیں بھی

اے مصحفی اس گل کا اگر گوش گراں ہے
گو ہووے نہیں طاقتِ فریاد ہمیں بھی

483

صدمہ مقدر اور کوئی گلستاں پہ ہے پھر برق کی نظر جو مرے آشیاں پہ ہے
میں جانتا ہوں اس کو فقط گوشت کھایئے یاں آبِ تیغ مغز تہِ استخواں پہ ہے
سننے[1] کے اشتیاق میں لیلیٰ ہے سرِ بام مجنوں کے برگِ گل ابھی نوکِ زباں پہ ہے
ہم مر مٹے ہیں اس پہ بھی جاتا نہیں حجاب کتنا مزاجِ نازِ بتاں امتحاں پہ ہے
اک ہاتھ اور چھوڑ کہ قصہ ہی پاک ہو تجھ کو گمان زیست گر اس نیم جاں پہ ہے
جوں نقشِ پا زمیں پہ پڑے ہیں تو کیا ہوا عریاں تنوں کا تیرے دماغ آسماں پہ ہے
کس کو دکھاؤں میں دلِ صد پارہ کی بہار صد برگ کا سا گل تری نوکِ سناں پہ ہے
تا سمجھے یار اس سے کنائے کو وصل کے مضمون خط مرا ورقِ تواماں پہ ہے
لیلیٰ سنے ہے کب دلِ مجنوں کی شورشیں کان اس کا نالۂ جرسِ کارواں پہ ہے
کر لے حنائی پانو تو اپنے کہ اب تلک خونِ شہید تازہ ترے آستاں پہ ہے

1۔ اصل: سیٹی

بے چین ہیں سبھی تری طرزِ خرام سے
اک کوفت سی ز بس دلِ پیر و جواں پہ ہے

دیکھا ہے کس نے غنچۂ تصویر کو کھلا
تہمت شگفتگی کی عبث اس دہاں پہ ہے

حال اس کا کچھ چھپا تو نہیں جورِ چرخ سے
ظلمِ صریح مصحفیِ ناتواں پہ ہے

484

کچھ غم نہیں گر اہلِ سخن رنج میں رہے
عاشق کا چاہیے کہ بدن رنج میں رہے

مدفوں تو زیرِ خاک انھیں کر دیا و لے
عاشق ترے بغیرِ کفن رنج میں رہے

اے خامشی تو داد کو فریاد کی پہنچ
کب تک زباں میانِ دہن رنج میں رہے

بلبل کی طرح شب جو میں نالہ کیا کیا
تا صبح ساکنانِ چمن رنج میں رہے

زنداں ہے خانہ، خانہ نشیں کے لیے کہ شمع
جب تک رہے میانِ لگن رنج میں رہے

پہنچی تو انھوں کو بھی تری بوے زلف لیک
فرقت سے آہوانِ ختن رنج میں رہے

چینِ کمندِ آہ دکھاؤں تو حشر تک
اس زلف کی شکن سے شکن رنج میں رہے

بارے کبھی تو اس کو کنویں سے نکالیے
کب تک تمھارا خالِ ذقن رنج میں رہے

راحت ہوئی نصیب کسی کو نہ مصحفی
یاں ہم سے لاکھ اہلِ سخن رنج میں رہے

485

دل نہ جلا کسی کا تو زمزمۂ ہزار سے
بوے کباب سوختہ آتی ہے لالہ زار سے

خاک میں گو ملائے چرخ مجھ کو میں وہ غبار ہوں
جو کہ کبھی گرا نہیں رتبۂ اعتبار سے

جی میں بھری ہیں نفرتیں آٹھ پہر یہی ہے سوچ
کیوں کہ کنارا کیجیے چرخِ ستم شعار سے

گر یہی سوزِ دل ہے تو جاے غبار اے نسیم
بعدِ فنا بھی اٹھیں گے شعلے مرے مزار سے

تنگی کرے ہے حوصلہ اب مرا ورنہ پیش ازیں
کام مجھے کبھی نہ تھا شکوۂ روزگار سے

سب کے گلے پہ تم رہے کند چھری ہی پھیر کے　　ذبح کیا کسے میاں خنجرِ آبدار سے
ہوتی نہیں جو ایک دم ساتھ سے میرے یہ جدا　　عقد بندھا تھا کیا مرا اس شبِ انتظار سے
ہے اسی طرح سنگ پر کام میں دستِ کوہ کن　　آتی ہے تیشہ کی صدا اب تئیں کوہسار سے
بو جو خوش آگئی مجھے مارے خوشی کے مصحفی
منھ نہ اٹھا تمام شب پھولوں کے اس کے ہار سے

486

ہے اس کے کف میں تیغِ تغافل کھنچی ہوئی　　گل کی طرف جو جائے ہے بلبل کھنچی ہوئی
آپھی وہ بدگمان ہے کچھ ورنہ ہم سے تو　　ابرو کھنچی ہوئی ہے نہ کاکل کھنچی ہوئی
لاشہ مرا نظر ہی پڑے قتل گہہ میں یار　　رکھے اگر عناں بہ تامّل کھنچی ہوئی
اس زلف سے کیا تھا کہیں قصدِ[1] ہمسری　　سو محکمے کو جائے ہے سنبل کھنچی ہوئی
کیا انتظارِ بادہ کروں میں کہ مصحفی
جاتی ہے جان ہی دمِ قلقل کھنچی ہوئی

487

دل قصدِ ہم نشینیِ دلدار کیا کرے　　مرغِ اسیر خواہشِ دیوار کیا کرے
دم آنکھوں میں تو آگیا اب آگے دیکھیے　　عاشق کے ساتھ حسرتِ دیدار کیا کرے
کر ذبح مجھ کو یار مرا ہو کے مضطرب　　گر پھینک دے نہ ہاتھ سے تلوار کیا کرے
عیسیٰ سے ہو سکے دلِ بیمار کی دوا　　لیکن علاجِ نرگسِ بیمار کیا کرے
جب کم ہو نفخِ سور سے یہ نالۂ ضعیف　　خوابیدہ کانِ خاک کو بیدار کیا کرے
جو پھینکتا ہو کنگرۂ عرش پر کمند　　اندیشہ بلندیِ دیوار کیا کرے
عاشق کے تیرے کوچے سے اٹھتے نہیں ہیں پانو　　مٹ جائے جب کہ طاقتِ رفتار کیا کرے

1۔ ب: لاف

وصلِ خیال جس کو میسر ہو بے خطر جز سجدہ ہاے شکر شبِ تار کیا کرے
جب آب و دانہ ہی نہ ملے اس کو مصحفی
رو کر قفس میں مرغِ گرفتار کیا کرے

488

کیا قدر انھیں دامِ محبت میں پھنسے کی ہوتی ہے میاں موہ جنھیں پاس بسے کی
اے گل نہیں بے وجہ ترا چاک گریباں دیکھی ہے پھبن تو نے کسی چولی پُسے کی
ہوتی نہیں افیوں سے رسا کیف محبت اک چھونے سے جب کافی ہے عارض کے مسے کی
دل پیچ میں آتا ہے ترے جعدِ سیہ کے اب کوئی لہر اترے ہے کالے کے ڈسے کی
اس آتشِ سوزاں پہ کرے کون نظر گرم خورشیدِ قیامت ہی نے جب آنکھ نہ سیکی[1]
اے مصحفی کس کام کا، ناقص ہو جو سونا
ہے قدر زمانے میں کسوٹی کے کسے کی

489

نالے سے قصرِ چرخِ جفا کار توڑیے یعنی بنائے ظلم کی دیوار توڑیے
کیا زندگی کی کفر سے ہوجائے مخلصی تارِ نفس کی اپنے جو زنار توڑیے
رکھا ہے میں نے ان کو سگِ یار کے لیے اے تب نہ استخوان تنِ زار توڑیے
دندانِ یار سے تُو کرے لافِ ہمسری پتھر سے تجھ کو اے دُرِ شہوار توڑیے
زندانیِ فراق کے دل میں ہے یہ خیال زنجیر توڑ چکیے تو دیوار توڑیے
جینا ترا محال ہے، ہر دم پھڑک پھڑک ناحق قفس نہ مرغِ گرفتار توڑیے
بالیں پہ میرے آئے نہ اس کا خیال بھی گر پھروں جاں بہ حسرتِ دیدار توڑیے
بدمستی اس کے شہر میں ظاہر جو کی تو کیا جوں لالہ جامِ برسرِ کہسار توڑیے

1۔ سیکی = سینکی

شانے سے اس کے جعد کی گر روکشی کرے ہاتھوں سے کنگھے سر سرکار توڑیے
رکھوایئے جو شیخ کے سر پر خمِ شراب لاٹھی سے اس کو بر سرِ بازار توڑیے
گر پاس دل پہ آئے تو اے ابرِ قطرہ زن شیشہ حباب کا بھی نہ زنہار توڑیے
میاں مصحفی پرویئے موتی کچھ اور بھی
رشتے کا نظم کے نہ ابھی تار توڑیے

490

اے مصحفی نہ سبحہ نہ زنّار توڑیے پتھر سے اپنا ہی بتِ پندار توڑیے
طوقِ گلو ہیں کب سے گریباں کے میرے تار دستِ جنوں سمجھ کے یہ زنّار توڑیے
اے نالہ کیجیے دہر میں اپنی بھی کچھ نمود ناقوسِ برہمن کو بہ یک بار توڑیے
آتی ہے یاں شکست ہی فوجِ حواس پر طرفِ کلہ نہ ترکِ جفاکار توڑیے
چوری کا ڈھب تو کوئی نہیں اور واں مگر اک رات درمیان کی دیوار توڑیے
اے گل روا ہے کب یہ ستم عندلیب پر جرمِ خیالِ بوسہ پہ منقار توڑیے
کرتا ہے ان سے نامہ بری یہ بسوے قیس لیلیٰ کے سگ کے دانت نہ زنہار توڑیے
ہولی کی شب میں چرخ کو اکب کو ہے ہوس اک روز قمقمہ بہ رخِ یار توڑیے
بجلی سی کوندے ہے یہ مرے آشیان پر یہ تو غضب نہ آہِ شرربار توڑیے
گستاخیِ خیال سے کانپے ہے اپنا جی پھر کیوں کہ اس کا دستِ ہوس ہار توڑیے
پاے جنوں بہار کے دن عنقریب ہیں کوئی تو آبلہ بہ سرِ خار توڑیے
ابرِ بہار سے ہے کسے بحث کا دماغ کاہے کو قدرِ دیدۂ خونبار توڑیے
ہے سلسلہ دراز ابھی تو یہ مصحفی
خامہ کے پاے شوخیِ رفتار توڑیے

491

تسبیح مثلِ رشتۂ زنّار توڑیے
اک دن تو کفر زاہد و دیں دار توڑیے

یہ دست برد خوب نہیں اس سے کیا حصول
توڑا جو تیرے ہاتھ کا دلدار توڑیے

پیری ہے وقتِ نقل مکاں ہاں درخت سے
سچ ہے جو شاخ خشک ہو بیکار، توڑیے

وہ ہاتھ ٹوٹ جائیو! یا رب شبِ وصال
جس ہاتھ سے گلے کا ترے ہار توڑیے

ہمسایہ ہوں میں یار کا احسان ہے ترا
اک کھڑکی اس طرف بھی جو معمار توڑیے

اک زخم کارگر نہ لگا جب مرے، کہا
اب سنگ و خشت پر ہی یہ تلوار توڑیے

کر چوری نظر سے نظر اس کے روز وصل
گو اس میں کچھ ہو پھر تو نہ دو تار توڑیے

اے دستِ آز کیجے نہ تاراج گلستاں
گل ہو جو سونگھنے کے سزاوار توڑیے

جس باغ میں کھلے ہی نہ چینِ جبینِ گل
پتّا بھی اس چمن کا نہ زنہار توڑیے

پھیلایئے نہ دستِ طلب اس کے سامنے
جس نخل سے نہ شاخِ ثمردار توڑیے

ساقی نہ دے شراب تو کچھ اس کا ڈر نہیں
خود اس ہوا میں توبہ بہ یکبار توڑیے

مرغِ اسیر مرضیِ صیّاد ہے ابھی
اس رت بھی دم قفس ہی میں ناچار توڑیے

ہے دے کے مجھ کو جام پٹک ساقی، ہے یہ رسم
ظرفِ دوائے مردمِ بیمار توڑیے

جامِ جہاں نما میں یہ عالم کبھی نہ تھا
آئینہ پیشِ خوبیِ رخسار توڑیے

تا ہو نہ اس کو اَور خریدار کا گماں
شیشے کو دل کے پیشِ خریدار توڑیے

ہے میکشی کا لطف تو تب جب کہ مصحفی
مستی میں شیشہ بر سرِ خمّار توڑیے

492

اوپر سے سقفِ خانۂ دلدار توڑیے
ہے دزدیِ صریح جو دیوار توڑیے

خاطر کو میکشوں کی نہ خمّار توڑیے
بھپکا خُمِ شراب کا یکبار توڑیے

ایسا ہی تجھ سے نالۂ موزوں ادا ہوا بلبل روا ہے گر تری منقار توڑیے
جزوِ بدن ہے اپنا سلیمان کی طرح پھر ہم نہیں گلے کا جو زنّار توڑیے
خط کا جواب واں سے تو ہوتا نہیں حصول قاصد کے پانو کاہے کو ہر بار توڑیے
پتھر سے حرفِ سخت نہیں کم بھی مہرباں شیشہ کسی کے دل کا نہ زنہار توڑیے
حیرت سے تیرے ہجر میں بت بن گیا ہوں میں قاتل لگا کے مجھ پہ نہ تلوار توڑیے
کرنے لگا قفس میں بھی پرواز کی یہ مشق صیّاد بالِ مرغِ گرفتار توڑیے
اب کے بہار میں تجھے دکھلایئے صبا کلیاں جو باغِ وصل کی دو چار توڑیے
سنگیں دلوں کی بزم میں ہے پاسِ دل ضرور یہ شیشہ وہ نہیں جسے اے یار توڑیے
رکھیے نہ پانو قبر پہ مُردوں کی بے دھڑک کاسہ کسی کے سر کا نہ زنہار توڑیے

دیجے شرابِ لطف کا ساغر اسے میاں
آخر خمارِ مصحفیِ زار توڑیے

493

حال مجبوری میں کیوں کر دل بتاں سے اٹھ سکے زور کچھ ہووے تو پتھر ناتواں سے اٹھ سکے
سیر گلشن کو ہم آئے تھے، لیے ہم نے اٹھا جس قدر دامن میں پھول اس گلستاں سے اٹھ سکے
کیا خوشی سے گزریں اپنے چند روز اے دوستاں رسمِ الفت گر کسی صورت جہاں سے اٹھ سکے
کاہ کی طاقت بھلا ہو کوہ کی کیونکر حریف بارِ غم کس طرح اس آزردہ جاں سے اٹھ سکے
قصہ گویاں پاسِ خاطر پر مرے مت جاؤ وہ کہو تم کو بھی حظ جس داستاں سے اٹھ سکے
کوئے قاتل میں جنازہ مت رکھو یارو مرا سخت مشکل ہو جو پھر ہرگز نہ واں سے اٹھ سکے
قہر ہے اس کے گلے کو بھینچے[1] رکھے ضبطِ عشق شورِ محشر جس کے فریاد و فغاں سے اٹھ سکے
رنگ عارض خط سے کیا چھلکے کہ ہے انجامِ حسن تند ہو آتش تو پھر شعلہ دخاں سے اٹھ سکے

1۔ ب: بھینچے

ارمغاں زاہد کی خاطر لے چلوائے میکشاں گر کوئی مے کا سبو دیرِ مغاں سے اٹھ سکے
برگِ گل کا حکم ہے سل کا مری چھاتی پہ آہ کیوں کہ پھر مجھ سا سبک خواب گراں سے اٹھ سکے
سیر کرتی ہے نظر اس آتشیں کی غم نہیں گو نہ لاہی کا دوپٹا درمیاں سے اٹھ سکے
گو کہ چونا ہو گئے ہیں جل کے پر، اے چشمِ تر چھڑکے گر پانی تو پھر دو استخواں سے اٹھ سکے
دفن ہونا مصحفی مجھ کو بھی ہے واں فرضِ عین
خوں مرا گر کر نہ جس کے آستاں سے اٹھ سکے

494

میں نہ دیکھا غیر تو اپنے مکاں سے اٹھ سکے آئینہ کیونکر بھلا آئینہ داں سے اٹھ سکے
جم کے وہ بیٹھے جہاں ہرگز نہ واں سے اٹھ سکے ظلم یہ کب عاشقِ بے خانماں سے اٹھ سکے
بدمزاجی پر مری کیونکر اجل کھاوے نہ رحم نازِ بیماراں طبیبِ مہرباں سے اٹھ سکے
باغ کی خیرات لے جانے دو اس کو بھی یہ برگ پنکھڑی گل کی اگر بادِ خزاں سے اٹھ سکے
ایک دو ساغر سے مجھ میکش کی تسکیں کب ہوئی خُم اٹھا لاوے اگر پیرِ مغاں سے اٹھ سکے
گالیاں دو کھا کے اٹھ جاؤں گا میں ڈر سے ترے حاجتِ تیغ اس کو کیا ہے جو زباں سے اٹھ سکے
یہ نہیں کہتا صبا سب کھول دے اس کا بدن دے اٹھا بے ساختہ پردہ جہاں سے اٹھ سکے
گر نہ پہنچے صور کو انفاسِ عاشق سے مدد روزِ محشر کب کوئی خوابِ گراں سے اٹھ سکے
غائبانہ تیری اور اس کی دلا شطرنج ہے کر وہ منصوبہ نہ بازی درمیاں سے اٹھ سکے
ظلم ہے اس پر تمازت میں قدم رکھنا صریح دو قدم بھی جو نہ باہر سائباں سے اٹھ سکے
اک غزل کی اور بھی اے مصحفی رکھ تو بنا
یہ محل گر خامۂ جادو بیاں سے اٹھ سکے

495

گر کوئی مر جاوے نعش اس کی جہاں سے اٹھ سکے یہ نہیں ممکن کہ دلِ عشقِ بتاں سے اٹھ سکے

طاقتِ منقار اسے بارِ نزاکت کی نہیں
لے اٹھا بلبل جو برگِ گل زباں سے اٹھ سکے

خوف میں جس کی بھرا ہو عشق کی لذت کا مغز
کیوں کہ منقارِ ہما اس استخواں سے اٹھ سکے

تیرا عاشق تو اڑی سل بن گیا در پر ترے
اب یہ سل کس طرح زورِ پاسباں سے اٹھ سکے

تو ہی اے دستِ رسائے نالہ شفقت کر کہیں
تجھ سے گر چلمن کا پردہ درمیاں سے اٹھ سکے

نازِ معشوقاں اٹھاتے ہیں نہیں شرکت کا کام
یہ نہ وہ چھپرّ ہے جو پیر و جواں سے اٹھ سکے

آفریں کہتا ہوں میں نالے کو اپنے کس طرح
بارِ رسوائی درائے کارواں سے اٹھ سکے

اشکِ بلبل برق کی آتش کو کر دیتے ہیں سرد
شعلہ کیونکر تند اس کے آشیاں سے اٹھ سکے

تیرے دیوانے کا بعد از رقص بھی ممکن نہیں
پانو آ کے گل فروشوں کی دکاں سے اٹھ سکے

ہو چکی ہے زور پرسش کو تہی قسمت کی دیکھ
جب تلک عاشق تہِ سنگِ گراں سے اٹھ سکے

سر مرا زخموں کی کثرت سے بنا گیندے کا پھول
اور کیا ہے گر تری نوکِ سناں سے اٹھ سکے

مجھ سا ساجد گر کرے سجدہ تو لذت کے سبب
تا قیامت سر نہ اس کے آستاں سے اٹھ سکے

کہربائی رنگ تو رکھتا ہے پر ممکن نہیں
ایک تنکا مصحفیِ ناتواں سے اٹھ سکے

496

کیوں خموشی کا ستم اس خستہ جاں سے اٹھ سکے
گر گلا بیٹھا ہوا پھر بھی فغاں سے اٹھ سکے

کم نہیں دیوارِ قہقہہ سے یہ پردہ شرم کا
میں بھی حیراں ہوں کہ کیونکر درمیاں سے اٹھ سکے

دستِ زور اپنا دکھاوے تو بھی اک دن بعد ذبح
گر سرِ عاشق تری نوکِ سناں سے اٹھ سکے

ہجر کی شب ضبط کرتا ہوں بہت میں ورنہ آہ
شعلہ اک جب چاہے اونچا آسماں سے اٹھ سکے

دعویِ طاقت کریں کس منہ سے پھر ہم ناتواں
ایک تنکا بھی نہ جب نوکِ سناں سے اٹھ سکے

داد خواہی کو تو ہم عرصے میں آتے لیکن آہ
کس طرح کوئی تہِ سنگِ گراں سے اٹھ سکے

یاد آتا ہے مجھے اے گل ترا نرگس کا ہار
ہجر کی شب آنکھ کیونکر کہکشاں سے اٹھ سکے

اب تو آسن مار کے بیٹھے ہیں واں ممکن نہیں
مرگ چھالا اپنا کوے دلبراں سے اٹھ سکے

جھڑکیاں اور گالیاں خاطر میں جو لاتا نہ ہو
ڈھیٹ مجھ سا کیوں کہ پھر کوے بتاں سے اٹھ سکے

دستِ عاشق تو رہا یکسو، نہیں پڑتا گماں
بوجھ بہلہ کا بھی اس نازک میاں سے اٹھ سکے

اس کی خاطر خاک میں مل جاؤں گر میں تیرہ بخت
تو بھی آنکھ اس کی نہ ہرگز سرمہ داں سے اٹھ سکے

ہو اڑی سل جم گیا ہے در پہ میرے مصحفی
کیوں کہ یہ دیوانہ سنگِ کودکاں سے اٹھ سکے

497

ہاتھ دامانِ تلاشِ این و آں سے اٹھ سکے
اس سے کیا بہتر جو دل دونوں جہاں سے اٹھ سکے

شورِ مرگِ تازہ اک دم میں جہاں سے اٹھ سکے
تیشۂ فرہاد گر اس ناتواں سے اٹھ سکے

چھوڑ دے گلزارِ ہستی کو تو اے مرغِ چمن
جوں ہما گر دل خیالِ آشیاں سے اٹھ سکے

ہاتھ میں لیوے وہ کیونکر اپنے نرگس کی قلم
جا ہی جو ہی کا نہ گل جس کی بناں سے اٹھ سکے

جاویں کیوں سوے عدم زردار با دستِ تہی
ساتھ اسبابِ معیشت گر جہاں سے اٹھ سکے

کب ہے مجنوں کا گلا شایانِ زنجیر اے عجوز
بارِ آہن کیونکہ مشتِ استخواں سے اٹھ سکے

نقش اپنا سنگ در پر، اس کے بیٹھا ہے درست
دارباں دیوے اٹھا گر دارباں سے اٹھ سکے

مثلِ گردِ کارواں وامانده جب ہو اک ضعیف
پانو آگے کیوں کہ اس کے ہمرہاں سے اٹھ سکے

ہم گدا بیٹھے ہیں جم کر اب بہت دشوار ہے
بسترا اپنا درِ پیرِ مغاں سے اٹھ سکے

نقشِ پا کی طرح ہم اس کو میں کیوں بیٹھے رہیں
پاے خفتہ اپنا گر خوابِ گراں سے اٹھ سکے

تجھ کو یوسف پر نہیں ترجیح دیتا پر صنم
جس دکاں میں تو ہو فتنہ اس دکاں سے اٹھ سکے

مصحفی چوسر میں جب پانسہ ہی کرتا ہو کمی
تو ہی پھر بتلا کہ رنگ اپنا کہاں سے اٹھ سکے

498

کُشتے ترے باز آئیں نہ ہرگز تگ و پو سے
سر کاٹ لے گر تُو تو چلیں راہ گلو سے

ڈر دل میں رہا اس کی زبس تندیِ خو سے
بوسہ نہ لیا ہم نے کبھی یار کے رو سے

عالم وہ صفا کا جو سدھارا ترے رو سے
نشتر زنیِ تازہ ہے اب سر سرِ مو سے

لیتا ہے کوئی ظلم کا معشوق کے بدلا
ہم کنبہ کشی کیوں کہ کریں ایسے عدو سے

اے جوشِ جنوں موسمِ افسردہ دلی میں
اس چاکِ گریباں کو بچانا تو رفو سے

ہرچند کہ ہم کشتنیوں میں نہیں تو بھی
ہے دشنۂ بیداد کو اک راہ گلو سے

اس بات کو سن کر مجھے اک ہووے ہے حیرت
امید کسو کی جو بر آتی ہے کسو سے

سجدے میں بھی اک بے ادبی مجھ سے ہوئی ہے
محراب منقش ہے مرے سر کے لہو سے

دیکھا ہے صنم جب سے تجھے پان چباتے
بلبل کو ہے نفرت دہنِ غنچہ کی بو سے

سختی سے دلِ یار کی ٹوٹے نہ مرا دل
صحبت کبھی بنتی نہ سنی سنگ و سبو سے

از بسکہ ہوا یاں کی خوش آئی ہے اسے آہ
چلتا نہیں عاشق کا جنازہ ترے کُو سے

لکھنا ہے غزل اور بھی اک مصحفی اس دم
اے پائے قلم باز نہ رہنا تگ و پو سے

499

ہستی مری پاتا ہے حبابِ لبِ جُو سے
منزل کو میں پہنچا تو ہوں پر سو تگ و پو سے

آشفتگی نکلے ہے پریشانیِ مُو سے
دل اس کا بھی الجھا نظر آتا ہے کسو سے

اس ضبط کے صدقے ہوں کہ مجلس میں بتاں کی
نالے کو نہیں حکم نکلنے کا گلو سے

ساقی دلِ نازک کا مرے پاس تو رکھنا
ٹکرائے یہ شیشہ نہ کہیں لڑ کے سبو سے

ہے جوشِ جنوں اتنا کہ دیوانے کی تیرے
گر فصد بھی لیجے تو کف اٹھتے ہیں لہو سے

ماہی کی طرح میں ہوں وہ مذبوح کہ ہرگز
خنجر کے تئیں ربط نہیں جس کے گلو سے

وہ زخمِ ملامت مرے سینے میں لگے ہیں　فرصت نہیں ناصح کے تئیں جن کے رفو سے
کیا دشمنی ایسے سے کرے کوئی بتاؤ　جو جان بھی رکھے نہ دریغ اپنے عدو سے
مجنوں نے کہا زمزمۂ پوچ سن اس کا　ہو کون مقابل جرسِ بے ہودہ گو سے
اب شیشۂ ساعت کی طرح خشکی کے باعث　گریہ کی جگہ ریت نکلتی ہے گلو سے
کیا جانیے کیا مصحفیِ خستہ کو بھایا
اتنا بھی تو خوگر یہ نہ تھا روے نکو سے

500

سیری نہیں یک لحظہ اسے روے نکو سے　عاجز ہوں بہت دیدۂ کم بخت کی خو سے
خالی ہے سراپا یہ تنِ خشک لہو سے　قاتل تو عبث تیغ کو رکھے ہے گلو سے
تکیے کو ترے بالشِ سر اپنا کیا تھا　غش آ گیا لیلیٰ کو تری جعد کی بو سے
ٹک لب کے ہلاتے ہی نکل جاتے ہیں کانٹے　اک چاکِ جگر ہم نہ سلاویں گے رفو سے
دریا کی طرح جامۂ عریاں تنی اپنا　جب دیکھو مزیّب ہے خدا ساز اُتو سے
سینے میں ٹھہر اے دلِ بے تاب خدا را　راتوں کو کبوتر نہ اڑا نعرۂ ہُو سے
جب اس نے اسے شیشۂ مودار بنایا　بچتا ہی لگا دل کمرِ یار کے مو سے
کیسی نگہِ گرم سے دیکھا ہے کہ کافر　بے دخل غضب جوشِ عرق ہے ترے رو سے
فصّاد نہ ہو صرفۂ نشتر تو نہیں غم　انگلی کو بچانا تو مرے گرم لہو سے
میں کس لیے سامان کروں جنگ کا اس کی　لیوے گا زمانہ ہی سمجھ میرے عدو سے
کشتہ تری مژگاں کا وہاں دفن نہ ہووے　سبزے کی جگہ اُگتے ہیں نشتر لبِ جو سے
تر کردے مری خاک کو اے ابرِ بہاری　سیراب یہ ہونے کی نہیں مشک و سبو سے
اے مصحفی ہم پالتے پیری میں بٹیریں
آتا جو نصیبوں کا جگانا ہمیں ''قو[1]'' سے

1۔ قو = ''ایک قسم کی آواز جو کبوتر باز کبوتر اُڑاتے وقت نکالتے ہیں۔ وہ آواز جو بچوں کے کان کے پاس انھیں جگانے کے لیے نکالتے ہیں'' (فیروز اللغات)

501

جو چور کہ یوسف کی کرے چاہ میں چوری
مشکل نہیں کرنا اسے پھر راہ میں چوری

دل رستے میں زلف ورخِ جاناں کی ہوا گم
کی حسن کے سارق نے شبِ ماہ میں چوری

مے نوشوں سے آنکھ کے دِلا رہیو نہ غافل
کرتے ہیں سبھی بارگہِ شاہ میں چوری

مژگاں کو تری یاد ہے فن کیسہ بُری کا
کرتی ہیں وہ ہر ایک گزرگاہ میں چوری

دل لے کے قسم کھاوے ہے کیا جھوٹ تو ہر دم
پکڑی ہے میں کافر تری واللہ میں چوری

ہر سال نہ یہ لوند[1] کا کھٹکا ہی رہے گا
کرتا ہے فلک لوگوں کی تنخواہ میں چوری

اے مصحفی جب حسن کا ہو اس کے یہ عالم
کیونکر نہ سماوے دلِ آگاہ میں چوری

502

جب اس مراسلت پر وہ مہرباں نہ ہووے
قاصد کے پیچھے کیونکر قاصد رواں نہ ہووے

دندانِ سگ کو مطلق زحمت نہیں پہنچتی
مجھ سا بھی کوئی کشتہ نرم استخواں نہ ہووے

باہم کی یہ خصومت کب تک رہے گی یارب
یا ہم نہ ہوویں اک دن یا آسماں نہ ہووے

تب تک ہی زندگی کا دنیا میں بس مزہ ہے
کوئی کسی کے دل پر جب تک گراں نہ ہووے

جوں بوے غنچہ کب تک دم بند ہی رکھوں میں
کوے چمن میں اتنا تنگ آشیاں نہ ہووے

اس دھج سے مت قدم رکھ ٹھوکر لگے ہے دل کو
ٹک ہوش رکھ کسی کے جی کا زیاں نہ ہووے

جوشن کی چوڑی اس کی جاتی رہی ہے دی شب
ڈرتا ہوں مصحفی پر اس کا گماں نہ ہووے

1۔ لوند = ہندی سال کا جو مہینہ وہ بارہ مہینوں کے علاوہ ہوتا ہے

503

کرتا[1] جو وہ خوں ریز جہاں یاد ہمیں بھی　تھا شوقِ قدم بوسیِ جلاّد ہمیں بھی

اس شوخ نے بوسے کا دلِ سوختہ جاں سے　وعدہ تو کیا تھا، نہ رہا یاد ہمیں بھی

جانا ہو اگر محفلِ شیریں میں تو اُس وقت　ساتھ اپنے تو لے لیجیو فرہاد! ہمیں بھی

پھر فصلِ گل آئی ہے، مژدہ تجھے پہنچے　سودا سا ہوا چاہیے فصّاد ہمیں بھی

504

مجھ سے اک رات اگر درد کی ترے چُول اٹھے　رشک سے پیٹ میں دشمن کے وونہی سُول[2] اٹھے

کربلا کیوں نہ وہ کوچہ ہو کہ تا روزِ جزا　در سے تیرے نہ تری تیغ کے مقتول اٹھے

چین میں اس کے نہ اے نالہ خلل کر، کیا لطف　سرگراں خواب سے وہ نرگسِ مکحول اٹھے

بر میں ہر ایک کے پیراہنِ خوں تھا رنگیں　روزِ محشر جو لحد سے ترے مقتول اٹھے

جب قضا آئی، ہوئی روح روانہ تن سے　بیٹھے منصوب تو پھر عامل معزول اٹھے

جسمِ نازور کجا، پیکرِ پُر شور کجا　نہ سنا پیل کی پشتے سے کبھی جھول اٹھے

جب اٹھانا ہو صنم پھول کا تجھ کو دشوار　دستِ نازک سے ترے کیوں کہ یہ تنبول[3] اٹھے

ٹاپ اس گھوڑے کی لگتی ہے زمیں پر یہ جان　جس بیاباں میں اڑے گرد جہاں دھول اٹھے

تیرے بالوں کے جہاں کشتے کا مدفن ہو میاں　گر بگولا بھی اٹھے واں سے بصد طول اٹھے

مصحفی سختیِ ایام ہو جب ان میں لکھی
کیا کتابوں کا تری اشترِ محمول اٹھے

505

آہوں کے ستوں چرخ کو گر تھام نہ رکھتے　ہم نالہ و فریاد سے کچھ کام نہ رکھتے

تسخیرِ پری چہرہ بتاں اس میں جو ہوتی　ہم مُہرِ سلیماں پہ کبھی نام نہ رکھتے

1۔ غزل کے یہ چار شعر نسخہ بنارس میں زائد ہیں　2۔ سول = درد، کانٹا　3۔ب : منہ پھول

بے تابیِ دل ہم کو ستاتی ہے وگرنہ دروازے کے باہر کبھی اک گام نہ رکھتے
جلتا کوئی کیوں آگ میں دن رات جوا ے گل یہ رنگ ترے عارضِ گل فام نہ رکھتے
مرغانِ گرفتار تڑپ بھولے ہیں ورنہ ثابت پَر و بال اپنے تہِ دام نہ رکھتے
گو عاشقِ دلدادہ میں تھا لیک میرے ساتھ کیں اتنی تو خوبانِ گل اندام نہ رکھتے
گر مجھ سے مرادِ دلِ خوباں نہ بر آتی تربت پہ دیا میری سرِ شام نہ رکھتے
شکوہ ہے یہی ہم کو دبیرانِ قضا سے منہائی میں تو وصل کے ایام نہ رکھتے
بے صبریِ دل تو نے سبک کر دیا اس سے کچھ اور تو ہم نامہ و پیغام نہ رکھتے
دندانِ ہوس تیز ہیں ناچار ہیں اس سے ہم ورنہ خیالِ ثمرِ خام نہ رکھتے
ہے الفتِ دنیا سببِ خانہ خرابی بہتر تھا جو ہم فکرِ در و بام نہ رکھتے
جو زخم کہ لگتا تری شمشیر سے ہم کو اس زخم پہ مرہم پئے آرام نہ رکھتے

ہوتے نہ گدا مصحفی گر اس کے شبِ ہجر
تکیے کی جگہ سر کے تلے جام نہ رکھتے

506

وجد میں لاتی ہے مجنوں کو ہوا برسات کی کیا سیہ خیمہ ہے لیلیٰ کا گھٹا برسات کی
دیکھتے ہیں کیوں کہ آوے شاہدِ گل کا خیال ٹٹّیاں بن جاتی ہے بڑھ کر حنا برسات کی
ان دنوں میں سخت ایذا دیوے ہے دردِ فراق یار بن صورت نہ دکھلاوے خدا برسات کی
اک طرف چمکے ہے بجلی اک طرف چمکے ہے رعد کیا سماں دکھلاتی ہے ہر دم ہوا برسات کی
استخواں کُشتوں کے اس نے آشکارا کر دیے مدتوں سے راہ دیکھے تھا ہما برسات کی
ہم پہ کیا کیا آفتیں لاتا نہیں بارانِ اشک اس مصیبت کے تئیں جانے بلا برسات کی
کیوں نہ ہو گریہ میں الفت دست رنگیں سے زیاد خوش نما لگتی ہے آنکھوں میں حنا برسات کی
دیدۂ گریاں پہ اب گریے کا ٹھہرا ہے نچوڑ کیا دکھاوے دیکھیے یہ انتہا برسات کی

چشمِ گریاں سے لگا دے اپنے ساون کی جھڑی
مصحفی تو دیکھتا ہے راہ کیا برسات کی

507

یا رب! آباد ہوویں گھر سب کے — پھریں خط لے کے نامہ بر سب کے
کس کی مژگان ہیں کہ سینوں میں — یک بیک چھن گئے جگر سب کے
شب کی شب گل چمن کے ہیں مہمان — برگ جھڑ جائیں گے سحر سب کے
ایک عاشق پہ التفات نہ کر — حال پر رکھ میاں نظر سب کے
دیجو پیغام ہی مرا قاصد — لے چلا ہے تو خط اگر سب کے
جتنے ہیں گرد و پیش ہمسائے — گھر ڈبووے گی چشم تر سب کے
ہم رہے پیچھے واے گرم رواں — پہنچے منزل پہ پیشتر سب کے
میرے سوزِ جنوں کی دہشت سے — بند رہتے ہیں دن کو گھر سب کے
دل ہی اپنا ہے چینیِ مودار — حصے آئے نہ وہ کمر سب کے
ہاتھ اٹھتے تھے پیٹنے کے لیے — تیرے کُشتے کی لاش پر سب کے
گر یہی ہے رسائیِ صیاد — ایک دن باندھے گا یہ پر سب کے
کیا دکھاوے ہے صفائی، طبع مری — جس جگہ ہوں خذف گہر سب کے
دوستی کر دلا نہ ان سے کہ ہیں — دشمنِ جاں یہ سیم بر سب کے
تھے جو سلطانِ بحر و بر آخر — گئے برباد تاجِ زر سب کے
واے دنیا کہ رلتے پھرتے ہیں — خاک میں کاسہ ہاے سر سب کے

مصحفی یہ جو ہیں امیر و فقیر
دل میں ہے موت کا خطر سب کے

508

لا دیا خط نہ کبھی جانبِ دلبر سے مجھے — شکوہ اتنا ہی رہا بالِ کبوتر سے مجھے

لعل تھا گرچہ بدخشانِ سخن کا میں غریب توڑ ڈالا فلکِ سفلہ نے پتھر سے مجھے
میں جہاں جاؤں مرے ساتھ ہے رسوائیِ عشق کیا کروں آہ نہیں چارہ مقدر سے مجھے
بے نصیبی ہی کو میں اپنی دعا دیتا ہوں جس نے محروم رکھا دُردیِ ساغر سے مجھے
بے جگہ پائے جنوں تو نے یہ کی کوتاہی آگے بڑھنے نہ دیا وادیِ محشر سے مجھے
قدِ موزوں کے تصور میں گیا تھا سوے باغ واں تو کچھ کام نہ تھا سرو و صنوبر سے مجھے
ایک ہی زخم میں پورا نہ کیا میرا کام رہ گیا شکوہ یہ آبِ دمِ خنجر سے مجھے
جوشِ خوں کا میں کیا باغ میں جا کر کے علاج نوکِ سبزہ کی خبر دی کبھی نشتر سے مجھے
مشتری ہے تو سعادت یہ شبِ وصل ولے سوجھتا اور ہے کچھ بازیِ اختر سے مجھے
دل لگے باغ میں کس طرح سے میرا کہ نہیں سایۂ تاک بھی کم گنبدِ اخضر سے مجھے
دل کی بیتابی سے پڑتا نہیں اک پل آرام کوئی راتوں کو گرا دیوے ہے بستر سے مجھے
کیا کسی کا دلِ بیتاب ہے تُو، سچ بتلا پوچھنا ہے یہ سپندِ سرِ مجمر سے مجھے
دزدیِ داغ سے اس کو بھی نہ خالی پایا گر مِلا ساغرِ خوں لالۂ احمر سے مجھے
جذبِ الفت کا یہ عالم ہے کہ بیٹھے بیٹھے کوئی ہر وقت نکالے ہے مرے گھر سے مجھے
مجرمِ عشق کی تعزیر یہی تھی قاضی باندھنا تھا رسنِ زلفِ معنبر سے مجھے
اے اجل اَور بھی اک وقفہ کہ ہے اولِ عشق کام لینے ہیں بہت اس دلِ مضطر سے مجھے

مصحفی نام سوا کچھ نہیں رہتا باقی
ہے یہی یادِ سلیمان و سکندر سے مجھے

509

ہم اور یار اگر دو گھڑی بھی مل بیٹھے تو بیمِ طعنۂ ہمسایہ سے دو دل بیٹھے
کرے نہ طبعِ فلک اس کی بھی گوارائی خیال میں بھی جو وہ میرے متصل بیٹھے
کسی کا پاسِ ادب اس کا ہے گریباں گیر چمن میں کیوں کہ بھلا سرو پا بہ گِل بیٹھے

میں کھولوں مُہرِ دہن خاک بزمِ خوباں میں　　جو سامنے ہوں حریفانِ جاں گسل بیٹھے
ترے حضور صنم اس سے ہو نہیں سکتا　　سپند شعلۂ آتش پہ ایک پل بیٹھے
گِلہ فلاخنِ گردوں سے کس طرح نہ کریں　　بہ جائے سنگ جو سر پر ہمارے سِل بیٹھے
بھلا میں کیوں کہ کروں مصحفی کچھ اس سے بات
رقیب پہلو میں اس کے ہوں جب مخل بیٹھے

510

اک تجھ سے تمنا ہے، بر آتی نہیں وہ بھی　　حسرت ہی میں جاں جاوے سو جاتی نہیں وہ بھی
بے تابیِ دل راہبرِ شوق تھی، اب تو　　رستہ ترے کوچے کا بتاتی نہیں وہ بھی
مشتاق ہے ٹھوکر کا تمھاری سرِ عاشق　　اے وائے نصیب اس کے جگاتی نہیں وہ بھی
کنگھی رہی اک سمت صبا ڈھونڈھے ہے پھروں　　بالوں کا ترے سلسلہ پاتی نہیں وہ بھی
ہے دوشِ اجل پر بھی گراں میّتِ عاشق　　کُشتے کا ترے بوجھ اٹھاتی نہیں وہ بھی
تُو ہووے تو تصویر تری مجھ کو خوش آوے　　تُو جو نہیں ہوتا ہے تو بھاتی نہیں وہ بھی
ہیں لب پہ تری تیغ کے صد صحبتِ قاطع　　اس پر مرے قصے کو چکاتی نہیں وہ بھی
نافر ہے جو مجرم سے ترے آتشِ دوزخ　　گر کہیے جلا اس کو جلاتی نہیں وہ بھی
مردے تو جگاتی ہے بہت صُورِ قیامت　　ہم خفتہ نصیبوں کو جگاتی نہیں وہ بھی
اے مصحفی تو نے جو غزل اور کہی ہے
کیوں طبع تری عرصے میں لاتی نہیں وہ بھی

511

ہے لاگ طبیعت میں سو جاتی نہیں وہ بھی　　جھگڑا چکے، موت آوے، سو آتی نہیں وہ بھی
آتا نہیں آرام تری فندقِ پا کو　　جس رات کوئی فتنہ جگاتی نہیں وہ بھی
اندازِ حیا نکلے ہے تصویر میں تیری　　آنکھیں مری آنکھوں سے ملاتی نہیں وہ بھی

تو آرسی دیکھے ہے سدا صبح کو اٹھ کر بے رحم تجھے رحم پہ لاتی نہیں وہ بھی
کھینچے ہے نسیمِ سحری منھ سے دوپٹا پر ہاتھ پکڑ تجھ کو جگاتی نہیں وہ بھی
پہلو میں ہے اک دشمنِ جاں ہاتھوں سے دل کے ہو زیست کوئی دم، نظر آتی نہیں وہ بھی
اے مصحفی اس تیغ کو ہے ننگ جو مجھ سے
غیرت سے ترے خوں میں نہاتی نہیں وہ بھی

512

اغیار کی صحبت کی مجھے تاب کہاں ہے اس کا متحمّل دلِ بیتاب کہاں ہے
بالیں پہ رکھوں سر کو تو اپنے میں شبِ ہجر پر خواب تجھے دیدۂ بے خواب کہاں ہے
کرتا ہے کسے سجدہ پڑا اے سرِ بسمل تلوار ہے تلوار یہ محراب کہاں ہے
کیا جانے فرو رفتۂ طاقِ خمِ ابرو کعبہ ہے کدھر اور خمِ محراب کہاں ہے
رنگِ کفکِ پا سے ہو اس گل کے مقابل رنگت تری پر لالۂ سیراب کہاں ہے
سیراب گلا ہووے کسی تشنہ جگر کا اتنی دمِ خنجر میں ترے آب کہاں ہے
پیری میں ذرا آنکھ تو کھول اپنی تو غافل ہے صبح کا پرتو، شبِ مہتاب کہاں ہے
ہم صبحِ قیامت بھی یہی کہتے اٹھیں گے لا پیرِ مغاں جامِ مے ناب کہاں ہے
نت جس کے تجسس میں سراسیمہ ہے دریا کیا جانیے وہ گوہرِ نایاب کہاں ہے
خاکسترِ گلخن سے مرے گرم ہے پہلو مجھ کو ہوسِ قاقم و سنجاب کہاں ہے
اے مصحفی ہے تجھ پہ بہت رنجِ معیشت
چل پوچھ نہ تو لے در نوّاب کہاں ہے

513

دیدۂ نرگس میں صورت چشمِ قربانی کی ہے اس نے کیا دیکھا جو یہ تصویر حیرانی کی ہے
معنی اس کے فہمِ دانا میں نہیں آتے ہیں آہ کاسۂ سر پر لکھی جو سطر پیشانی کی ہے

غنچۂ گل کی طرح اے دل گریباں چاک کر نو بہار آئے ہے[1] ظالم فصل عریانی کی ہے
اتنی گردش میں بنائی مہر و مہ نے اے فلک یاد جو اس کو ادا رخسار گردانی کی ہے
شور بلبل ہو چکا اس دن گلستاں کی طرف خوش نوایاں نوبت اب میری غزل خوانی کی ہے
بوسے کی میں نے طلب کی اس سے تو ہنس کر کہا چل پرے ہٹ، منھ نہ لگ، کیا بات آسانی کی ہے
ہاتھ سے اپنے تو قربانی کرے ہے روزِ عید تجھ میں کافر شرط اک یہ تو مسلمانی کی ہے
دیکھ کر تصویرِ یوسف لی میں چھاتی سے لگا یاد وہ مجھ کو یہ میرے یوسفِ ثانی کی ہے
لختِ دل ہمراہِ سیلِ اشک جاتا ہے بہا وضع اس کم بخت میں یاقوت سیلانی کی ہے
یارو اس آہستہ رفتاری کا عالم دیکھیو چال ان پانو میں ساری کبکِ بستانی کی ہے
دیکھتا ہوں باغ میں جب گل کو تب کہتا ہوں آہ اس میں سب خو بو مرے ہی دشمنِ جانی کی ہے
تن بدن کا ہوش ہے مجھ کو نہ برجا ہیں حواس کس کو دیکھا ہے جو یہ حالت پریشانی کی ہے
کیا پڑا ہے اس پر اس کا سایۂ زلفِ دراز ہجر کی شب جو گریباں گیر طولانی کی ہے

بوریائے فقر پر اپنے ہیں جو بیٹھے انھیں
مصحفی کب آرزو تختِ سلیمانی کی ہے

514

دل و سینہ اپنا عاشق جو فگار دیکھتا ہے تو نمک چھڑک کے اس کی بہار دیکھتا ہے
مرے دل میں تیر اس کا جو دوچار[2] دیکھتا ہے تو مجھے بہ چشمِ حسرت وہ شکار دیکھتا ہے
مرے خط کو جب پڑھے ہے بہ کمالِ غور وہ شوخ تو عبارت اس کی پڑھ پڑھ کئی بار دیکھتا ہے
کرے شکوہ کیوں نہ عاشق تری زلفِ عنبریں سے کہ وہ روزِ روشن اپنا شبِ تار دیکھتا ہے
کبھی زردیِ خزاں ہے، کبھی سرخیِ بہاراں جو ہے رنگ اس چمن کا گل و خار دیکھتا ہے
نہیں ایک دم ٹھہرتا بہ قفائے ناقہ مجنوں کفِ سارباں میں اس کی جو مہار دیکھتا ہے

1۔ آئی ہے، آئے ہیں (دونوں طرح درست) 2۔ ہر نسخے میں "دوچار" ہی ہے لیکن موقعہ "دوسار" کا ہے

کہے ہے کہاں سے آئی ترے ہاتھ سلکِ گوہر　مرے رخ پہ آنسوؤں کا جو وہ تار دیکھتا ہے
پسِ ناقہ دم رکے ہے وونہی قیس عامری کا　جو کسی کا گردِ محمل وہ غبار دیکھتا ہے
نہ ہو ترک چرخ کیوں کر ترے کو میں آکے حیراں　کہ ہر اک طرف نیا ہی وہ مزار دیکھتا ہے
کبھی آئینے میں اس کے ہے نگاہ خال و خط پر　کبھی انکھڑیوں کا اپنے وہ خمار دیکھتا ہے
اسے کام کیا چمن سے کہ ہے محوِ صورت اپنا　یونہی نت چمن کی اپنے وہ بہار دیکھتا ہے
جو وہ قلب پر رکھے ہے کبھی چلّہٗ کماں کو　مرے دل کی جانب اول دو سہ بار دیکھتا ہے
جو گلی میں اس کی جاؤں تو منھ اس کو کیا دکھاؤں　مری کیا بنی ہے حالت دلِ زار دیکھتا ہے

ہے ادا پسند یارو دلِ مصحفی ازل سے
نہ وہ نقش دیکھتا ہے، نہ نگار دیکھتا ہے

515

دو چار دن سے پھر دلِ مائل اداس ہے　کھویا گیا ہے کیا جو مرا دل اداس ہے
لیلیٰ کا آج گھر میں جو کچھ دل اداس ہے　ناقہ ملول بیٹھا ہے، محمل اداس ہے
اب کُشتنی مگر کوئی باقی نہیں رہا　کچھ تو سبب ہے اس کا جو قاتل اداس ہے
مارا ہے تیغِ قہر سے تو نے جسے میاں　سب بسملوں میں بس وہی بسمل اداس ہے
انجام ہو بخیر کہیں اس نشاط کا　کچھ آج رنگِ چہرۂ محفل اداس ہے
آ اس پری کی بزم میں ہم تجھ کو لے چلیں　اتنا تو کس لیے مہِ کامل اداس ہے
آئے تھے کاتکی[1] کو جو خوباں چلے گئے　بس آج یہ سبب ہے جو ساحل اداس ہے
کوئی ستارہ سوختہ عاشق موا جو آج　ہے رنگ رخ ملین[2] ترا تل اداس ہے
ناقہ پھرا جو نجد سے، لیلیٰ نے یہ کہا　اے سارباں کچھ آج یہ منزل اداس ہے

بے رحم مصحفی تو ترے در کا تھا گدا
کیا تو نے کچھ کہا جو یہ سائل اداس ہے

1۔ کاتکی = کاتک کے مہینے کا نہان　2۔ ملین = اداس

516

گرہ سے تار کی شب کر کے مشتق آتش افروزی
مرے اور اس کے کی نالہ نے ناحق آتش افروزی

جلے کیونکر نہ پروانہ کہ مائل شمع کے ہو کر
کرے ہے اور بھی فانوسِ ابرق آتش افروزی

رقیبِ روسیہ کے گھر تو بجلی ہو نہیں پڑتی
نہیں آتی تجھے اے آہِ مطلق آتش افروزی

علم کی جا میں پرکالہ جگر کا اس پہ باندھا ہے
کرے کیونکر نہ پھر نالہ کہ بیرق آتش افروزی

پیادہ جو کہ ہو بندوقچی تو کم نہ جان اس کو
سدا شطرنج میں کرتا ہے بندق[1] آتش افروزی

صفوں کی صف اڑا دیتے ہیں جس دم فیر بولے ہیں
یہ گورے کرتے ہیں ایسی ہی الحق آتش افروزی

دہانِ پیرزن میں سرخیِ پاں کی یہ صورت ہے
کرے جیسے کوئی مابینِ خندق آتش افروزی

چمن میں عکس بتی کا ترے گر جا پڑے ان پر
ابھی کرنے لگے گل ہائے زنبق آتش افروزی

چراغاں یوں کیا ہے لختِ دل نے دیدۂ تر کو
کبھی دریا میں جو ہو گردِ زورق آتش افروزی

دلِ بیتاب کے ہاتھوں میں ہوں دن رات دوزخ میں
ہوئی ہے جس طرح تقدیرِ زنبق آتش افروزی

چنیں گر باغ سے پھولوں کی کلیاں اُس پری رونے
کرے گی اور ان ہاتھوں سے خندق آتش افروزی

نہیں خورشید میں پاتا میں وقتِ صبح وہ عالم
شبِ سرما میں جو رکھتی ہے رونق آتش افروزی

ترے عاشق کو برقِ نالہ شایانِ عروسی ہے
کریں جس طرح شب کو روز ساچق آتش افروزی

برنگِ طور گر اٹھ جاوے پردہ اس کے عارض سے
شبِ یلدا کے سینے کو کرے شق آتش افروزی

تو جب سوتے سے اٹھتا ہے تبھی دستِ حنائی کی
کرے ہے رنگ روے مہر کو فق آتش افروزی

یہی شنجرف سے گر شعر لکھے مصحفی نے ہیں
کرے گا ایک دن یہ خامہ سخق[2] آتش افروزی

517

مری اور اس کی ملاقات میلے کی سی ہوئی
کہ خانقہ میں بسر رات میلے کی سی ہوئی

1۔ بندق = مٹی کی گولی (لغاتِ سیدی) شطرنج کی کوئی اصطلاح بھی 2۔ سخق (اصل: مستحق)

نہ میری اس نے سنی اور نہ اس کی کچھ میں نے اگر ہوئی تو کوئی بات میلے کی سی ہوئی
مزہ یہ صحبتِ یاراں کا چشمِ تر سے ملا محلِ عیش یہ برسات میلے کی سی ہوئی
زباں سے کہنے نہ پائے کچھ اپنی، بھیڑ کے بیچ ہماری اس کی اشارات میلے کی سی ہوئی
کہا کہی میں اگر اس کا لے لیا بوسہ تو کچھ مزہ نہیں، یہ گھات میلے کی سی ہوئی
رہی نہ یاد پس از مرگ بات یاروں کی سبھوں سے حرف و حکایات میلے کی سی ہوئی

اگرچہ دست درازی بھی مصحفی میں کی
ولے خطا نہ کچھ اثبات میلے کی سی ہوئی

518

جو شہسوار ہے پا در رکاب جاتا ہے سمندِ عمرِ رواں کیا شتاب جاتا ہے
ہے کچھ تو سیر کہ اس ماہ رُو کے کوچے سے ہمیشہ رو بہ قفا آفتاب جاتا ہے
کوئی تو باغ میں آیا ہے میکشی کرنے جو آج جانبِ گلشن سحاب جاتا ہے
خدا کے واسطے ساقی کہیں شتاب تو آ وگرنہ لطفِ شبِ ماہتاب جاتا ہے
قدیم چال ہے بحرِ جہاں کی آمد و شد گر ایک آوے ہے تو اک حباب جاتا ہے
مرے ہے جو کوئی دشتِ طلب میں ہو بے کس فرشتہ ریت میں لاش اس کی داب جاتا ہے
جنازہ کُشتے کا تیرے اٹھا تجمل ساتھ سحاب اس پہ چھڑکتا گلاب جاتا ہے
خجل ہوں دیکھ کے دستِ ہوس کی گستاخی کہ تا بدامنِ طرفِ نقاب جاتا ہے
دلِ برشتہ ہی ہے خوانِ عاشقی میں لذیذ کہ پہلے ہاتھ بہ سوے کباب جاتا ہے
تو گو کہ گھر میں ہو اس پر بھی جستجو کو تری کہیں کہیں دلِ پُر اضطراب جاتا ہے
تمام کر نہ سکا حسن کو ترے مانی دھرا دھرایا وہ نقشہ خراب جاتا ہے
اسی کی آنکھ اسے آئینے میں کہتی ہے ادھر کو دیکھ یہ عہدِ شباب جاتا ہے

ہے مصحفی کو زبس شوق صدرہ[1] کا ہر شب
مطالعے ہی میں پس وقتِ خواب جاتا ہے

519

قاتل کی مرے سر پہ جو شمشیر نہ آئی　　جرم اس کا ہے کیا، رحم پہ تقدیر نہ آئی
کاوش پہ مری آہ کی تاثیر نہ آئی　　اک طوطیِ مقصود تہِ تیر نہ آئی
عیسیٰ کو دوائے دلِ دل گیر نہ آئی　　ہرگز مرض الموت کی تدبیر نہ آئی
محروم رہا ذبح سے مرغِ دلِ بسمل　　شہ رگ پہ چھری جو دمِ تکبیر نہ آئی
تھا قیس تو لیلیٰ کی کمیں ہی میں شب افسوس　　دینے کو در اپنے کی وہ زنجیر نہ آئی
ہے زمزمۂ نالۂ عاشق میں مزہ اور　　ہر مرغِ خوش الحاں کو یہ تحریر نہ آئی
کیا تجھ کو شبِ وصل میں جلدی یہ پڑی تھی　　اے صبح ذرا اور بہ تاخیر نہ آئی
بازو مرے قاتل کا لگا درد جو کرنے　　کیوں تو ہی اجل کھینچ کے شمشیر نہ آئی
پرساں تو مرے حال کا وہ شوخ ہوا تھا　　کمبخت زباں بر سرِ تقریر نہ آئی
جب تک میں حریری نہ کیا سطحِ ہوا کو　　کاغذ پہ ترے حسن کی تصویر نہ آئی
مشکل مری آسان کسی سے نہیں ہوتی　　یوسف کو مرے خواب کی تعبیر نہ آئی
عکس اس کا نہ جم کر کے رہا دیدۂ تر میں　　دریا میں بنائی اسے تعمیر نہ آئی
سو تشنہ ہوئے چاہِ زنخداں پہ و لیکن　　بے دلو و رسن زلفِ گرہ گیر نہ آئی

اے مصحفی جس شب میں لیا کامِ دل اس سے
افسوس کبھی پھر وہ شبِ قیر نہ آئی

520

آنے کی ترے کوچے میں طاقت نہیں ملتی　　پانو کے تئیں ضعف سے رخصت نہیں ملتی

1۔ صدرہ = کتاب کا نام

میں گورِ غریباں میں تو ڈھونڈھا بہت اس کو
واں بھی تو ترے کشتے کی تربت نہیں ملتی

یہ طرفہ خرابی ہے کہ اس چاہ میں ظالم
کچھ مجھ سے تری طبع کی رغبت نہیں ملتی

اغیار کے نامے میں ہے کچھ اور ہی مضموں
اس خط سے مرے خط کی عبارت نہیں ملتی

ہے نامِ خدا تجھ پہ تو کچھ اور ہی عالم
صورت سے تری حور کی صورت نہیں ملتی

یہ طرفہ تماشا ہے کہ اس شوخ کے ہاتھوں
ہم بیچیں اگر دل کو تو قیمت نہیں ملتی

دل پیسے نہ کس طرح تری گات پری کا
یہ چیز تو بے طالع و قسمت نہیں ملتی

رستہ تو دمِ تیغ ہے اس مانگ کا ہم کو
پر سر سے گزر جانے کی ہمت نہیں ملتی

اک طرفہ بھبھوکا ہے ترا عارضِ رنگیں
اس گل سے گلِ سرخ کی رنگت نہیں ملتی

کیا خاک کوئی شاد ہو اس باغ میں ہرگز
غنچے کو تبسم کی بھی فرصت نہیں ملتی

پروانہ جو چلتا ہے تو روتی ہے کھڑی شمع
کس کس کو تری بزم میں ذلت نہیں ملتی

اک دن تو لپٹ جائے تصور ہی سے تیرے
یہ بھی دلِ نامرد کو جرأت نہیں ملتی

کس وقت جدا مجھ سے وہ کمبخت ہوئی تھی
ڈھونڈھوں ہوں بہت اور شبِ فرقت نہیں ملتی

اے مصحفی کیوں یار کے اپنے تو ہے درپے
جانے دے اگر اس کی طبیعت نہیں ملتی

521

خوے رم کردہ تری یار ہوا چاہتی ہے
کچھ تو تسکینِ دلِ زار ہوا چاہتی ہے

نگہِ کج کے تری سوجھیں ہیں تیور کچھ اور
آرسی سے وہ گرفتار ہوا چاہتی ہے

میرے اور یار کے پردہ تو نہیں کچھ لیکن
بے خودی بیچ میں دیوار ہوا چاہتی ہے

دل بساط اپنے میں ہے سو بھی سنا ہے میں نے
جنس یہ داخلِ سرکار ہوا چاہتی ہے

زندگی کم نظر آتی ہے مجھے ان روزوں
خواہشِ چرخِ ستم گار ہوا چاہتی ہے

دیکھ کر حسن کو اس بت کے کہے ہے زاہد
میری تسبیح بھی زنّار ہوا چاہتی ہے

بے خبر آئنہ مت دیکھ کہ اب تیری آنکھ　　اپنے عالم سے خبردار ہوا چاہتی ہے
حسنِ شوخ اس کے پہ پڑتی ہے نگاہِ زاہد　　آہ کیا یہ بھی گنہگار ہوا چاہتی ہے
عشق کا غرہ مجھے حسن پہ مغرور ہے وہ　　میرے اور یار کے تکرار ہوا چاہتی ہے
شانہ کرتی ہے صبا زلفوں میں اس کی شب و روز　　وہ گلی کلبۂ عطار ہوا چاہتی ہے

مصحفی آرزوے دل کی ذرا باگ تو لے
کس طرف جاتی ہے کیوں پار ہوا چاہتی ہے

522

خوش آئی کیا مجھے عشقِ بتاں کی رسوائی　　میں اپنے سر پہ جو لی اک جہاں کی رسوائی
ملائے خاک میں کیا کیا گلِ شگفتہ بہار　　خزاں نے زور یہ کی گلستاں کی رسوائی
وہ اپنے گھر میں ہے اور مجھ کو سو جگہ شبِ ہجر　　لیے پھرے ہے دلِ بدگماں کی رسوائی
میں کیا بتاؤں تجھے برق رنگِ گل سے نسیم　　ہوئی جو خار و خسِ آشیاں کی رسوائی
کمالِ طعنِ قبائل سے تنگ ہے مجنوں　　نہ ہو نصیب کسی کے زباں کی رسوائی
دیا جو پان بنا کر میں ان کو سب کے حضور　　گلے پڑی ہے اسی برگِ پاں کی رسوائی
نہ کی میں آہ بھی فرقت میں اس کی تا دمِ مرگ　　مجھے پسند نہ تھی داستاں کی رسوائی
زیادہ ہو گیا اس دودمانِ عشق کا وصف　　کہ خانہ زاد ہے اس دودماں کی رسوائی
تری گلی میں وہ پھرتے ہیں اب تلک رلتے　　یہ کس شہید کی ہے استخواں کی رسوائی
اسی جہان میں یا رب مجھے معذّب کر　　سہی نہ جاوے گی مجھ سے وہاں کی رسوائی

چھپاؤں عشق میں کیونکر کہ مصحفی اب تو
گلی گلی ہے مری داستاں کی رسوائی

523

عذرِ گنہ میں چاہیے زنجیر بول اٹھے　　ہم خوں گرفتہ کیوں تہِ شمشیر بول اٹھے

رہ گم کرے دعا جو مری جاے سوے چرخ — تو اس کی رہنمائی کو تاثیر بول اٹھے
اس خامشی پہ اس کی یہ بُشرے سے ہے عیاں — تیرے شہیدِ ناز کی تصویر بول اٹھے
دانتوں سے کاٹتا ہوں اب ان کو کہ بے سوال — بزمِ ادب میں کیوں لبِ تقریر بول اٹھے
ہر سطر میں قلق کے جو مضموں کی تھی نوشت — نزدیک تھا کہ نامے کی تحریر بول اٹھے
گلزار تک تو اس کا قفس لے چلو کوئی — شاید چمن میں بلبلِ دل گیر بول اٹھے
اس پہ لگائے تیر گر ابرو کماں مرا — "ایمن فداے تو" ہدفِ تیر بول اٹھے
عشقِ جواں کا اپنے جو رکھ دوں میں اس پہ داغ — "زیں داغ سوختم" فلکِ پیر بول اٹھے
اللہ رے تیغِ تیز کی بُرّش کہ جس کو دیکھ — سر تن سے ہو جدا وہیں تکبیر بول اٹھے
گردن زنی کے وقت جو قاتل سے ہووے سہو — تو میرے سر پر آن کے تقدیر بول اٹھے
صبحِ شبِ وصال دھڑکتا ہے جی مرا — ایسا نہ ہو کہ کچھ بتِ بے پیر بول اٹھے
ہو اتفاقِ وصل تو خوبی سے بخت کی — ناگہ خروسِ صبحِ شبِ قیر بول اٹھے
تعلیم کردہ ہے مری حیرت کا آئینہ — دیکھے سے جس کے طوطیِ تصویر بول اٹھے
قاتل نے لی ہے تیغِ سیاست نیام سے — شاید کہ کوئی موردِ تقصیر بول اٹھے

دقّت رسی پہ آوے اگر طبعِ مصحفی
مانی کے کام میں دمِ تصویر بول اٹھے

524

رنگِ رُخِ زیبا پہ شرارت نظر آئی — کیا جانیے اس بت کی طبیعت کدھر آئی
خوش خوش جو گلستاں میں نسیمِ سحر آئی — شاید کہ کوئی گل کی کلی رنگ پر آئی
اک شور ہے نوحے کا اسیرانِ قفس میں — کیا گل کی خبر لے کے نسیمِ سحر آئی
یارانِ عدم رفتہ گئے آہ کدھر کو — ان میں سے کسو کی جو نہ اب تک خبر آئی
محکوم تھی شب بسکہ وہ تصویرِ خیالی — جب میں نے کہا پیشتر آ، پیشتر آئی

بوند اشک کی کچھ کم نہیں ہیرے کی کنی سے آنکھوں میں لیے ساتھ یہ لختِ جگر آئی
اس شکل مشعبد کا ہوں دیوانہ کہ میرے جب سامنے آئی تو بہ وضعِ دگر آئی
ستھراؤ کے ستھراؤ پڑے تیغ ادا سے اس کوچے میں موجِ یمِ خوں تا کمر آئی
یک لحظہ رہائی نہیں جو دستِ جنوں سے یہ کیسی بلا میرے گریبان پر آئی
قاتل نے دریغ ان سے رکھا آبِ دمِ تیغ اس کوچے میں پیاسوں کی اجل پیشتر آئی

رخصت جو لگا ہونے میں اس رشکِ پری سے
اے مصحفی اس کی بھی وہیں آنکھ بھر آئی

525

جو اپنے رہنے کے قابل مقام ہوتا ہے غم و بلا کا وہیں ازدحام ہوتا ہے
میں کیا بیاں کروں نازک دماغیِ جاناں کہ جس کو نکہتِ گل سے زکام ہوتا ہے
لوند طبع کا ہے جو ہر آسماں استاد یہ تازیانہ درست اسپ خام ہوتا ہے
نوائے مرغ چمن تجھ کو دیکھ لیویں گے جو ہم سے نالہ کوئی انصرام ہوتا ہے
ہم اس دیار میں اب جا رہیں گے ہی ناچار ہر ایک ذرہ جہاں ماہِ بام ہوتا ہے
یہ مرتبہ دلِ عاشق کا ہے خدا کی قسم جہاں نما کوئی ہر ایک جام ہوتا ہے
یہ اس نے چھیڑ کے لکھی ہے ہم پہ یا قسمت کہ خطِ غیر میں ہم کو سلام ہوتا ہے
خبر لے جلد تغافل سے تیرے اے صیاد کسی اسیر کا خوں ریز دام ہوتا ہے
یقیں ہے مجھ کو تہی دست جائے گا قاصد نہ شوق کم ہے نہ نامہ تمام ہوتا ہے
ادھر کو جاتی ہیں جانیں کھنچی ہوئی لاکھوں جدھر رواں وہ قد خوش خرام ہوتا ہے
خدا نہ تیرگیِ بخت لاوے پیش اپنے کہ روئے مہر سیہ وقت شام ہوتا ہے
کبھی جو بات کے کہنے کا ڈھب ملے ہے ہمیں تو واہ! تم کو اسی وقت کام ہوتا ہے

جو مصحفی کبھی جاتا ہے اس کے کوچے میں
تو اس پہ خلق کا بلوائے عام ہوتا ہے

526

نقاش صنع حوریں سانچے میں ڈھالتا ہے	اک مشت گل سے کیا کیا نقشے نکالتا ہے
ہم خاک میں ملیں ہیں اور اس ادا سے اس کی	جس دم وہ چلتے چلتے دامن سنبھالتا ہے
زنداں میں ہیں جو اس کے سو سب وہ کشتنی ہیں	سفاک چرخ گن گن ایک اک کو پالتا ہے
دیتا ہے دل میں اپنے اس زلف کو جو جاگہ	گویا کہ آستیں میں وہ سانپ پالتا ہے
اس سال ہم بھی اے دل مشق فغاں کریں گے	بلبل کا نالہ دل میں مدت سے سالتا ہے
جانے لگی ہے ناقہ جب نجد کو، بگولا	مضطر ہو سر پہ اپنے کیا خاک ڈالتا ہے

پھر مصحفی نہ نکلا دریائے غم سے سچ ہے
غرقے کو ایسے کوئی پانی اچھالتا ہے

527

جس زخمی پہ قاتل کی مرے تیغ جھڑی ہے	سہا ہے وہ اتنا کہ اسے جی کی پڑی ہے
آنکھوں سے نکلتے ہیں زر سرخ کے آنسو	قارون کی دولت مرے سینے میں گڑی ہے
میں وصل کی اس کے جو تمنا میں موا ہوں	تربت میں مری حسرت دل ساتھ گڑی ہے
آئینہ جو چھٹتا ہی نہیں ہاتھ سے تیرے	کیا جانیے کس ڈھب پہ تری آنکھ پڑی ہے
شایاں نہیں شمشیر کے وہ پنجۂ نازک	بازو تری فولاد سے مانا کہ کڑی ہے
پیری میں مجھے حسن کے جلوے نے ستایا	یعنی شجرِ خشک پہ بجلی یہ پڑی ہے
وہ بیٹھ گئے منتظرِ روزِ قیامت	محلوں میں پتھورا کی ابھی لاٹھ کھڑی ہے
فرماوے ذرا منھ سے کہ اس وقت میں آوں	آئینے سے فرصت کی کبھی کوئی گھڑی ہے
یادِ خمِ ابرو میں جو دریا میں کیا ہوں	ہر موج نے دل پر مرے تلوار جڑی ہے
مارا ہے ہزاروں کے تئیں جان سے اس نے	خونخوار دو عالم تری مِسّی کی دھڑی ہے

اب وہ غزل اے مصحفی لکھتا ہوں کہ جس کا
ہر مصرع بے ساختہ موتی کی لڑی ہے

528

پتھری جو طمنچے کی کبھی اس کے جھڑی ہے — اک برقِ بلا جان پہ عاشق کے پڑی ہے
عالم یہ صفا کا ہے تری گات میں گویا — آئینۂ فولاد کی اک لوح جڑی ہے
سر زانو پہ رکھ جس میں ملک بیٹھ رہیں ہیں — وہ شام غریباں تری مسّی کی دھڑی ہے
اے وائے کہ سو کام ہیں درپیش ہمارے — اور عمر کی فرصت ہے سو اک آدھ گھڑی ہے
اب تک ہے نزاکت سے وہی اس کا لچکنا — اس گل کی کمر بید کی گویا کہ چھڑی ہے
کوچے میں ترے سجدے کی جا گہ نہیں ملتی — از بس کہ ہر اک گام پہ واں لاش گڑی ہے
جی دیکھنے کو اس کے نہیں چاہتا اپنا — کیا جانیے کس کس سے تری آنکھ لڑی ہے
وارفتہ رُخ گل کا نہیں میں ہی اکیلا — گلزار میں نرگس بھی تو حیران کھڑی ہے

کیا مصحفیِ خستہ کو سوجھا ہے خدایا
ان روزوں میں کچھ جینے سے یاس اس کو بڑی ہے

529

ایسی نازک کمر نہیں دیکھی — ہیں تو پر اس قدر نہیں دیکھی
آج مجنوں کو کیا ملی لیلیٰ — کبھی اس حسن پر نہیں دیکھی
ہم نے تیرے صفاے دنداں پر — کوئی سلکِ گہر نہیں دیکھی
شکر اے دل کہ آستیں نے تری — اب تلک چشمِ تر نہیں دیکھی
سال ہا ہم نے خط کو بھجوا کر — کب رہِ نامہ بر نہیں دیکھی
گرد پھرتی ہے، بوے گل نے مری — بے دماغی مگر نہیں دیکھی
واے حسرت کہ یار کی صورت — اب تلک بھر نظر نہیں دیکھی
ہم نے ہرگز غمِ جدائی میں — زیست بے دردِ سر نہیں دیکھی
صبر کر رہ کہ تو نے راہِ چمن — مرغِ بے بال و پر نہیں دیکھی

دور کھینچے ہے آپ کو خورشید　　اس کی تیغ و سپر نہیں دیکھی

مصحفی ہوں میں تیرہ روز ایسا
شب نے جس کی سحر نہیں دیکھی

530

سو بار تم تو سامنے آکر چلے گئے　　دھوکا سا ایک ہم کو دکھا کر چلے گئے

کی ہم سے باغباں نے یہ کاوش کہ آخرش　　ہم آشیاں کو آگ لگا کر چلے گئے

ہونے دیا نہ مجھ سے تمھیں شرم نے دوچار　　جب مل گئے تو سر کو جھکا کر چلے گئے

آتا ہوا جو دور سے دیکھا مجھے تو وے　　رستے میں مجھ سے منھ کو چھپا کر چلے گئے

اب میں ہوں اور وہ زلف ہے یارانِ بے وفا　　دامِ بلا میں مجھ کو پھنسا کر چلے گئے

ٹھوکر سے اپنے پانو کے گلشن میں خوش قداں　　صد فتنہ ہائے خفتہ جگا کر چلے گئے

ہے غیر سے بھی ربط تمھیں، میں جو یہ کہا　　سوگند میرے سر کی وہ کھا کر چلے گئے

آئے کبھی جو باغ میں دیوانگانِ دشت　　آنکھوں سے جوے خون بہا کر چلے گئے

ہرگز رہا نہ ان کا نشاں وہ جو مصحفی
قصر و محل زمیں پہ بنا کر چلے گئے

531

گل کے گل تکیے ہیں واں عارضِ جاناں کے تلے　　خشتِ خم رہتی ہے یاں نت سرِ مستاں کے تلے

چادرِ گل ہے وہاں پہلوے جاناں کے تلے　　یاں خس و خار بچھے ہیں تنِ عریاں کے تلے

چارپائی ترے کشتوں کو میسّر نہ ہوئی　　بسترے خون کے تھے گبر و مسلماں کے تلے

اس کے سینے کی صباحت نے کیا ہے اعجاز　　صبحِ محشر کو چھپایا ہے گریباں کے تلے

کچھ ہوا باغ کی یہ سَم ہے کہ میں پاتا ہوں　　بلبلِ مردہ ہر اک نخلِ گلستاں کے تلے

اتنا مقدور نہیں ہوویں شریکِ مجلس　　ہم ہیں جو نقشِ قدم صفحۂ سلطاں کے تلے

اس سے کیا لوٹے مزہ کوئی گرفتاری کا طوقِ غبغب ہی نہ ہو جس کی زنخداں کے تلے
فتنۂ چشم سے اس بت کی کمر ہے غافل سرمہ سوتا ہے جو یوں سایۂ مژگاں کے تلے
نہ دیا ضعف نے مجنوں کو پہنچنے اس تک سو جگہ ناقہ رُکا گرچہ مغیلاں کے تلے
آسیا دانوں کو پیسے ہے تو گردوں مجھ کو یہ چلن روز ہے اس گردشِ گرداں کے تلے
دیتِ خوں ترے کشتوں کو ملے کیوں کہ یہ لوگ آپ رکھتے ہیں گلا خنجرِ برّاں کے تلے
سر تو فتنے نے جھکایا ہے زمیں بوسی کو دب نہ جاوے وہ ترے محشرِ داماں کے تلے
ایک دن بیٹھ کے مجنوں تجھے دکھلاویں گے اپنی شوریدہ سری بیدِ بیاباں کے تلے
کیوں ہو سرگشتہ غبارِ خطِ جاناں کہ اسے خاطرِ جمع ملی زلفِ پریشاں کے تلے
اتنا بے زیب نہیں جامۂ عریانی بھی اک گریباں ہے چھپا اور گریباں کے تلے
عمر کی فرصتِ کم سے ہے یہ شکوہ کہ ہمیں دم بھی لینے نہ دیا خنجرِ برّاں کے تلے
صبح دم تکیہ دو جانب سے ہمارا تر تھا لیتے کروٹ جو رہا دیدۂ گریاں کے تلے

مصحفی نعش پہ میری نہ فقط روئے یار
لاکھ انگشتِ تأسف گئیں دنداں کے تلے

532

اے قیس نہ دے پانو تو زنجیر میں میری رسوائیِ صد خانہ ہے تقدیر میں میری
کہتے ہیں عبودیت اسی کو جو بہ صد فکر نقصان بھی رہ جائے ہے تدبیر میں میری
دیوار و در آئینہ ہے کثرت سے صفا کی تصویر کی حاجت نہیں تعمیر میں میری
اس ہاتھ کے رعشے کا برا ہووے کہ میری صد سطر قلم زد ہوئیں تحریر میں میری
انگشتِ سیہ بختیِ جاوید ہوا صرف ہنگامِ رقم خاکۂ تصویر میں میری
شاید نگہِ ناز کا رخ چار طرف تھا قاضی کو تأمل ہے جو تعذیر میں میری
رہنا مجھے اندازے پر اپنے ہی بھلا ہے توقیر کمی کرتی ہے توقیر میں میری

جاسوس نے جا کر وہیں رہزن کو خبر کی پائی جو شباہت کسی رہ گیر میں میری
رامح نے دو صد رمح مرے دل پہ لگائیں اس پر بھی رہی روح ترے تیر میں میری

اے مصحفی ذکرِ کمرِ یار ہے چپ رہ
گنجائشِ یک مو نہیں تقریر میں میری

533

زنداں سے نکلنا نہیں تقدیر میں میری لکھی ہے قضا خانۂ زنجیر میں میری
قاتل کی یہ مرضی ہے کہ عالم کو کروں قتل اور خوں نہ لگے اک ذرا شمشیر میں میری
جب تک وہ کماندار نہ خالی کرے ترکش ہونے کی تسلی نہیں دو تیر میں میری
قاتل کے سر دست تو ہے خنجر عریاں قسمت ہے کہ کچھ دیر ہے تدبیر میں میری
جب ذبح کیا مجھ کو اسے چین تب آیا تھی تیغ قضا دیر سے تدبیر میں میری
اے کاش سکھا دیوے کوئی شاہد جی کو مجنوں کی پھبن نکلے ہے تصویر میں میری
انداز سے پیدا ہے یہ آہِ سحری کو اک روز خلل لاوے گی توقیر میں میری
گر موے پریشاں کا نہیں ذکر میں کرتا الجھے ہے زباں کس لیے تقریر میں میری
میں مرغ گرفتار ہوں کیا مجھ کو چمن سے میرا قفسِ تنگ ہے جاگیر میں میری
رانجھا یہی کہتا تھا ادھر دیکھیو مجنوں لیلیٰ کی ملامت ہے بہت ہیر میں میری

اے مصحفی کیوں صید نہ ہو طائرِ معنی
پیچیدگیِ دام ہے تحریر میں میری

534

اس سے کُشتی میں دغا یاروں نے اکثر کھائی بلکہ رستم نے بھی چپراس [1] مقرر کھائی
آ گیا صیدِ حرم بھی جو مقابل اس کے خالِ رُخ سے ترے گولی وونہی دل پر کھائی

1۔ چپراس = کشتی کا داؤ

سونگھنے کا نہیں میں مشک کو مرتے مرتے　اب تو تیری قسم اے زلفِ معنبر کھائی
اس کے کوچے میں جو دیوانہ گیا میں شبِ تار　کبھی در سے کبھی دیوار سے ٹکّر کھائی
ایک ہی زخم میں سب سونگ [1] گئی اپنی بگڑ　مژۂ یار سے میں سانگ [2] جو دل پر کھائی
نامہ پھر نامہ بری کا نہ کبھی لیوے گا　تو نے اس طفل سے بازی جو کبوتر کھائی
یہ تمنا ہی رہی، مجھ کو شبِ وصل، اس نے　اک گلوری نہ مرے ہاتھ سے لے کر کھائی

مصحفی یار کے کوچے سے میں جب اٹھ کے چلا
سنگِ رہ ضعف ہوا، پانو نے ٹھوکر کھائی

535

ہے بس اب اس کے لیے گور کی بہتر کھائی　بے ستوں سے سرِ فرہاد نے ٹکّر کھائی
میرے گریے سے زبس اوس پڑا ہے مجھ پر　بزمِ خوباں میں تو میں ٹھنڈ ہے شب بھر کھائی
ضبطِ شیریں کا میں دیوانہ ہوں پرویز کی آہ　کیوں نہ ہیرے کنی لگتے ہی خنجر کھائی
دیکھ آیا جو ترا خالِ سیاہ اے بتِ شوخ　گھر میں آ اس نے پھر افیون مقرر کھائی
آنکھ لگنے دے، کوئی یہ بھی ہے اندازِ فغاں　تو نے کیوں جان مری اے دلِ مضطر کھائی
خوابِ راحت مجھے تب کنجِ لحد میں آیا　تیری تلوار جب اے ترکِ ستم گر کھائی
اپنے پانو سے گلہ قیس کو بس اتنا رہا　کوے لیلیٰ میں کبھی تم نے نہ ٹھوکر کھائی
مر گیا مار گزیدہ تری زلفوں کا وہیں　اس نے دنیا کی ہوا کچھ بھی نہ رہ کر کھائی
نہیں آنے کا ترے گھر جو بلاوے گا بھی تو　اب تو میں تجھ سے قسم اے بتِ کافر کھائی

مصحفی اس دہنِ تنگ کا مذکور تھا رات
ٹک تبسم جو کیا غنچے نے منہ پر کھائی

536

مرتے مرتے ہم کسی کا داغِ فرقت لے گئے　اک نظر بھر دیکھنے کی دل میں حسرت لے گئے

1۔ سونگ؟　2۔ سانگ = نیزہ

نکتہ چینوں کی بھلا کب تک کوئی باتیں سنے زورِ طعنے کے ہماری تاب و طاقت لے گئے
قاتلوں میں جب بہم بگڑی تو لاشے کے مرے سینکڑوں حصے لگائے کر کے قسمت لے گئے
یا الٰہی کوئی اتنا بھی نہ ہو مجبورِ عشق صبح کے نالے ہمارے گھر سے برکت لے گئے
اور تو تحفہ نہ تھا کچھ بہرِ یارانِ عدم اس جہاں سے ارمغاں ہم رنجِ غربت لے گئے
دیکھ سکتے ہیں دو چار اس کے کوئی ہر ایک کو آب و آئینہ سے جب ہم لوگ غیرت لے گئے
ارمغاں لاکھوں تھے دنیا میں و لے انجام کار یاس و ناکامی سوا کیا اہلِ حشمت لے گئے
جوں چراغِ غول روشن ہو کے جب وہ رہ گیا ہم چراغِ خانہ سے بھی دل میں دہشت لے گئے
داد کو بھی وہ نہ پہنچا کشتگانِ ناز کی داورِ محشر کے بھی آگے شکایت لے گئے
اس کے کوچے میں رہا جو گرمِ بازارِ قضا اک نئی یاں سے فرشتے روزِ میّت لے گئے
تیرہ بختی نے جلایا بعدِ مُردن بھی مجھے کر کے روشن یار میری شمعِ تربت لے گئے

پھر نہ ہم لیویں گے نامِ عشق ہرگز مصحفی
اب کے گر اس معرکے سے جاں سلامت لے گئے

537

مرتے دم یادِ بتانِ سرو قامت لے گئے ہم لحد میں آہ ساتھ اپنے قیامت لے گئے
بعد مرنے کے بھی میں ہادی رفیقوں کا ہوا دوست ہمدم سب مرے لاشے سے عبرت لے گئے
پیش قدمی کی انھوں نے رہ گئے پیچھے ہمیں یار جو آئے تھے آخر ہم سے رخصت لے گئے
ان پتنگوں کو خداوندا جزائے خیر دے جو چراغِ گور پر دستِ حمایت لے گئے
لے کے دم رستے میں صد جانانہ لب تک آئے ہے ہجر کے صدمے کچھ ایسی ویسی طاقت لے گئے
منہ پھراتے ہی تمھارے غش کیا وقتِ وداع ہم سے تم رخصت ہوئے ہم سب سے رخصت لے گئے

ہم خدا سے بھی نہیں کچھ مانگتے اے مصحفی
چرخ تک دستِ دعا کب اہلِ ہمت لے گئے

538

گھر میں کسی صنم کے شبِ تار گو دیے　　آتا ہے جی میں آج تو دیوار گو دیے
ہر ہر قدم ہے وجد کی جا دشتِ عشق میں　　پانو میں جس گھڑی کہ چبھیں خار گو دیے
ہے اضطرابِ عشق سے آتش بزیرِ پا　　مثلِ سپند کیوں کہ نہ اے یار گو دیے
میداں کشی جو کیجے تو مانندِ موجِ برق　　اک جست میں اٹک کے بھی جا پار گو دیے
ہووے اشارہ اس کا تو بحرِ عمیق میں　　پُل پر سے جونپور کے بیک بار گو دیے
ہو جاوے ایک پل میں صفِ کودکاں تباہ　　ناگاہ گر پٹاری سے جوں مار گو دیے
راوت بنے فلک تو پھکیتوں کی طرح سے　　چاروں طرف کو ہو کے سبک بار گو دیے
اب جست و خیزِ باغ کا موسم نہیں رہا　　کنجِ قفس میں مرغِ گرفتار گو دیے
اے گریہ اپنا جوش گھٹا اب تو، کب تلک　　فوآرہ وار بر سرِ انہار گو دیے
گر ناٹکوں کی طرح سے ہو جی شلنگ زن　　خندق سے زندگی کی بہ یک بار گو دیے
جس معرکے میں لڑتے ہوں رستم بتاں بہم　　اس معرکے میں کھینچ کے تلوار گو دیے
نہرِ چمن کا عرصہ ہے کیا مرغِ بستہ پر　　ٹک بند کر کے اپنی جو منقار گو دیے
تسبیح وار کفر بھی گر ہے تو ہے یہی　　مانندِ دانہ توڑ کے زنّار گو دیے
زنجیر سے جو نکلے ہے پاے جنوں کبھی　　جیسے پلنگ بر سرِ بازار گو دیے

گر نیم جاں ہے چاہِ محبت میں مصحفی
ہمت ہمیں گراتی ہے ناچار گو دیے

539

تھی مجھ میں تم میں وہ جو نت اک بات چھوڑ دی　　اچھا ہوا کہ تم نے ملاقات چھوڑ دی
تصویرِ رخ میں تیری مصور نے میری جاں　　بس دن ہی اک رقم کیا اور رات چھوڑ دی
مجھ کو ہی آسماں نے رکھا موردِ بلا　　لا سر پہ سیل فتنہ و آفات چھوڑ دی

مانی کا خامہ نیچے گلے کے نہ چل سکا — کچھ بوجھ اور سمجھ کے تری گات چھوڑ دی
آزردگی یہ کس سے ہوئی کیا سبب ہوا — نالوں نے میرے سیرِ سماوات چھوڑ دی
شیخوں نے تیرے خوف سے اے فتنۂ زماں — دانستہ لافِ کشف و کرامات چھوڑ دی
جب میں برنگِ دیدۂ تصویر بن گیا — آنکھوں نے یار کی بھی اشارات چھوڑ دی
دل اس کا پھر گیا تھا تو اس کا عجب نہ تھا
پر مصحفی وہ تو نے بھی اب گھات چھوڑ دی

540

جیتے پھرایا بہت گردشِ افلاک نے — ڈھانپ لیے بعدِ مرگ عیب میرے خاک نے
شعبدے لاکھ کیے گردش افلاک نے — رنگ نہ بدلا و لے میری کف خاک نے
سرخی پاں اس قدر لب پہ تو آگے نہ تھی — خوں نہ پیا ہو کبھی اس بتِ سفاک نے
بسکہ میں مستِ شراب قابلِ رحمت نہ تھا — سائے میں اپنے مجھے جا بھی نہ دی تاک نے
لاشۂ عاشق کا پھر کون خریدار ہو — صید حرم کو کیا جب ترے فتراک نے
چشم سے لختِ جگر نکلے بصد آب و تاب — خوب تراشے نگیں عشق کے حکاک[1] نے
رنگِ بدن جھلکے ہے اس کا جو بجلی کی طرح — دھوم مچا رکھی ہے پیرہنِ خاک نے
کیوں نہیں پھرتا تو پھر مصحفی لکھوا تو دی
ایک غزل اور بھی خامۂ چالاک نے

541

خوں کو مرے بعد ذبح نوش کیا خاک نے — قدر نہ جانی مری خنجرِ سفاک نے
عید کے دن کا بناؤ دیکھ کے سب مر گئے — قہر کیا یار کے زیور و پوشاک نے
منزلِ دشوارِ مرگ اس پر جب آساں ہوئی — بوسۂ[2] پا لے لیا بستۂ فتراک نے

1۔ حکاک = نگینہ تراشنے والا 2۔ ب: بوسہ رمانے لیا

وحشیِ صحرا تھا میں باغ سے کیا کام تھا مجھ کو پھنسایا ہے یاں سلسلۂ تاک نے
قبر مٹا دی مری، خاک اڑا دی مری ٹاپوں سے اس شوخ کے توسنِ چالاک نے
گریے سے عشاق کو کچھ نہیں حاصل کبھو اشک کے دانے کو کب سبز کیا خاک نے
روزِ قیامت میں اور ایک قیامت ہوئی منھ سے جو الٹا نقاب اس بتِ بے باک نہیں
شرمِ محبت سے وہ نت تہِ بالیں رہا نامہ جو لکھا کبھو عاشقِ غم ناک نے
بخیہ گر آیا کیا دیر تلک پر نہ لی منّتِ دست رفو سینۂ صد چاک نے
عاشقِ صادق ہوں میں مصحفی کچھ غم نہیں
گو مجھے رسوا کیا اس نگۂ پاک نے

542

تا چند جیسے ظلم کے مارے رہے کوئی اک دن تو اپنے گھر میں بھی بارے رہے کوئی
ہے چت چڑھی ہوئی وہی صورت میں کیا کروں کب تک کسی کو جی سے بسارے رہے کوئی
اے دردِ ہجر جان بھی لے چک، کہاں تلک گنتا شبِ سیہ میں ستارے رہے کوئی
شاید بہ سہو اس سے کوئی کامیاب ہو برسوں جو اپنی جان کو مارے رہے کوئی
مردم رہا ہے موج مری، ہوں میں بحرِ تند بہتر تو ہے جو مجھ سے کنارے رہے کوئی
بعد از فنا تو اے طلبِ زر تو دفع ہو کیا قبر میں بھی ہاتھ پسارے رہے کوئی
دل کے جوئے میں جیت ہو کیا اس کی مصحفی
جی ہی ہمیشہ اپنا جو ہارے رہے کوئی

543

قلق جو دل کی ہے اک آدھ آن رہ جاوے وہ شوخ اب بھی جو آوے تو جان رہ جاوے
روش سے اس کی اگر ہو قریب وصل کی شب تو چلتے چلتے وہیں آسمان رہ جاوے
خبر جو مرنے کی میرے سنے وہ شوخ تو بس دبا ہوا تہِ دندان پان رہ جاوے

تڑپ تڑپ کے میں دی روبروے قاتل جان　　کہ زندگی کا نہ مجھ پر گمان رہ جاوے
ہے شب کی شب مرے پاس اس کے حسن کی تصویر　　کسی کے گھر کوئی جوں مہمان رہ جاوے
دلِ برشتہ کا یہ حال سوزِ غم سے ہوا　　کہ جیسے آگ پہ جل کر لبان رہ جاوے
تو مان لے جو مری بات اور نہ جاوے آج　　تو اس غریب کے جی کا بھی مان رہ جاوے
عیاں ہے یوں سرِ زخم اس کے تیرِ عشق کی بھال　　کہ جوں نکال کے پیاسا زبان رہ جاوے
ہے آج نجد کی منزل، الٰہی ایسا ہو　　قفاے ناقہ کہیں ساربان رہ جاوے
جلا گیا ہے مرا دل فراق یاروں کا　　زمینِ قافلہ کا جوں نشان رہ جاوے
ہواے تند سے ہے سرزنش درختوں پر　　چمن میں کاش مرا آشیان رہ جاوے
میں سر تو تیغ کے نیچے رکھا غضب ہووے　　جو ہاتھ اس کا دمِ امتحان رہ جاوے

لکھیں ہیں مصحفی ہم اس لیے برشتہ غزل
کہ سوزِ غم کا ہمارے نشان رہ جاوے

544

جب خط میں لکھا تب اجلِ نامہ بر آئی　　ہر کام میں اک یاس ہی مجھ کو نظر آئی
کیا منھ کہ پھراتے ہی مرے گر پڑے آنسو　　الفت نہ تجھے وقتِ وداعِ سفر آئی
کیا کام کیا تو نے شبِ وصل میں بولا　　اس شب نہ تجھے موت خروسِ سحر آئی
خنجر سے گلا کاٹ کے مر جاوے گا کوئی　　گر وصل کی شب بانگِ خروسِ سحر آئی
کیا جانیے کیا گل پہ ترے حسن سے گزرا　　سر پیٹتی گلشن سے نسیمِ سحر آئی
اے افعیِ گیسوے بتاں دیکھیں گے تم کو　　گر دل میں ہمارے بھی کسی دن لہر آئی
ہمدم کہوں کیا تجھ سے شبِ وصل کا عرصہ　　جی لینے کو میرے یہ شبِ مختصر آئی

اے مصحفی ہم عشق میں ہیں ثانیِ مجنوں
پھرتے نہیں پھر اپنی طبیعت جدھر آئی

545

ہوئے ہیں یاں کے گل و غنچہ آشنا کس سے لگاوے دل کوئی اس باغ میں بھلا کس سے

نہ گل ہے رنگ پہ اپنے نہ لالہ ہے شاداب سدا چمن کی موافق رہی ہوا کس سے

سرِ علاج مسیحا کو جب نہ ہو مطلق مریضِ عشق کی پوچھے کوئی دوا کس سے

ہمارے سر کی قسم ہے گر اب کے عید آئی تم اپنے پانو کو لگواؤ گے حنا کس سے

نہ غنچہ ہوں میں نہ گل نے غبارِ کوچہٗ یار کیا کرے ہے تو اٹکھیلیاں صبا کس سے

دیا ہے دل تو ولے جی میں ہم سمجھتے ہیں لبے گی الفتِ خوبانِ بے وفا کس سے

تمھارے کشتۂ الفت کا دم ہے آنکھوں میں تم ایسے وقت میاں کرتے ہو حیا کس سے

ہزار تیغ سے مارا گیا ہے یہ دلِ زار صفِ مژہ میں کوئی مانگے خوں بہا کس سے

کنارِ بحر پہ طالع نے تشنہ کام رکھا ہے اس میں جرمِ فلک کیا کروں گلا کس سے

میں دیکھتا ہوں میاں مصحفی تمھیں غم ناک
لگا ہے ان دنوں کہیے دل آپ کا کس سے

546

پیلِ فراق پانو کے نیچے مسل نہ جائے شب آج کی ہے سخت کہیں دم نکل نہ جائے

ایام میں شباب کے اپنی خبر بھی رکھ تابِ نگہ سے شیرِ صباحت اُبل نہ جائے

بے ڈول ہو گئی ہے ہوا کوے یار کی ہے نامہ بر کا صرفہ اگر آج کل نہ جائے

سقا پسر نے مشک سنبھالی ہے دوش پر لب تشنگانِ ناز کو رستے میں چھل نہ جائے

ابرو تنے ہوئے وہ گیا ہے برائے سیر ڈرتا ہوں چوک میں کہیں تلوار چل نہ جائے

دامن کو اس کے خون سے افشاں کروں ہوں میں تلوار مار کر جو وہ میرے اچھل نہ جائے

فانوسِ شیشہ سے وہ جب اپنے لڑائے آنکھ یہ شکلِ شمع دیکھ کے پروانہ جل نہ جائے

مجنوں کے اشتیاق میں ہیں یہ خرابیاں ناقہ وگرنہ جانبِ کوہ و کتل[1] نہ جائے

1۔ کتل = پتھر

ایسا نہیں کوئی ترے کشتے کی نعش پر — جو آکے دور سے کفِ افسوس مل نہ جائے

جس وقت تیغ ننگی لیے آئے وہ صنم
آگے سے اس کے مصحفیِ خستہ ٹل نہ جائے

547

رنجورِ دردِ ہجر تو رنجور ہی بھلے — گر ہم سے شخص دور رہیں دور ہی بھلے
عاشق کو تیرے ان کے نظارے سے رشک ہے — دیدے ستارگاں کے تو شب کور ہی بھلے
تم مہرباں جو چلتے ہو چالیں ہمارے ساتھ — وضعیں یہ خوش نما نہ یہ دستور ہی بھلے
گر دل کے روزنوں میں نہ ہوویں الم کے نیش — ان روزنوں سے خانۂ زنبور ہی بھلے
معشوق پہ مرے نہ پڑے تا انھوں کی آنکھ — جو جلتی ہیں شیفتۂ حور ہی بھلے
ایسا نہ ہو کہ طوقِ کمر اس کے ہوں کہیں — دستِ خیالِ غیر تو معذور ہی بھلے
سستی و کاہلی میں بھی ہے ان کی اک بہار — جوں رندِ بادہ نوش تو مخمور ہی بھلے
پڑتی ہے برق خانۂ ایماں میں ان سے آہ — چہرے جو لالہ گوں ہیں وہ مستور ہی بھلے

اے مصحفی ملی انھیں اجرت بوقتِ شام
سختی کشانِ عشق سے مزدور ہی بھلے

548

نہ کچھ آنسوؤں سے فقط گال بھیگے — میں رونے پہ آیا تو رومال بھیگے
گھٹا گھِر رہی ہے نہ تم گھر کو جاؤ — مبادا تمھاری کہیں شال بھیگے
ہوا ذبح واں نامہ لے جا کے میرا — کبوتر کے خوں میں پر و بال بھیگے
مرے سر پہ یوں تیغ و تیر اس کے برسے — کھڑا جیسے باراں میں کنگال بھیگے
بنایا انھیں آپ نے سلکِ گوہر — دمِ غسل اس بت کے جب بال بھیگے
کرو پیچواں اس کا اس طرح تازہ — کہ تر ہووے نیچہ، نہ منہال بھیگے

مرے گریہ سے روزِ محشر الٰہی　　گنہگاروں کی فردِ اعمال بھیگے
یہ بے آب تھی کربلائے محبت　　نہ اک مردے پر دستِ غسّال بھیگے
تو ابرِ بلا کم برس مصحفی پر
غضب ہے کہ یہ خستہ احوال بھیگے

549

سخن از پختگی سیبِ زنخداں کیجے　　وادیِ خام خیالی کو گلستاں کیجے
پھبن ہونے کی تمنا ہو جو زخمِ دل کو　　سودۂ مشک کو لے اس پہ پریشاں کیجے
نرگستاں ہے ترے منتظروں کی مجلس　　کبھی یاں بھی گزرائے سروِ خراماں کیجے
اب تو ناقے سے اتر چلیے پیادہ لیلیٰ　　فرش تلووں کے تلے چشمِ غزالاں کیجے
وہ بھی کیا عشق جو بعد اس کے نہ ہو غم یارب　　زخمِ دنداں کو نصیبِ لبِ دنداں کیجے
مجھ سے شاخِ گلِ شگفتہ یہ کہتی ہے صبا　　نو بہار آئی ہے پھر چاک گریباں کیجے
شرم آتی ہے ہمیں ہم سے نہ ہوگا یہ کام　　آئینہ تیرے دو چار اے مہِ تاباں کیجے
تیر کھانے کی یہ خواہش ہے کہ جی چاہے ہے　　جمع اک زخم پہ یک دستۂ پیکاں کیجے
اے فروبستگیِ غنچۂ دل بہرِ خدا　　گلشنِ دہر کو یوں مجھ پہ نہ زناں کیجے
مصحفی ہند میں اب قدرِ فصاحت نہ رہی
چلیے شیراز کو یا قصدِ صفاہاں کیجے

550

ہم زخود رفتہ کدھر جائیں گے　　رو بہ ہوا مثلِ شرر جائیں گے
لالہ صفت گلشنِ ہستی سے ہم　　داغ بدل، دست بسر جائیں گے
میان سے نکلے گی جو وہ تیغِ ناز　　لاشوں سے صحرا کئی بھر جائیں گے
آپ کو باریک کیا ہے کہ ہم　　دیکھنے اس گل کی ....؟ گے

ہاتھ میں لے کر تری تصویر کو دیکھتے ہی دیکھتے مر جائیں گے
یار کی ملنے میں جو مرضی نہیں زیست کے دن یوں ہی گزر جائیں گے
ہم نے شبِ ہجر جو نالے کیے عرش سے بھی پار گزر جائیں گے
دل نہیں دیتا ہوں بتاں کو کہ یہ لے کے میرے دل کو مکر جائیں گے
گر ہے یہی تیوری چڑھانا صنم طور ترے جیسے اتر جائیں گے
بزم میں جس دم وہ ہنسا کِھل کِھلا پھول چنبیلی کے بکھر جائیں گے
ہم ہیں دعا گوے قدیمِ چمن یاں سے کہاں بادِ سحر جائیں گے
اب کے پھر اس بحر میں ہم مصحفی
جادوگری اور بھی کر جائیں گے

551

سیرِ چمن کو ہم اگر جائیں گے خندۂ گل دیکھ کے مر جائیں گے
کوچے سے آئے ہیں تیرے جو غریب کہتے ہیں ہم پھر نہ ادھر جائیں گے
رہنے کے اس بزم میں مطلق نہیں ہیں سفری شام و سحر جائیں گے
یار کے جی میں نہ اثر ہووے گا جی سے اگر یار گزر جائیں گے
بزم میں آنے دے ہمیں دو گھڑی ماتمِ پروانہ تو کر جائیں گے
صبحِ شبِ وصل ہوئی جاں ستاں جوں یہ کہا اس نے کہ گھر جائیں گے
آئی گر اس طفل کو ٹک بھی تمیز بگڑے ہوئے طور سنور جائیں گے
سوچ ہے اس بات کا کس منہ سے ہم حشر میں لے دامنِ تر جائیں گے
اس نے کیا یاد تو خوش خوش وہیں دوڑے ہوئے شمس و قمر جائیں گے
بازو ترے گول ہیں ہوں گے سڈول جب دو ورق اور اتر جائیں گے
زیبِ کمر کرتے ہو کیوں تیغ کو سر نہ غریبوں کے اتر جائیں گے

ایک دن آوے گا وہ اے مصحفی
یار کے ہم جی سے بسر جائیں گے

552

کیا حسنِ تجلّی ہی ترے رُو میں چھپا ہے — اک سحرِ مجسّم ہے کہ ہر مُو میں چھپا ہے
سرچنگ[1] جو کھائے ہے ترے ہاتھ سے اس نے — پیکاں ترا آ کر مرے پہلو میں چھپا ہے
کب دیدۂ نرگس سے وہ ہوتا ہے ادا ہائے — جادو جو تری نرگسِ جادو میں چھپا ہے
صد شکر کہ وہ اس کو ہی مجروح رکھے ہے — کینے کا جو نشتر دلِ بدگو میں چھپا ہے
ہر چند بظاہر تو میں خامش ہوں پہ میرے — ہنگامۂ محشر بُنِ ہر مُو میں چھپا ہے
باندھی ہے کمر اس نے مری نامہ بری پر — کیا کوئی ملک پیکرِ یا ہو میں چھپا ہے
کھائے ہیں تری تیغ کے میں زخم جو پیہم — کُرتا تنِ عریاں کا اُتّو میں چھپا ہے
وہ ناز جو بھاگا تھا ترا ناز چرا کر — جا کر نگہِ دیدۂ آہو میں چھپا ہے
تو ڈھونڈھ کے گر اس کو نکالے تو نکالے — رشتہ رگِ جاں کا ترے گیسو میں چھپا ہے
اے شوخ تو خوباں کا جو لے جاتا ہے پنجہ — تعویذ کوئی کیا ترے بازو میں چھپا ہے
بو گل میں نہاں ہوتی ہے اے جانِ نزاکت — تُو وہ گلِ نازک ہے کہ خود بو میں چھپا ہے
کپڑا جو بدن کا میں ترے سونگھوں ہوں ہر دم — ہے اس کا یہ باعث کہ تو اس بو میں چھپا ہے

محراب سے کیا مصحفیِ خستہ کو ہے کام
مدت ہوئی یہ گوشۂ ابرو میں چھپا ہے

553

حسنِ چمن پری کے برابر نہ ہو سکے — سنبل کی جعد زلفِ معنبر نہ ہو سکے
اُگتے ہی سبزہ خاک سے ظالم کی فصلِ گل — نشتر ہو بہرِ فصد جو خنجر نہ ہو سکے

1۔ سرچنگ = ضرب

ہر دم کہے ہے مجھ سے یہی اضطرابِ دل
خود جا تو نامہ بر جو کبوتر نہ ہو سکے

پیدا کیا فقط دلِ عاشق شکست کو
جوں شیشہ لخت لخت تو پتھر نہ ہو سکے

بھاگے نہ اتنا تیرگیِ بخت سے بھی دور
انساں شبہ[1] تو ہووے جو گوہر نہ ہو سکے

جینا ہے کیا ضرور بھلا اس مریض کا
جس کی غذا طعامِ مزوّر[2] نہ ہو سکے

باندھوں اگر خیال تو اس مستِ ناز کا
صفحے پہ دل کے نقش مصوّر نہ ہو سکے

اسبابِ عیش جس کو میسر نہ ہو سکے
گر غم سے دوستی نہ کرے پھر وہ کیا کرے

یہ چاہتی ہے کج رویِ چرخ کاغذی
صفحہ بھی میرے ہاتھ سے مسطر نہ ہو سکے

مفہوم سلطنت ہے جدا سچ ہے مصحفی
آئینہ گر نظیر سکندر نہ ہو سکے

554

نہ خوں ریزی سے اس کی اک دو زنداں ہو گئے خالی
علم کی تیغ تو میداں کے میداں ہو گئے خالی

مرے نالوں کی گرمی نے ہوا کی آتشیں از بس
چرندوں سے پرندوں سے بیاباں ہو گئے خالی

اگر صحرا سے آیا شہر کی جانب میں دیوانہ
خبر سنتے ہی لڑکوں سے دبستاں ہو گئے خالی

صفائے اشک غلطاں تاجروں کو جب پسند آئی
وہیں دُرِ عدن سے جیب و داماں ہو گئے خالی

سمندر ہر مژہ سے عشق میں کس نے بہائے تھے
میں جب رونے پہ آیا جوشِ طوفاں ہو گئے خالی

صفائے رخ کو تیرے دیکھ کر بازار خاتم میں
سراسر قالبِ آئینہ سازاں ہو گئے خالی

یہ میرے آہ و نالہ نے انھیں ہر شب اذیّت دی
کہ ہم سایوں کے گھر بے حکم سلطاں ہو گئے خالی

یہ کس کی چشمِ غارت گر گئی از بہر تاراجی
غزالوں سے جو صحرائے غزالاں ہو گئے خالی

نہ کڑھ اے مصحفی اتنا کہ موسم ہو چکا آخر
بہارِ گل گئی ناداں، گلستاں ہو گئے خالی

1۔ ب میں جگہ خالی (مطلب واضح نہیں)　2۔ مزوّر = پرہیزی کھانا

555

گو یار کا گھر مجھ سے دو کوس جریبی ہے
جرم اس کا ہے کیا یہ سب طالع کی رقیبی ہے

کافر ہوئے کیوں اس پر دیندار زمانے کے
اس زلفِ چلیپا کا خط گر نہ صلیبی ہے

مارے نہ صبا کیونکر دیوانوں کو چوبِ گل
گلشن میں وہ گل آیا یہ جائے ادبی ہے

رہتے ہیں دھرے اکثر جو لالۂ داغ اس پر
عاشق کا یہ سینہ ہے یا پھولوں کی چھبی[1] ہے

نالے کی چھڑی ہر دم دل ہاتھ میں رکھتا ہے
قسمت میں مگر اس کے اتری یہ نقیبی ہے

عاشق کا گلا اپنے رکھتی ہے تہِ خنجر
محبوب جو ہیں اب کے ان کی یہ حبیبی ہے

بھٹکوں ہوں میں مدت سے اس دشتِ جدائی میں
منزل کو نہیں جاتا یہ طرفہ غریبی ہے

بیمار نہیں ہوتا اس بت کا کبھی اچھا
کیا جانے طبیبوں کی یہ کیسی طبیبی ہے

اشعار ترے سن کر میں مصحفی خوں رویا
گیلانِ فصاحت کا مانا تو نصیبی ہے

556

ہمیں نت اسیرِ بلا چاہتا ہے
ہماری خوشی کب خدا چاہتا ہے

شب و روز رویا کریں خون آنکھیں
یہی تو وہ رنگِ حنا چاہتا ہے

وہ کرتا ہے اپنے ہی جی میں برائی
کسی کا کوئی گر برا چاہتا ہے

دلا بیٹھ رہ رکھ کے دنداں جگر پر
توکّل کا گر تو مزا چاہتا ہے

اسے آپ ہے دھیان آنے کا تیرے
وہ گل تجھ کو بادِ صبا چاہتا ہے

مرے استخواں سے بھی ہے اس کو نفرت
مُرے فاقہ کر کے، ہُما چاہتا ہے

نہیں خواہش اس کی کھلی ہم پہ اب تک
وہ کیا مانگتا ہے وہ کیا چاہتا ہے

مگر یہ کہ ان روزوں پھر مصحفی کو
ترے غم میں سودا ہوا چاہتا ہے

1۔ چھبی = ٹوکری؟

557

جس چاہ پر گیا میں بیاباں میں ڈوبنے　　بولا کہ جا تو نوح کے طوفاں میں ڈوبنے
جب سامنے میں اُس صفِ مژگاں کے آ گیا　　انیاں لگیں ہزاروں دل و جاں میں ڈوبنے
اے ناخدائے حفظ الٰہی پہنچ، مری　　کشتی لگی ہے ورطۂ طوفاں میں ڈوبنے
آیا وہ آپ مجھ پہ چھڑکنے گلابِ اشک　　جب غش سے جی لگا شبِ ہجراں میں ڈوبنے
دریائے حسن سے ترے کیا وا ہوا نقاب　　یوسف جو پھر چلا چہِ کنعاں میں ڈوبنے
لی جان میری موئے پریشانِ یار نے　　آیا تھا کیا میں سیل کے طوفاں میں ڈوبنے
دریائے معرفت کی تہ آوے وہیں نظر　　سر جوں صدف لگے جو گریباں میں ڈوبنے
آخر ترا کے اس نے اتارا ہے پیرہن　　چولی لگی جو عطرِ گریباں میں ڈوبنے
نیلے کے خال کو ہوئی اس لب سے رفتگی　　مورِ سیہ گیا شکرستاں میں ڈوبنے
میرے فروغِ بخت پہ کیا آفت آ گئی　　یہ سوکھ کیوں لگا شبِ ہجراں میں ڈوبنے
گر گریہ موج خیز ہوا قیس کا کبھی　　کانٹے لگیں گے دشت کے داماں میں ڈوبنے

خالِ سیہ نہیں ذقن اس کی پہ مصحفی
زنگی چلا ہے چاہِ زنخداں میں ڈوبنے

558

کہہ گیا کچھ تو زیرِ لب کوئی　　جان دیتا ہے بے سبب کوئی
جاوے قاصد اُدھر تو یہ کہیو　　راہ تکتا ہے روز و شب کوئی
گو کہ آنکھوں میں اپنی آوے جان　　منہ دکھاتا ہے ہم کو کب کوئی
بن گیا ہوں میں صورتِ دیوار　　سامنے آ گیا ہے جب کوئی
گرچہ ہم سائۂ اُس پری کے رہے　　نہ ملا جھانکنے کا ڈھب کوئی
حد خوش آیا یہ شعرِ میرؔ مجھے　　کر کے لایا تھا منتخب کوئی

اب خدا مغفرت کرے اس کی میرِ مرحوم تھا عجب کوئی
اے فلک اس کو تُو غنیمت جان
مصحفی سا نہیں ہے اب کوئی

559

کر نہ تو اے عشق ہر اک کا تماشائی مجھے
ہوں میں کوچک دل، نہیں ہے تابِ رسوائی مجھے

تا نہ لاوے بر سرِ بازار رسوائی مجھے
کاش یاں مہلت نہ دیوے مرگِ صحرائی مجھے

یار کے چاہِ زنخداں میں گرا ہی تھا میں آہ
تھام رکھتی گر نہ ان زلفوں کی گیرائی مجھے

سجدہ کرتا ہوں میں ہر اک نقش پائے یار پر
ایک دن رسوا کرے گی یہ جبیں سائی مجھے

اشتیاقِ سجدۂ در نے نکالا دَیر سے
سوے مسجد لے گیا شوقِ جبیں سائی مجھے

وادیِ وحشت میں آیا جب میں سودائی مزاج
ہو کے ششدر بول اٹھا قسمت کہاں لائی مجھے

بیٹھ رہتا تھا میں تجھ سے جن دنوں میں روٹھ کر
اُن دنوں کی یاد آتی ہے شکیبائی مجھے

گر یہی آئینہ ہر دم دیکھنا ہے، دیکھیو
مار ڈالے گی صنم تیری خود آرائی مجھے

اور بھی میں نے لکھی رنگیں سی اس میں اک غزل
یہ زمیں اے مصحفی از بس بہت بھائی مجھے

560

وصل کی شب ہے یہ یارب کیوں نہ موت آئی مجھے
تا نظر آتا نہ روے روزِ تنہائی مجھے

اس کا رونا ہے کہ کیا بے وقت موت آئی مجھے
اپنے یاروں سے جدا کرتی ہے تنہائی مجھے

سخت جانی سے ہے میری سنگِ خارا منفعل
اس پہ پیسے ڈالتا ہے چرخِ مینائی مجھے

ہم صبا رکھتی ہے میرا پاس اے گل ہم نسیم
جانتے ہیں سب تری زلفوں کا سودائی مجھے

پہلے عقل و ہوش کو اپنے اجارے میں لیا
تب کہیں مانی نے وہ تصویر دکھلائی مجھے

خواہ عریاں خواہ اک چادر میں رکھ کر گاڑ دو
گور میں کرنی نہیں کچھ مجلس آرائی مجھے

آہ کیا چُوکا میں جب مجھ سے ہوا تھا تُو دوچار ماں گ لینی تھی ترے دل سے شکیبائی مجھے
جب مقابل آ گئے اس کے، شبیہِ حسن نے منہ چھپایا، جان کر اپنا تمنائی مجھے
تابِ خفت میں نہ لاؤں گا حضورِ مرسلاں روزِ محشر تو نہ رسوا کیجو رسوائی مجھے
صبر آتش زیرِ پا کو مجھ سے کیا تھا انفعال چھپ گئے ایسے کہ پھر صورت نہ دکھلائی مجھے
تشنۂ خوں اس کے کچھ دست نگاریں ہی نہیں تک رہی ہے سادہ چھلّوں کی بھی زیبائی مجھے
راز دل سے مصحفی میرے کوئی آگہ نہ تھا
کیا کروں میں خامشی فریاد میں لائی مجھے

561

ساون سی کچھ برسنے وہیں چشمِ تر لگی تم نے کیا بتاؤ تو مجھ کو نظر لگی
پہنچی نہ بارگاہِ اجابت تلک جو تُو یہ کس کی بد دعا تجھے آہِ سحر لگی
آخر وہ پنجۂ علمِ ماتمی ہوا بہلے کے بھی نہ ہاتھ جب اس کی کمر لگی
آیا کبھی جو خواب ترے بے قرار کو لیٹا تو پر زمیں سے نہ پشتِ کمر لگی
شاید لکھا نہ اس نے بہ شوخی جوابِ خط واں تجھ کو اتنی دیر جو اے نامہ بر لگی
کس کا ہے عزمِ قتل جو اے جنگ جُو ترے پشت و کمر سے رہتی ہے تیغ و سپر لگی
پھیری جو اس نے آنکھ تو قاتل کی مردمک گولی سی دل پہ وقتِ وداعِ سفر لگی
دل دفعتاً بھڑک کے جو بس سرد ہو گیا اس کو تری نگاہ کی برچھی مگر لگی
عاشق کے دل کو کیوں کہ تسلی ہو گھر کے بیچ تصویر اس کی تا نہ رہے پیشِ در لگی
پھرتا ہے جب روش پہ وہ گل باغ میں تو واں اک آفتابی رہتی ہے بالائے سر لگی
اللہ رے تیرے حسنِ جہاں سوز کی چمک بجلی بھی جس کے سامنے مجھ کو شرر لگی
شب اس پری کا مجھ کو تصور جو بندھ گیا
اے مصحفی نہ آنکھ مری تا سحر لگی

562

رہا نہ دل ہی کیے غم نے سنگسار ایسے نصیب پھوٹ گئے اپنے ایک بار ایسے
فراقِ یار نے اپنا تو پیس ڈالا جی ہمیشہ سخت نہ تھے روز انتظار ایسے
کسی نے کی جو سفارش مری تو اس نے کہا بھرے پڑے ہیں ہزاروں ذلیل و خوار ایسے
میں صدقے دستِ طلا کوبِ چرخ و انجم کے بنا تو دیوے کوئی قصر زرنگار ایسے
قیامت آئی نہ تو بھی اٹھے ترے مفتوں لحد میں تھے غمِ فرقت سے ہم کنار ایسے
کہے ہے دیکھ کے افلاک کو مرا نالہ نہ ہوسکیں گے مرے سدِّ رہ غبار ایسے
ہوا یہ ہم پہ ہویدا خزانِ نرگس سے ملیں ہیں خاک میں یاں لاکھوں تاجدار ایسے
سمندِ چرخ نے پامال کیا مجھی کو کیا مٹائے سُم کے تلے سینکڑوں مزار ایسے
نہ کچھ انہی میں درستی نہ کچھ انہی میں ثبات جو قول ویسے کیے تم نے تو قرار ایسے
صدا سے ان کے وہ کانوں میں انگلیاں دے ہے مزاجِ دوست پہ نالے ہیں ناگوار ایسے
بہائے تیرِ طلا ایک قطرۂ خوں ہے ہمارے دشت میں ارزاں نہیں شکار ایسے
نشاں نہ ایک کا تلووں میں رہ گیا باقی یہ آبلے ہوئے سب رزقِ نوکِ خار ایسے
نہ مصحفی سا میاں پاؤ گے کوئی غم خوار
ملیں گے یوں تو مصاحب تمھیں ہزار ایسے

563

خط کی تحریر ترے حسن کی خواہاں آئی مورچہ کو طمعِ ملکِ سلیماں آئی
جب گیا یار کی محفل میں وہاں جم بیٹھا آدمیّت نہ تجھے اے دلِ ناداں آئی
کھا کے خفت جو گئی حسن صفا سے اس کے آرسی پھر نہ دوچارِ رخِ جاناں آئی
اتنا مغرور نہ ہو اپنے پہ، چیت اے سنبل گوش مالی کو تری کاکلِ پیچاں آئی
تیری تصویرِ خیالی کو بھی خطرہ ہی رہا وہ مرے گھر نہ کبھی موسمِ باراں آئی

ناقہ لیلیٰ کا گیا دور نکل اے مجنوں — نیند رستے میں تجھے زیرِ مغیلاں آئی
کس جگر خستہ کے تلووں کا لہو نوش کیا — تم میں سرخی بہت اے خارِ مغیلاں آئی
کوئی جیتا نہیں یاں او لٹے پھرا بس قاتل — غیب سے جب یہ صدا از درِ زنداں آئی
شکوہ مجنوں کو رہا اس سے یہی کا ے لیلیٰ — نجدیوں میں تو کسی رات نہ مہماں آئی
جان کو تن سے نکلنے میں بڑا سوچ رہا — لب تک آئی پہ بصد حسرت و حرماں آئی
تیرہ بختانِ ازل کا بھی ستارہ چمکا — واں جو مستی سے جلا بر سرِ دنداں آئی
نام اغیار کو جھٹ پٹ وہ گیا کل بتلا — میں جو پوچھا تو مرے نام پہ نسیاں آئی
اَور تو اَور کہ اس نے بھی مجھے چھوڑ دیا — بیکسی بھی نہ مری قبر پر گریاں آئی

مصحفی مردے سے کچھ کم تو نہ تھا یار بغیر
تجھ میں پھر جان تو اے صورت بے جاں آئی

564

اے پری چہرہ مجھے تجھ سے جو الفت ہو جائے — بلبل و گل میں ابھی ترک محبت ہو جائے
ہر جفا پر میں تری شکر کیا کرتا ہوں — مجھ کو ڈر ہے نہ کہیں یہ بھی شکایت ہو جائے
تیرے بیمار کی مرضی ہے کہ پرسش کو مری — جو کوئی آوے ذرا بیٹھ کے رخصت ہو جائے
گر بھرے خوں سے مرے عشق سبو کیا حاصل — بزمِ خوباں میں اگر جائے تو شربت ہو جائے
توسنِ ناز تو اتنا نہ گرا او بے رحم — لطف کیا خاک برابر مری تربت ہو جائے
خادمِ پیرِ مغاں نام ہے میرا مشہور — کاش کہ دستِ سبو سے مجھے بیعت ہو جائے
گر خدا چاہے چراغِ دلِ عاشق نہ بجھے — لطمہ صرصر کا اسے دستِ حمایت ہو جائے
کوچۂ یار سے اٹھنے تو نہ دے میرے تئیں — ناتوانی تجھے کاش اتنی تو طاقت ہو جائے

مصحفی تجھ سے ترے یار کا دل صاف نہیں
ہے تو اچھا جو بہم رفع کدورت ہو جائے

565

کتنے تو تیرے پان چبانے میں مر گئے
ہونٹوں پہ کتنے مِسی لگانے میں مر گئے

اے آفتابِ حسن یہ اندھیر کیا کیا
بس ہم تو تیرے منھ کے چھپانے میں مر گئے

اک شمع کے جو سو نظر آئیں انھیں وہاں
جل کر پتنگ آئنہ خانے میں مر گئے

حیرت نے آئنہ تو بنایا ہمیں پہ ہم
ان کافروں کے آنکھ لڑانے میں مر گئے

سوؔدا رہا نہ میرؔ نہ قائمؔ ہزار حیف
جو آشنا تھے اپنے زمانے میں مر گئے

بیمار تھے جو سیبِ زنخداں کے تیرے یار
میں کیا کہوں وہ سیب سنگھانے میں مر گئے

جھگڑا یہی ہمیشہ رہا، ہم تو مصحفی
ناصح کے چاکِ جیب سِلانے میں مر گئے

566

لپٹی ہے وہاں زلفِ گرہ گیر گلے سے
مانوس ہے یاں عشق کی زنجیر گلے سے

یہ خشک لبی ہے ترے بسمل کی تو قاتل
اترے گا نہ آبِ دمِ شمشیر گلے سے

از بس وہ گلوگیر ہے مانی کے قلم کی
بڑھنے نہیں پاتی تری تصویر گلے سے

دن عید کے خفت ہوئی احباب میں مجھ کو
رک کر جو لگا وہ بتِ بے پیر گلے سے

سر کاٹ کے تو پھینک دے ان کو کوئی جوں شمع
آتش نفساں کرتے ہیں تقریر گلے سے

موت آوے مؤذن کو شبِ وصل الٰہی
نکلے ہی نہ یہ نعرۂ تکبیر گلے سے

مصری کا بڑھاپے میں بھی ویسا ہی مزہ ہے
جاتی ہی نہیں سوز کی تاثیر گلے سے

اے جذبِ محبت تو کشش اپنی دکھا دے
رانجھا کے کسی دن تو لگے ہیر گلے سے

اے مصحفی تا کے خمِ گیسو کی اسیری
رسّی تو کہیں کھول بہ تدبیر گلے سے

☆☆☆☆

مخمس بر غزلِ مرزا تقی ہوس تخلص

نے سیم و زر، نہ گنجِ فراوان لے گئے　　نے قصر و نے عمارت و ایوان لے گئے
نے تاجِ جم نہ تختِ سلیمان لے گئے　　میں کیا کہوں جو قصر وہ خاقان لے گئے
لاکھوں جہاں سے ساتھ وہ ارمان لے گئے

مجنوں سے تھا میں وادیِ وحشت میں ہم عناں　　اڑتی تھیں جیبِ صبر کی بھی دھجیاں جہاں
میں تجھ سے پوچھتا ہوں بتا سچ تو باغباں　　کیا ان کو بھی جنوں تھا جو گلہائے بوستاں
ثابت نہ اس چمن سے گریبان لے گئے

ملتا ہے مدتوں میں جو کوئی بچھڑا آشنا　　آتا ہے اس کو دیکھ کے البتہ جی بھرا
پھر اس پہ یہ کہ ہو وہ مصیبت میں مبتلا　　یکبار ہم صفیروں نے دیکھ اس کو رو دیا
میرا قفس جو سوئے گلستان لے گئے

مے خوں کی جوش مارے ہے گل کے ایاغ سے　　بوئے کباب آتی ہے لالے کے داغ سے
اک غنچہ یاں کھلا نہ نسیمِ فراغ سے　　کیسے چمن میں آئی کہ چن چن کے باغ سے
دامن میں اپنے ہم گلِ حرمان لے گئے

نے باغباں سے شکوہ نہ کچھ تجھ سے عندلیب　　اپنے جو آشنا نہ تھے وہ ہی ہوئے رقیب

اب دیکھیں کیا دکھاوے غمِ دوریِ حبیب ہم روئے گل بھی دیکھنے پائے نہ یا نصیب
ہم کو بہار میں سوے زندان لے گئے

گریے سے بسکہ کام رہا شام اور سحر مژگانِ تر سے میری تر آیا یہ ابر تر
رونا اگر یہی ہے تو کیا دل ہے کیا جگر طوفاں اٹھے گا قبر سے ہم خاک میں اگر
ساتھ اپنے اپنے دیدۂ گریان لے گئے

ہر چند دل میں تھے غمِ پنہاں سے ولولے رہتے تھے مارے ضبط کے لیکن وہ سب چھپے
کس روز روئے کھول کے دل ہم سے غم زدے نت بھر بھر آئے اشک پہ ہم مارے پاس کے
آنکھوں تلک نہ گوشۂ دامان لے گئے

پایا[1] نہ گل، نہ زمزمۂ ہم صفیر کو دیکھا نہ آبشار کو، نہ وہاں آب گیر کو
اک اور غم ہوا دلِ حرماں پذیر کو بہتر تھا اس چمن سے قفس مجھ اسیر کو
کیوں یار سوے گلشنِ ویران لے گئے

پیدا کیا کسی نے مقامِ فروتنی سجدے میں جھک گیا کوئی وقتِ سر افگنی
حاصل نہ اک مجھی کو ہوئی چشمِ روشنی اس قتل گاہِ یاس میں کیا کیا نہ کشتنی
گردن پہ تیری تیغ کا احسان لے گئے

کیوں سیرِ باغ کو میں گیا تھا دمِ سحر صدمے اٹھائے زمزمہ سنجوں کے اس قدر
مژگاں سے میری ٹپکے ہے خونِ رگِ جگر منقار نے انھوں کی کیا کارِ نیشتر
مرغانِ خوش نوا تو مری جان لے گئے

1۔ ب: پایا نہ زمزمے میں کسی ہم صفیر کو

مشتاق ہم قفس میں کبھی تھے نسیم کے دل بستہ جیسے ہوتے ہیں غنچے نسیم کے
اب بخت اس طرف کو گئے لے نسیم کے آہو ختن میں مست ہیں، جھونکے نسیم کے
شاید کہ بوے زلفِ پریشان لے گئے

ہستی کو تھا گزر نہ بہ کنجِ فراغِ قیس نے ظلمتِ عدم ہی کرے تھی سراغِ قیس
گل ہو گیا تھا مصحفی کیسا چراغِ قیس تازہ ہوا پھر از سرِ نو اس کو داغِ قیس
ناحق ہوس کو سوے بیابان لے گئے

مقطعات

طلب حضور سے کرتا نہیں کچھ ایسی چیز یہ کیا سبب ہے کہ ہوتا نہیں قبول سوال
عجب یہ ہے کہ بہ فتوائے باد دستیِ عشق حمامہ[1] پودنہ پر زر کو پر ملیں فی الحال
کبوترانِ سخن کا جو شاہباز ہو وہ رہے عجوز میں کہنی کی طرح بے رومال
نہ نقد کچھ اسے سرکار سے عنایت ہو نہ پاوے اپنی ہی سب نیم ماہواری سال
نہ اس کو کھیس ملے، نے لبادہ، نے پٹو رضائی کوئی بھی مَیلی سی، نے پرانی شال
جفاے برد سے پہنچا ہے یہ قریبِ ہلاک رہے نہ کیوں کہ شب و روز اس کے دل کو ملال
تنور مہر کا ہوتا ہے صبح دم مدعو رکھے ہے بختِ سیہ شب کو مہمانِ زگال[2]
بجاے توشک ایک بوریا ہے فرشِ پلنگ ہے اس کے نیچے بچھی برقیوں کے گھر کی پرال
بوقتِ خواب ہے توشک لحاف کہ جاگہ خرید جاڑے کی وہ رندہ غسال
ہے رحم ان پہ جو اس عہد میں ہیں بے نوکر قصور بخت سے جب نوکروں کا ہووے یہ حال
کماں قدوں پہ ہوا چلّہ تیغ زن کب کا ہنوز بخششِ ملبوس میں بھی ہے اہمال

1۔ حمامہ، پودنہ = چڑیوں کے نام 2۔ زغال = کوئلہ (مراد آگ) ب: پیال۔ (پیال، بھس، غلہ نکالے ہوئے دھان کا لانگ)

اگر یہی ہے تأمل مزاجِ عالی کا　تو خون جاڑے میں ہوتے رہیں گے یاں ہر سال

بیانِ واقعہ مصحفی یہ ہے جو سنا
اب آگے آپ جو چاہیں کریں سخن کو خیال

قطعہ در غسلِ صحت نواب صفدر علی خان

خدا نے دن یہ دکھایا کہ وہ مہِ تاباں　ہوا تو غسل سے صحت کے آسمانِ کرم
پڑا جو تن پہ ترے آبِ صاف، پیش نظر　شگفتہ ہو گیا شبنم سے بوستانِ کرم
وہ نخل ہے تُو کہ آبِ حیات سے جس کو　ہمیشہ سینچتا رہتا ہے باغبانِ کرم
دعا یہی ہے ترے حق میں اس کی اے ممدوح　ہے مصحفی جو ترا ریزہ چینِ خوانِ کرم
رکھے ہمیشہ خدا تجھ کو تندرستی سے　رہے ہمیشہ ترا ہاتھ دُر فشانِ کرم

قطعہ

وہ محمد تقیِ میر کہ تھا　ریختہ میں ہر ایک کا سرتاج
ہندِ جنّت نشاں میں رکھتی تھی　غزلِ عاشقانہ اس سے رواج
خرمنِ عمر اس کا برقِ اجل　کر گئی جس دم آن کر تاراج

از سرِ درد مصحفی نے کہا
حق میں اس کے موا نظیری آج[1]
1225=1221+4

قطعہ

جب قلندر بخش جرأت مر گیا　ریختہ کے خوں نے کھایا دل میں جوش
ہوگئی تختہ[2] دوکانِ نظم و شعر　اٹھ گیا بازار سے گوہر فروش
سالِ رحلت اس کے بعد از یک دو ماہ　مصحفی سے کہہ گیا پھر یوں سروش

1۔ نسخۂ بنارس میں لکھا ہے 1221　2۔ ب: تختی

سو وہ ہے یہ مصرع بے بیش و کم ہوگئی کیا بلبلِ نالاں خموش

1224

قطعہ

دنیا میں چار چیز دیکھیں بے اصل پوچھے جو کوئی تو میں کروں ان کا بیاں
بے مایہ کی نوکری، زنِ غیر نکاح ہم سائے کی دوستی، کرائے کا مکاں

قطعہ

ہے عبث فکرِ سخن واں مصحفی ہندوی کی چندوی نکلے جہاں
چینِ پیشانی کی صورت گو ہو موج شعر کا عالم ہے جوں بحرِ رواں

قطعہ

عمدہ جو پیٹ بھر کے بولے جھوٹ ایسے نا منفعل کو کیا کہیے
گر نجف خاں نہ کہیے اس کو تو کیا سر کی والوں کا بادشاہ کہیے

قطعہ

اے خدائے کریم و بے ہمتا تو مرے کام سب رواں کر دے
میرا دشمن جو ہووے سگ سیرت اس کو یک مشتِ استخواں کر دے

☆☆☆☆

رباعیات ☆

یا رب میں رہا ہمیشہ پھرتا بہ بہشت　　احسان نے تیرے مجھ کو رکھا بہ بہشت
جس وقت لکھے بہشت و دوزخ تو نے　　پھر تو نے اٹھا کے وہاں سے پھینکا بہ بہشت

گردش ہے فلک کی صورتوں میں مصروف　　گردش سے بنے ہیں چاک کے جیسے ظروف
بے آلہ کوئی شے بھی ہوئی ہے پیدا　　بے خامہ کہیں سنا کہ ہوں نقش حروف

مرزا حاجی کہ تم ہو فطرت کی کلید　　مژدہ تمھیں دینے آئے ہیں، ہم عید سعید
یا رب رکھے ہمیشہ تم کو با فرزنداں　　ہر شب ہو شبِ برات، ہر روز ہو عید

پڑھ کر ہوئے ہم لوگ جو فاضل تو کیا　　اور دہر میں کہلائے جو عاقل تو کیا
حاصل نہ کیا جو علمِ صناع و کون　　صد گونہ کیا علم جو حاصل تو کیا

آبادی سے ایسی جنگلِ شوم بھلا　　تنہائی سے دل رہے جو مغموم بھلا
سچ پوچھے جو کوئی مصحفی کے نزدیک　　ہم سایۂ بد سے سایۂ بوم بھلا

ہم سائے میں جس کے ہو نہ جز رنج حصول　　اور رہے لگاتار سخن ہائے فضول
بالفرض اگر بہشت ہووے وہ مکاں　　اپنے نزدیک اس سے دوزخ ہے قبول

☆ نسخۂ بنارس و لکھنؤ میں یہ آخر میں ہیں

اے مصحفی ارچہ شخص موزوں ہے تُو　مشاطۂ صد معنی و مضموں ہے تُو
پر تجھ میں ہنر جو ہے تو اتنا کہ میاں　حکمت میں ارسطو و فلاطوں ہے تُو

مرثیہ

بولو کوئی تو روحِ پیمبرؐ کے واسطے　تسکینِ دل کرو مری حیدر کے واسطے
سر تھا بنا حسینؓ کا افسر کے واسطے　یا نوکِ نیزہ دمِ خنجر کے واسطے

خورشید کی زمیں پہ گری فرق سے کلاہ　روزِ سفید چشمِ جہاں میں ہوا سیاہ
پیکانِ تیر دستہ ہوں کیونکر کروں نہ آہ　پیشانیِ مبارکِ اکبر کے واسطے

ماں باپ کا جو طفل کہ ہوتا ہے لاڈلا　دیکھیں ہیں چاؤ چوز وہ اس کے کھلا پلا
کیوں اے فلک روا ہے بنے تکمۂ قبا　پیکاں گلوئے نازکِ اصغر کے واسطے

کبریٰ نہ کیونکر آپ کو صرفِ بکا رکھے　ابنِ حسن جب اس سے منھ اپنا چھپا رکھے
یہ بے بسی تو دیکھ بچاری لگا رکھا　اس آستینِ چاک کو معجر کے واسطے

دولھا کے غم سے رو رو کے دلہن ہو یوں ہلاک　ڈالیں براتی خانۂ ماتم میں سر پہ خاک
سہرا بنے بہ تارِ گریبانِ چاک چاک　قاسم بنے سے سروِ سمن بر کے واسطے

مصری کی اور نُقل کی ٹھہرے نہ واں صلاح　شربت پہ خونِ دل کے پڑھا جائے یوں نکاح
رنڈسالا لاوے اس کو شبِ عقد کی صباح　ساماں یہ ہو حسینؓ کی دختر کے واسطے

پانی نہ وحش و طیر سے ظالم رکھیں دریغ　برسائے تیرِ ظلم کا ابن علیؓ پہ تیغ

واحسرتا کہ دشت میں جاری ہو بحرِ تیغ اس تشنہ کام ساقیِ کوثر کے واسطے

اے وائے ہووے اس کے ستارے کو یوں ہبوط میّت کو آبِ صاف میسر ہو نے حنوط
پنجے میں آفتاب کے تھا شانۂ خطوط جس نازنیں کی زلفِ معنبر کے واسطے

مذبوح تیغ ظلم سے وہ دیں کا شاہ ہو یوں قافلہ نمازیوں کو روبراہ ہو
تقدیر میں لکھا تھا مگر پایہ گاہ ہو نیزے کی نوک صاحبِ منبر کے واسطے

دھوویں غبارِ کینہ کو دل سے نہ وہ کثیف آلودہ خاک وخوں میں ہو وہ جوہرِ لطیف
عریاں تنی کو دیکھ کہ یوں لاشۂ شریف محتاجِ گردِ دشت ہو چادر کے واسطے

افسوس ہو شہید مدینہ کا یوں رئیس اس طرح اس رئیس سے پیش آئیں یہ خسیس
خوں اس کا چمکے خاک کے اندر بنے کسیس[1] فولاد تیغِ چرخ کے جوہر کے واسطے

اے وائے جائے تیرِ ستم حلق سے گزر ہو جائیں شیر خوں سے لب اس نازنیں کے تر
اصغر کی ماں کہے تھی یہ اصغر کو دیکھ کر روتی ہوں اس بچے کے مقدر کے واسطے

پہلے تو آب دیدہ ہوئے چشمِ آفتاب چاہا یہ صبح نے اسے دے اپنا دوں نقاب
پھر آسماں سے مانگ کے لایا کہیں سحاب چادر[2] کبود لاشۂ بے سر کے واسطے

چشمِ مقدساں سے نہ کیونکر ہو خوں رواں پیٹیں نہ کیوں کہ سر کو بھلا اپنے انس وجاں
تاروں سے جب دراز ہو پھر بند کہکشاں اس بے گنہ شہید کے محضر کے واسطے

1۔ کسیس = پھٹکری 2۔ کبود = آسمانی رنگ کی (مراد آسمان)

نانا کو جس کے آوے الم نشرح و الضحیٰ بابا کی جس کے شان میں نازل ہو اِنّما
حیف اس کا انتخاب کرے کاتبِ قضا سینے کا صفحہ تیغ کی مسطر کے واسطے

صغرا تھی گو کہ حال سے بابا کے بے خبر پر اس کی خود بخود بھری آتی تھی چشمِ تر
ہوتا اگر نہ ناقہ سوار اس کا نامہ بر بصرے کو لکھتی خط وہ کبوتر کے واسطے

وہ سروِ باغِ دیں جو قلم ہو کے گر پڑا ماتم میں اس کے گل نے کیا پیرہن قبا
جا قتل گہ میں بھر کے لئے آئی انھیں قضا پیالہ لہو کا لالۂ احمر کے واسطے

کیا دوستوں میں تم سے کہوں جورِ اہلِ شام اب ہے برہنہ خاک پہ خوابیدہ وہ امام
جنت سے فرشِ خواب کو نت جس کے صبح و شام پھولوں کی چادر آوے تھی بستر کے واسطے

گیسو تھے جس کے گردنِ خورشید کی کمند بے سر پڑا ہوا ہے کٹا کر وہ بند بند
اب کوئی سرہانے اس کے جلاتا نہیں سپند تارے بخور تھے جس کی کہ مجمر کے واسطے

جس وقت اہلِ بیت کی کشتی تھی بے سکوں سر تھے حباب اس کے جو بہتا تھا بحرِ خوں
وا حسرتا فلک سے ہوئی اس گھڑی نگوں زنجیر کہکشاں بھی نہ لنگر کے واسطے

رو رو کہیں تھی زینب و کلثوم ہائے ہائے بھائی ہمارے سیّد مظلوم ہائے ہائے
خیمے میں ہر طرف تھی یہی دھوم ہائے ہائے جب شہر بانو پیٹے تھی سر در کے واسطے

غارت گروں کو جب نہ رہا کچھ خدا کا پاس تب بولیاں وہ صاحبِ عصمت بصد ہراس
ہم آپ تم کو دیتے ہیں جو ہے ہمارے پاس چھیڑو نہ ہم کو فاطمہؓ اطہر کے واسطے

ان ظالموں نے دستِ ستم جب کیا دراز
اسبابِ خانہ لے گئے وہ تا بہ جا نماز
ہرگز کیا نہ آلِ پیمبرؐ کا امتیاز
دیتے رہے وہ ان کو پیمبرؐ کے واسطے

آ اک نے بالیاں ہی سکینہ کی چھین لیں
دلہن کی نتھ کو کوئی لگا کھینچنے وہیں
میں کیا کہوں کہ خیمے میں بیٹھے جو وہ لعیں
کیا کیا ستم کیا زر و زیور کے واسطے

گل غرقِ خوں تھے دیکھ سکینہ کی خستگی
بُندے تلک جو چھینے گئے، بالیاں سبھی
شبنم کی طرح روتی تھی اُس وقت وہ بچی
لوہے کا طوق گردنِ لاغر کے واسطے

نیزے پہ دیکھ ہائے سرِ شاہِ مشرقین
کرنے لگیں یہ زینب وکلثوم رو روبَین
شایانِ ظلم عالمِ امکاں میں جز حسینؑ
کیا کوئی تھا نہ چرخِ ستم گر کے واسطے

جس سر کو آج نیزے پہ دیکھو ہو تم رواں
یارو یہ سر تھا افسرِ فرقِ مقدساں
روزِ نخست آہنِ شمشیرِ کوفیاں
شاید ہوا تھا خلق اسی سر کے واسطے

یہ مت کہو کہ خونِ حُسینا ہے کُو بہ کُو
انصاف کی جگہ ہے تم اس دم نہ چپ رہو
بتلاؤ مجھ کو کون سے مذہب میں صاحبو
مومن کو ذبح کرتے ہیں کافر کے واسطے

از بس نہ بادہ نوش رہے صرف صبح و شام
بھر بھر بھر فرات سے ان کافروں نے جام
معصوم اہلِ بیت جو خیمے میں تھے تمام
بلکا کیے نمِ لبِ ساغر کے واسطے

جاتا تھا بےکسوں کا جو کوفے کو کارواں
مت پوچھ حالِ عابدِ بیمار و ناتواں
اپنے قدم کا اس کو اٹھانا تھا حد گراں
ہر آبلہ تھا پانو کا نشتر کے واسطے

بے اشک اس مریض کے اک دم نہ تھے پلک کہتا غمِ پدر میں وہ جاتا تھا جوں ملک
مجھ سا شکستہ دل تو نہ ہوگا کوئی فلک شیشے بنے ہیں اور بھی پتھر کے واسطے

آتش کدے میں آگ جو ماتم رسیدہ تھی ہر موجِ شعلہ ماہیِ در خوں طپیدہ تھی
اخگر جو تھے سو صورتِ اشکِ چکیدہ تھے مژگانِ گریہ ناک سمندر کے واسطے

ریگِ رواں میں مل کے جو واں بحرِ خوں بہا طوفاں بلا کے لاتی رہی دم بدم ہوا
روزِ ازل بہ گریہ کفِ خاک کربلا لاشوں کے تھے جزیرے سمندر کے واسطے

ہوتا نہ غرقِ خوں وہ تنِ خستہ جوں شفق کپڑے سیاہ رنگ پھٹے تہ بہ تہ طبق
آتا جو اپنے جوش میں ابرِ عتابِ حق اک قطرہ بس تھا ظلم کے اخگر کے واسطے

نیزے پہ چرخ زن سرِ ابنِ بتول ہو جنت میں کیوں نہ روحِ پیمبرؐ ملول ہو
پیشانیِ مبارکِ سبطِ رسول ہو صبحِ مراد شام کے لشکر کے واسطے

ماتم میں اس کے روئے نہ کیوں خلق زار زار جو اس طرح سے راہِ خدا میں ہوا نثار
دو چار آنسوؤں سے تو نکلے ہے کب بخار دریا ہی چاہیے مژۂ تر کے واسطے

یا مرتضیٰ علیؓ مری عرضی کو لیجیے مداحِ اہلِ بیت کا اک کام کیجیے
مضطر ہے مصحفی غمِ دنیا سے، دیجیے آزادی اس غلام کو قبر کے واسطے

رہتا ہے بازپرسِ قیامت کا اس کو ڈر روزِ عمل ہے اس کا جو شب سے سیاہ تر
ہرگز نہ تم گناہوں پر اس کے کرو نظر بخشاؤ اس کو شافعِ محشر کے واسطے

تمت تمام شد دیوانِ ششم ہندی میاں مصحفی صاحب